رسالہ ہندستانی الہ آباد (۱۹۳۱ء—۱۹۴۸ء) سے انتخاب

۶

تاریخ

خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ

[illegible]

رسالہ ہندستانی الہ آباد (۱۹۳۱ء — ۱۹۴۸ء) سے انتخاب

(٦)

تاریخ

خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ

رسائل کے دفینوں سے اردو ادب کی بازیافت

رسالہ ہندستانی الہ آباد (۱۹۳۱ء ـ ۱۹۴۸ء) سے انتخاب ـ ۶

تقسیم کار:

صدر دفتر:

- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ـــــ ۱۱۰۰۲۵

شاخیں:

- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، دہلی ـــــ ۱۱۰۰۰۶
- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنس بلڈنگ، بمبئی ـــــ ۴۰۰۰۰۳
- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ ـــــ ۲۰۲۰۰۲

۱۹۹۳ء

قیمت : ساٹھ روپے

لبرٹی آرٹ پریس دریا گنج میں چھپ کر پرنٹرز مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی میں طبع ہوا

حرفِ چند

یہ اردو کے ایک اہم رسالہ ہندستانی (الہ آباد) کے ۱۸ سال کے پرچوں کا انتخاب ہے۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ اردو والے کیسے بڑے موضوعات پر کتنا اہم ذخیرہ آنے والوں کے لیے کیسی تیزی سے جمع کرتے جا رہے تھے۔ شاید انھیں یہ کشف ہو گیا تھا کہ اب اُن کے بعد ۴۰، ۵۰ سال اردو پر بونوں کا راج ہو گا اس لیے جلدی جلدی بارے کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو۔ اور پھر ۴۰، ۵۰ سال بعد جو نئی نسل بونوں کی جانشیں ہو وہ پھر اپنے قد کو پالے۔

رسالہ ہندستانی ۱۹۳۱ - ۱۹۴۸ تک نکلا، یہ تماہی تھا۔ ایڈیٹر اصغر گونڈوی (مولوی اصغر حسین مرحوم)، مولانا سعید انصاری، محمد رفیع صاحب فاضل دیوبند، محمد اجمل خاں، دہاج الدین خاں مخزوں اور پیرزادہ عبدالباسط رہے۔ ہندستانی میں اردو لغت (اور املا)، تاریخ ہند (اور عمومی تاریخ اسلامی)، ہندی ادبیات، اردو ادب، اردو ہندی ہندستانی اور دیگر موضوعات پر اہم لکھنے والوں نے ایسے مضامین لکھے جن کی آج بھی اہمیت ہے۔ خدابخش لائبریری کے منصوبوں میں یہ بھی شامل رہا ہے کہ اہم رسائل سے مفید تحریروں کا انتخاب کر لیا جائے۔ اسی منصوبے کے تحت **ہندستانی** سے یہ انتخاب پیش خدمت ہے۔ یہ انتخاب سات حصوں میں ہوگا۔

پیش نظر ہر منتخب جلد میں ایک آدھ تحریر مجموعہ کے عمومی عنوان سے کسی قدر ہٹی ہوئی ملے گی، یہاں سے بہتر جس کا کوئی اور مناسب مقام نہ تھا۔ یہ سب اچھی تحریریں ہیں اس لیے جھیل جائیے، فائدے سے خالی نہ ہوں گی۔

یہ جلد تاریخ پر ہے۔ اصل میں اسے تاریخ ہند کی خصوصی جلد کے طور سے پیش کیا جانا تھا لیکن پھر عرب اسلامی تاریخ و تہذیب کے مطالعہ پر مشتمل تین ایسے اچھے مقالے نظر آئے جنھیں کسی اور مجلد میں اتنی مناسبت کے ساتھ شامل نہیں کیا جا سکتا تھا جتنا اس جلد کے ایک حصہ کے طور سے۔ اب سے اس جلد کی ہندستانیت کی خصوصیت تو کم ہو گئی لیکن تین اچھے مضامین ترک کیے جانے سے بچ گئے۔

ع ر ب

تاریخ

آغا مہدی حسین

ہندوستان میں تاریخ نویسی

تاریخ نویسی صرف واقعات کی ترجمانی پر ختم نہیں ہوتی بلکہ تاریخ نویس کی ذہنیت کو بھی اُس میں بڑا دخل ہے اِس لیے کہ واقعات کا چربہ پہلے تاریخ نویس کے ذہن میں اُترتا ہے - وہیں اُس چربے پر ایک خاص رنگ چڑھ جاتا ہے جو بعد میں قلم کے ذریعے کاغذ پر اُتر آتا ہے - اِس رنگین چربے کو عرف عام میں تاریخ کہتے ہیں - اِس تاریخ سے نہ صرف ہم عصر متاثر ہوتے ہیں بلکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آنے والی نسلیں اُس سے اثر پذیر ہوتی رہتی ہیں - اِس اعتبار سے تاریخ نویس یا مورخ کی منزلت ایک بڑے طبیب یا ڈاکٹر کی سی ہے - جس طرح ڈاکٹر مریض کی نبض دیکھ کر اور اُس کے بدن پر آلے لگا کر مرض کی تشخیص کر لیتا ہے اور پھر نسخہ لکھ دیتا ہے جس پر مریض کی صحت یا ہلاکت کا فیصلہ ہوتا ہے ' اُسی طرح مورخ ایک ملک ' ایک تمدن اور ایک قوم کے نقش ہستی کو بنانے اور بگاڑنے میں موید ہوتا ہے - وہ ملک کی نبض دیکھتا ہے ' قوم کی نبض دیکھتا ہے اور آخر نسخہ لکھ دیتا ہے یعنی ملک اور قوم کے اِدبار اور اقبال کے اِسباب کو واقعہ نگاری کا جز بنا دیتا ہے - غور طلب بات یہ ہے کہ ڈاکٹر نے تشخیص مرض میں خطا کی تو زیادہ سے زیادہ ایک شخص کی جان فوت ہوتی ہے ' لیکن حضرت مورخ نے اگر خطا کی تو ساری قوم ہلاکت میں پڑ جاتی ہے اور ملک میں ایسا طوفان برپا ہو جاتا ہے جو روکے نہیں رکتا - ڈاکٹر ٹریویلین (Trevelyan) کا قول ہے کہ تاریخ ایک خطرناک چیز ہے - اگر اُس کا درست استعمال کیا گیا ہے تو قوم کا شیرازہ باندھنے کے لیے بہترین شے ہے

اور اگر تاریخ کو تصحیح کے ساتھ نہ سمجھا گیا تو وہ امن شکن ثابت ہوکر رہے گی -

اِسی وجہ سے یورپ کے ترقی یافتہ ملکوں میں تاریخ نویسی کی طرف خاص توجہ کی جاتی ہے - ملک کے خونی منظروں کو ہر موقع اور ہر محل پر نہیں دکہایا جاتا - میں پیرس میں ہر طرف گیا اور وہاں تصویروں اور مجسموں کا بازار ہر روز ہی گرم رہتا ہے لیکن خونی منظروں کا تو پتا بھی نہیں ملتا - فرانسیسی انقلاب میں کتنا کچھ خون بہا ؛ بادشاہ کا بھی خون بہایا گیا اور امرا کا بھی - انگلستان کی تاریخ بھی خونریزی سے خالی نہیں پارلیمنٹ اور بادشاہ کے درمیان تقریباً سات برس تک جنگ ہوئی اور آخر بادشاہ قتل کیا گیا لیکن لندن میں کہیں میں نے بادشاہ کے قتل کی تصویر نہیں دیکھی - البتہ ایک اخبار میں پڑھا کہ کسی سکول میں چارلس اول کی ایک تصویر تھی جو اُس کے قتل کی یاد تازہ کرتی تھی - اُس تصویر کے خلاف بڑا احتجاج کیا گیا - دلیلیں اور بحثیں کی گئیں کہ اِس قسم کی تصویروں سے طالب علموں کے دلوں پر برا اثر پڑتا ہے اور یہ قومیت کی شیرازہ بندی کے لیے مضر ہے ' چنانچہ وہ تصویر ہٹا دی گئی - لیکن اِس نمائش میں ایک تصویر موجود ہے جس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ شری شیواجی پر افضل خاں کی تلوار پڑ رہی ہے - سیواجی پر افضل خاں کا تلوار سونتنا تاریخی اعتبار سے صحیح مان بھی لیا جائے تو بھی اِس قسم کی تصویریں طالب علموں سے بنوانا اور اُن تصویروں کو عوام کے سامنے پیش کرنا ملک کے امن کے لیے اور قوم کی شیرازہ بندی کے لئے ہرگز سود مند نہیں -

یوں تو تاریخ نویسی کا اثر سب ہی پر پڑتا ہے لیکن سب سے زیادہ اثر پذیر طالب علم ہوتے ہیں اور اُن کو اعلیٰ درجے کا انسان بنانے کے لیے

اور وطن اور اہل وطن کے حقوق بتانے اور دیس اور دیسی بھائی بہنوں کی خدمت سکھانے کے لیے جسے آج کل citizenship سے تعبیر کیا جاتا ہے علم تاریخ بہترین آلہ ہے - نوجوانوں میں بنی نوع انسان کے اور ہم وطنوں کے ساتھ ہمدردی پیدا کرنا، حب الوطنی، فراخ دلی، بردباری سکھانا، غلط فہمیاں دور کرنا، تعصب گھٹانا، اُنس و انسانیت بڑھانا تاریخ نویس کا فرض منصبی ہے -

ایک زمانہ وہ تھا کہ ہندوستان میں تاریخ لکھنا کوئی جانتا ہی نہ تھا - اگر میں یہ کہدوں تو بےجا نہ ہوگا کہ اسلام کے آنے سے سر زمین ہند میں تاریخ نویسی شروع ہوئی اور اُس وقت سے لے کر آج کے دن تک مسلسل تاریخ لکھی جا رہی ہے - اِس سات آٹھ سو برس کی تاریخ نویسی کے دو دور ہیں - ایک دور ازمنۂ وسطیٰ کا اور دوسرا زمانۂ حال کا - ازمنۂ وسطیٰ کی تاریخ نویسی کا دائرہ تنگ تھا یعنی اُس دور میں صرف مسلمان بادشاہوں اور خاص خاص امیروں اور بزرگوں کے حالات لکھنے کو علم تاریخ سمجھا جاتا تھا - اگرچہ راویوں کی جانچ کی جاتی تھی لیکن مذہبی نقطۂ نظر سے واقعہ نگاری ہوتی تھی اور ملکی اور سیاسی معاملات بھی مذہبی رنگ میں رنگ دیے جاتے تھے جو غلو سے خالی نہ ہوتے تھے - یہ بات منہاج سراج کی طبقات ناصری اور حسن نظامی کی تاج المآثر سے ظاہر ہے - تاج المآثر کا قلمی نسخہ جو انڈیا آفس میں ہے ملاحظہ فرمائیے - صفحہ ۱۷۵ پر درج ہے کہ سلطان شمس الدین التمش کے عہد میں کالنجر کے کل مندر ڈھا دیے گئے - یہی بات قطب الدین ایبک کی طرف منسوب کرکے Imperial Gazetteer میں لکھدی گئی

"......Qutub-ud-din took Kalinjar and converted the temples into mosques and abodes of goodness,

while the very name of idolatry was annihilated."

(Gaz. XIV 311).

لیکن واقعہ یہ ھے کہ کالنجر کے اُسی زمانے کے بہت سے مندر اِس وقت تک موجود ھیں - کننگہم صاحب آثار قدیمہ کی اکیسویں رپورٹ میں صفحہ ۹۵ پر اور ۵۸ سے لےکر ۶۹ صفحے تک یہی بات لکھتے ھیں - یہ بھی لکھتے ھیں کہ کالنجر کے علاوہ مہوبہ اور کھجراھو کے قدیمی مندر موجود ھیں -

کھجراھو کے مندروں کا حوالہ سلطان محمد بن تغلق کے زمانے میں بھی ملتا ھے - ابن بطوطہ اِسی سلسلے میں اُن جوگیوں کا بھی ذکر کرتا ھے جن سے مستفیض ھونے کے لئے اکثر مسلمان اُن کے پاس جایا کرتے تھے (Imperial Gaz. XV 219) - کھجراھو سے ڈیڑھ میل کے فاصلے پر قصبہ جتکاری میں ایک مندر موجود ھے جو بارھویں صدی عیسوی کا ھے - (Imperial Gaz. XV 219)

نواب مرزا یار جنگ ' چیف جسٹس عدالت عالیہ حیدرآباد دکن اپنا ایک مشاھدہ یوں لکھتے ھیں : قلعۂ گولکنڈہ اور قلعۂ کریم نگر کے دیکھنے کے لیے میں گیا- یہ دونوں قلعے قدیم زمانے کے ھیں - اِن کی چوٹیوں پر اب تک ھندؤوں کی عبادت گاھیں موجود ھیں - مسلمانوں نے یہ قلعے فتح کرنے کے بعد اِن عبادت گاھوں کو نیست و نابود نہیں کیا - اکثر ھندو تیرتھ کرنے کے لیے وھاں آج بھی جاتے ھیں -

بہر حال معلوم ھو گیا کہ تیرھویں صدی کے تاریخ نویسوں نے مندر شکنی کے مضمون کو کیسا کچھ رنگا - اِسی قسم کی رنگین عبارت تاریخ فیروز شاھی کی بھی ھے جو چودھویں صدی کی تصنیف ھے اور جس میں ضیاءالدین برنی نے علاءالدین خلجی کے اُن قوانین کو' جو اُس نے

دیہات کے چھوٹے ہندو کارکنوں یعنی بلاہر اور سرہنگ کو بڑے ہندو سرداروں خوطوں اور چودھریوں کے تشدد سے بچنے کے لیے اختیار کیے' مذہبی رنگ دے دیا - نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان کی موجودہ تاریخ میں عہد علاءالدین کے اِس شعبے کو Anti-Hindu legislation سے تعبیر کیا گیا اور اسکولوں میں بچوں کو پڑھایا جانے لگا کہ مسلمان مورخ برنی رقم طراز ہے کہ ہندوؤں کی حالت عہد علاءالدین میں خراب تھی ؛ لگان وصول کرنے میں بڑی سختیاں کی جاتی تھیں -

ضیاءالدین برنی کے بیانات کی اصلیت Mr. Moreland نے سمجھ لی - وہ لکھتے ہیں کہ برنی کا مطلب لفظ ہنود سے' جو اُس نے اِس مقام پر استعمال کیا ہے' سب ہندو نہیں ؛ بلکہ محض ہندو زمیندار مراد ہیں جو بہت دولت مند اور طاقت ور تھے اور مالگذاری نہ دیتے تھے اور سرکش بن گئے تھے جس کے سبب سلطنت میں بدنظمی واقع ہوگئی تھی اور متواتر بغاوتیں ہوتی رہتی تھیں -

مسلمان تاریخ نویسوں کی سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ بت پرستی کا اور ہندوؤں کا جنھیں وہ بت پرست سمجھتے تھے ذکر کرتے وقت وہ عقل سلیم کو کھو بیٹھتے تھے اور غلط بیانیاں کر جاتے تھے چنانچہ ایسی ہی مثالیں مغلیہ سلطنت کی تاریخ میں ملتی ہیں -

امید کی جاتی تھی کہ زمانۂ حال کی تاریخ نویسی کا پایہ بہت بلند ہوگا اِس لیے کہ سائنس کی ترقی نے' آثار قدیمہ کے انکشافات نے' مغربی تہذیب و تمدن کے اثر نے اور ہماری فیاض اور مہربان سرکار برطانیہ نے جو آسانیاں آج مورخوں کو بہم پہونچا دی ہیں از منۂ وسطی میں اُن کا خواب خیال بھی نہ تھا - اِن سب باتوں کے علاوہ یورپ کی ازمنۂ وسطی کی تاریخ جو اب موجود ہے اُس زمانے میں میسر نہ تھی -

یہ تصور ھی کہ تیرھویں چودھویں، پندرھویں اور سترھویں صدیوں میں یورپ کی کیا حالت تھی ھندوستان کی تاریخ نویسی کو بہت کچھ بلندی دے سکتا ھے - یہ واقعہ ھے کہ ۲۲ اگست سنہ ۱۵۷۲ع کو فرانس کے بادشاہ نے حکم دے دیا تھا کہ پیرس میں تمام پروٹسٹنٹ مذھب کی رعایا قتل کردی جائے - اِس قتل سے نہ بچے بچے نہ بوڑھے، نہ مرد اور نہ عورت - جرمنی میں سترھویں صدی تک یہ قانون تھا کہ رعایا گورنمنٹ کے مذھب سے اِنحراف نہ کرنے پائے - ھسپانیا میں Inquisition کا دور دورا تھا - ھندوستان اِن سب مصیبتوں اور بندشوں سے آزاد تھا -

اِس میں شک نہیں کہ زمانۂ حال میں واقعات کی جانچ پرتال بہت کی جاتی ھے، اور تاریخ نویسی عروج پر ھے - تاریخ کی کتابیں کثرت سے لکھی جاتی ھیں، لیکن یہ ملحوظ خاطر رھے کہ تاریخ نویسی صرف واقعات کی ترجمانی پر ختم نہیں ھوتی - اُس میں تاریخ نویس کی ذھنیت کو بھی بڑا دخل ھے -

" اسلام پرانا مذھب نہیں، اُس کے بانی حضرت محمد تھے - جب حضرت محمد ھجرت کرکے مدینے میں آئے تو اُنھوں نے اپنی ایک چھوٹی سی فوج بنا لی" - اِسی سے ایک حد تک ھندوستان پر لشکر کشی کے حالات کو منضم کر دیا جاتا ھے - ذرا غور کیجئے اصلیت کیا ھے؟ اور مبتدی کیا سمجھتا ھے؟ تاریخ ابن عساکر میں لکھا ھے کہ پہلے نبی حضرت نوح ھیں اور طبقات ابن سعد میں یہ عبارت درج ھے کہ پہلے نبی حضرت ادریس ھیں دوسرے نبی اور پیغمبر حضرت نوح تیسرے نبی حضرت ابراھیم، اِس کے بعد اسماعیل و اسحاق، یعقوب، یوسف، لوط، ھود اور صالح؛ پھر حضرت شعیب، موسی، ھارون، الیاس، یسع نبی ھوئے اور اُن کے بعد یونس و ایوب، داؤد، سلیمان، زکریا، یحییٰ اور حضرت عیسی

ہوئے سب کے آخر میں محمد بن عبداللہ نبی اور پیغمبر ہوئے - یہ سب نبی اور پیغمبر یکے بعد دیگرے اسلام کی تعلیم دیتے رہے - اِس سے ظاہر ہے کہ سنہ ۵۷۰ع سے پہلے ' جو رسول عربی کی ولادت کی تاریخ ہے ' اسلام دنیا میں آچکا تھا - اسلامی تاریخ یہ نہیں بتاتی کہ اسلام کو رسول عربی نے شروع کیا تھا - اِس بات کی تشریح علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال نے اپنے اِن اشعار میں بھی کی ہے ' جو اُنھوں نے حضرت امام حسین کی شان میں لکھے ہیں :

سر ابراہیم و اسماعیل بود یعنی آن اجمال را تفصیل بود
رمز قرآن از حسین آموختیم زآتش او شعلہا اندوختیم

ظاہر ہے کہ حضرت ابراہیم و حضرت اسماعیل مسلمان تھے - ہندوستان کی تاریخ میں صرف یہ لکھ دینا کہ حضرت محمد ہجرت کرکے مدینے آئے تو وہاں اُن کی عزت ہوئی اور رفتہ رفتہ اُنھوں نے ایک فوج بنا لی ' مبتدی کے لیے مفید نہیں ہوسکتا جب تک اُسے یہ بھی نہ بتایا جائے کہ حضرت محمد کو مدینے میں بھی چین نہ ملا اور اُن پر اور مدینے والوں پر حملے ہونے لگے - اُس وقت مجبوراً مدافعت کے لیے اُن کو آمادہ ہونا پڑا - اور اُن لڑائیوں کو جو اِس مجبوری سے کی گئیں ہندوستان کی لڑائیوں سے کوئی نسبت نہیں -

یہ اِس لیے عرض کرتا ہوں کہ Sir Surendra Nath Banerji کا قول ہے :

"Ignorance is too often the mother of prejudice, and closer knowledge hardly even fails to dissipate misunderstanding and establish good relations."

ذرا سوچنے کی بات ہے کہ محمود غزنوی کی لڑائیوں کو اور محمد غوری کی لڑائیوں کو مذہبی لڑائیاں بتایا جاتا ہے - لیکن ہم عصر مورخین میں سے کوئی بھی یہ نہیں بتاتا کہ محمد غوری نے یا اُس کے ساتھیوں نے اسلام پھیلانے کی غرض سے ہندوستان پر حملہ کیا - تاریخ کی مروجہ کتابوں میں یہ بھی لکھا ہے کہ "اسلام کی پیروی کرنے والوں کو خونریزی اور غارتگری بطور ایک مذہبی فرض کے سکھائی جاتی ہے اور اسلام میں مذہبی رواداری کا نام نہیں" -

افسوس یہ ہے کہ تاریخ کی اصلی باتوں سے اور تاریخ کے مغز سے طالب علم بے بہرہ ہی رہتے ہیں - اُن کو یہ نہیں بتایا جاتا کہ ازمنۂ وسطیٰ میں ہندوستان کی نئی زندگی کا آغاز ہوا - ایک نئی معاشرت کی ابتدا ہوئی - یہاں اُن دنوں وہ مذہبی آزادی تھی جو یورپ کے ملکوں کو سترھویں اور اٹھارویں صدی تک نصیب نہیں ہوئی - یہ نہیں ، اگر ازمنۂ وسطیٰ کے اُس مٹتے ہوئے تمدن کا اندازہ کرنا ہو تو اب بھی ہندوستان کے کسی قدیم شہر میں چلے جائیے ، کسی قصبے یا گاؤں ہی میں تشریف لے جائیے - آج سے دس سال قبل تک یہ کیفیت تھی کہ ایک ہی دیوار کے سائے میں ہندو مسلمان امن چین کی زندگی بسر کرتے تھے ، آپس میں بھائیوں اور قریبی رشتہ داروں کی طرح رہتے تھے - ایک دوسرے کی تقریبوں اور شادیوں میں بلا تامل شریک ہوتے تھے - خود میرا ذاتی تجربہ ہے ، ممکن ہے کہ آپ حضرات نے بھی محسوس کیا ہو ، کہ اہل حرفت و صناعت میں سے خواہ وہ بنیا ہو یا بزاز یا حجام یا موچی ، لوہار یا بڑھئی ، سنار یا جولاہا ، ایک ہی شخص بلا امتیاز ہندو اور مسلمانوں کی روزانہ ضرورتیں پوری کیا کرتا تھا - یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ازمنۂ وسطیٰ میں ہندو اور مسلمان امیروں اور حاکموں نے کبھی

اپنی رعایا سے بچ کر رہنا پسند نہیں کیا اور عام آبادی سے دور سول لائنز (civil lines) قایم نہیں کیں -

مرزا یار جنگ بہادر چیف جسٹس حیدرآباد دکن کا قول ہے کہ قصبۂ " امیٹھی " میں خاص میرے محلہ کے ہندو بچے میرے والد کو اُسی طرح چچا یا دادا کہتے تھے جیسا کہ میں خود اپنے والد کے ہندو دوستوں کو کہتا تھا - لیکن آج زمانہ بالکل دگر گوں ہوگیا ہے ہندو اور مسلمان بچوں کا مسلم یا ہندو بزرگ کو دادا اور چچا کہنا تو درکنار محلے کے محلے ہندؤں کے الگ اور مسلمانوں کے الگ نظر آتے ہیں - ایک کے محلے میں دوسرے طبقے کے کاریگر یا حجام کا جانا تو درکنار فقیر تک نہیں جاتا - مکان اِس طرح بنائے جاتے ہیں کہ ہندو مسلم فساد کی آگ لگے تو محفوظ رہیں -

بہ بیں تفاوت رہ از کجا ست تا بکجا

ابھی وہ حضرات موجود ہیں جنہوں نے یہ باتیں بھی دیکھی ہیں کہ بقر عید کے موقع پر مہاراجہ سر کشن پرشاد بہادر یمین السلطنۃ حیدرآباد دکن نے اپنے ایک مسلمان دوست کو عید کی مبارک باد میں یہ شعر لکھ کر بھیجے تھے :—

خدا کہنے پہ کہتے ہیں : نہیں ، پرماتما کہیے
اگر پرماتما کہتا ہوں ، کہتے ہیں خدا کہیے
مری وحدت پرستی پڑ گئی اے شاد ضغطے میں
نہیں کچھ کہتے بنتا ہے - اگر کہیے تو کیا کہیے
یہ جھگڑے تو چلے ہی جائیں گے اے شاد اب آؤ
محبوں سے نوید آمد عیدالضحیٰ کہہ

جو جواب مہا راجہ کو اُن کے مسلمان دوست نے دیا وہ بھی قابل بیان ہے - لکھتے ہیں کہ اگر ہندو مسلمان ہندوستان کے دو دریا ہیں تو آپ اُن کے سنگم ہیں اور اگر ہندو مسلمان ایک جسم کی دو آنکھیں ہیں تو آپ اُن کا فوکس اور وہ نقطہ ہیں جہاں دونوں کی روشنی مل جاتی ہے - افسوس کہ اب ہندوستان میں ایسے نفوس دن بدن کم ہی ہوتے چلے جاتے ہیں - غالباً یہی دیکھ کر نباض کامل سر تیج بہادر سپرو نے اپنی ایک تقریر میں ارشاد فرما دیا کہ آج سے پہلے ہندوستان میں کبھی رواداری کی اِتنی اشد ضرورت نہیں ہوئی - آج رواداری کی اشد ضرورت ہے - (Statesman, 21-23 December, 1936)

اب دل چاہتا ہے کہ یہ عرض کردوں کہ ہندوستان کی تاریخ نویسی میں کیا ہونا چاہیے :-

۱- مسلمان بادشاہوں نے اِس ملک کو اپنا وطن سمجھا - اِسی سر زمین میں پیدا ہوئے - جب تک زندہ رہے اِسی ملک کی خدمت کرتے رہے - اور آخر اِسی میں مرکھپ گئے - چنگیز خاں مسلمان نہ تھا - اُس کے پیرو مغل صدھا برس ہندوستان پر حملے کرتے رہے اور بعض دفعہ ایلغت سے ایلغت بجانے کے لیے دہلی اور امروہہ تک آ پہونچے - اِن بادشاہوں نے ہندوستان کی حفاظت کرنے اور مغلوں کو نکالنے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا - اپنی جانیں خطرے میں ڈالیں، اپنے بچوں کو قربان کردیا ؛ مگر اِس ہندوستان پر آنچ نہ آنے دی - حضرات ! انصاف کیجیے : آج سلاطین ہند کی اُن خدمتوں کا صلہ ہماری تاریخ نویسی یہ دیتی ہے کہ نوخیز طالب علموں کے دلوں میں اُن کی طرف سے تعصب و کینہ جاگزیں ہوجائے -

۲۔ مسلمان یہاں آتے ہی ہندوؤں کے ساتھ ایسے گھل مل گئے کہ ایک نئی زبان کی بنیاد پڑ گئی اور وہ زبان ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشارکت کے طفیل بڑھی اور پروان چڑھی - ڈاکٹر گریھم بیلی کی تحقیق یہ ہے کہ سنہ ۱۰۲۷ء میں اردو زبان کی ابتدا ہوئی اور لاہور کے ہندوؤں کی آغوش میں اُس نے پرورش پائی - ہمایوں کے عہد سے اُردو کی خوب ہی عزت افزائی ہوئی اور اکبر کے دور حکومت میں تو یہ حال ہوا کہ کوئی مجلس ایسی نہ تھی جہاں عرفی و نظیری کی سخن سنجیاں ہوں اور تلسی داس اور سور داس کی نغمہ سنجیاں نہوں -

ہندوستان کا سیاسی مطلع کیسا ہی غبار آلود کیوں نہ رہا ہو لیکن اِس سات سو برس کی تاریخ میں کبھی یہ نوبت نہیں آئی کہ کسی شہر میں یا کسی سرائے اور مسافر خانے میں چاہے ہندو چاہے مسلمان ' پان ہندو پانی ہندو ' پان اسلامی اور پانی مسلمان کی صدائیں بلند ہوئی ہوں -

۳۔ موجودہ تاریخ نویسی میں یہ دکھانا چاہیے کہ اِس سات سو برس کے عرصے میں ہندو مسلمان مل جل کر ہندوستانی کیوں کر بن گئے اور اِس بات کا کافی خیال رکھنا چاہیے کہ تاریخ کی کتاب پڑھ کر ہندوؤں اور مسلمانوں میں مغایرت کا خیال پیدا نہ ہو سکے - ہندو مسلمانوں کے عہد حکومت کو اپنا عہد سمجھیں اپنے لیے قابل فخر خیال کریں اور مسلمان ہندوؤں کے تعاون پر ناز کریں - اِسی حالت میں تاریخ نویسی سے ہندوستان کو صحیح معنوں میں فائدہ پہونچ سکتا ہے اور جب تک ہندوستانی تاریخ نویسی کا نصب العین یہ نہ ہوگا اُس وقت تک ہندوستان غلامی کی زنجیروں سے ہرگز رہائی حاصل نہیں کر سکتا -

۴—ابتدا سے لے کر اٹھارویں صدی تک کوئی جنگ ہندوستان میں ایسی نہیں ہوئی جس کو سچے معنوں میں ہندو مسلم جنگ کہا جا سکے - تیمور اگرچہ مسلمان تھا لیکن جب وہ ہندوستان پر حملہ آور ہوا تو کیا مسلمانوں نے خود ہندوؤں کے ساتھ مل کر سب کا مقابلہ نہیں کیا ؟ اُس کا مقابلہ ہندوؤں کی طرح اور ہندوؤں کے ساتھ مل کر مسلمانوں نے بھی کیا - تیمور نے تو ہندوستان پر حملہ کرنے کی وجہ یہ بیان کی تھی کہ ہندوستان کے مسلمان کافر بن گئے تھے اور مسلمان بادشاہ ہندوؤں کے ساتھ بڑی رعایتیں کر رہے تھے -

۵—آخر میں پھر عرض کرتا ہوں کہ سب طالب علموں کو ، خواہ وہ ہندو ، خواہ سکھ ہوں یہ بتایا جائے کہ ازمنۂ وسطیٰ کا دور ہم سب کا مشترکہ دور تھا - یقیناً اُس میں سب کا حصہ تھا - بابا گرو نانک کی اُسی دور میں ولادت ہوئی - اُسی زمانے میں وہ بڑھے اور پلے - میں پوچھتا ہوں کہ ہندوستان کی تاریخ کے ایک حصے کو ہندوؤں کا دور یا Hindu period اور دوسرے کو مسلمانوں کا دور یا Muslim period کہہ کر پکارنے کی کیا ضرورت ہے ؟ اِس سے مغایرت کی بو آتی ہے نفاق کا اندیشہ ہے اور یگانگت میں فرق آتا ہے -

ہندوستان کو اب ایسے تاریخ نویسوں کی تلاش ہے جو اِس قسم کے افتراق کو گوارا نہ کر سکیں اور جن کا اعتقاد یہ ہو کہ ہندوستان کے خمیر میں ہندو مسلمان ایسے ملے ہوئے ہیں جیسے لفظ " ہم " میں ہ اور میم - ہ سے مراد ہندو اور میم سے مسلم ہے - ایسے تاریخ نویسوں کی تلاش ہے جن کا اصول یہ ہو :—

کفر است در طریقت ما کینہ داشتن   آئین ماست سینہ چو آئینہ داشتن

بینی پرشاد

ہندوستان کا قدیم تمدن[1]

ہندوستان کی تاریخ

یوں تو پوری تاریخ ایک ہے، لیکن مطالعہ کی سہولت کے لئے غیر ملکوں کے مانند ہندوستان کی تاریخ کے بھی تین حصے کئے جا سکتے ہیں:— (۱) قدیم، یعنی جو قدیم زمانے سے لیکر بارھویں صدی عیسوی تک رہا، جس کے تمدن کا سلسلہ کبھی ٹوٹنے نہیں پایا، اور جس کے دھرم، سماج، سیاست، ادب اور آرٹ (فن) کے چشمے اپنے خاص انداز سے تمام ملک کو سیراب کرتے رہے، اور جس کے اصولی نظام کو کسی بڑی مصیبت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ بارھویں صدی میں یہ حالت تبدیل ہوگئی۔ شمال مغرب سے نئی قوموں نئے مذہب اور نئے تمدن کا داخلہ ہوا، جنہوں نے ملک کی سیاسی حالت بالکل بدل دی، جنہوں نے سوسائٹی پر بھی بہت اثر ڈالا اور ملکی زبانوں کے ادب اور آرٹ کے راستوں کا رخ تبدیل کردیا۔

---

[۱] یہ مضمون ڈاکٹر بینی پرشاد کی کتاب کے ترجمے کا ایک ٹکڑا ہے۔ پورا ترجمہ علیحدہ کتابی صورت میں اکیڈیمی کی جانب سے شائع ہورہا ہے۔
مدیر

اس وقت سے زمانۂ وسطی کا آغاز ہوتا ہے جو اٹھارھویں صدی تک رہا۔ پرانی تہذیب کے بہت سے اصول و عناصر اس زمانے میں بھی موجود تھے، ملک کے بہت سے حصوں میں انھوں نے نشو و نما بھی پائی لیکن نئی قوتوں اور نئے اثرات سے مل کر انہوں نے ایک نئے تمدن کی صورت اختیار کر لی - اٹھارھویں صدی سے ہماری تاریخ کا جدید دور شروع ہوتا ہے، جس میں مغربی اثرات کے باعث ملک کی سیاسی اور معاشیاتی حالت پھر تہ و بالا ہو جاتی ہے اور زندگی کے تمام حصے بڑی تیزی سے رنگ بدلنے لگتے ہیں - ہر ایک ملک کے لئے جدید تاریخ سب سے زیادہ مفید ہوتی ہے، کیونکہ وہ موجودہ حالات پر سب سے زیادہ روشنی ڈالتی ہے اور موجودہ گتھیوں کو سلجھانے میں سب سے زیادہ مدد دیتی ہے - لیکن کئی وجوہ سے ہندوستان کی قدیم تاریخ کا سمجھنا بھی بہت ضروری ہے - ایک تو بہت سے پرانے خیالات ور رسم رواج اب تک باقی ہیں، پرانے ویدانت کی عظمت اب تک قائم ہے، پرانا سنسکرت کا ادب آج بھی ملکی زبانوں کی ادبیات پر پورا اثر ڈالے ہوئے ہے، پرانے دھرموں کے اصول ابھی تک مانے جاتے ہیں، دوسرے یہ کہ زمانۂ وسطی اور حال کی تاریخوں کی اصلیت کا بغیر قدیم تاریخ کے صحیح اندازہ نہیں ہوسکتا - تیسرے یہ کہ قدیم زمانے میں مغربی اور مشرقی ایشیا کے ہندوستانی دھرم اور تہذیب کا ایسا اثر پڑا تھا کہ وہ آج تک نہیں مٹ سکا ہے - ان د [illegible] راز ملکوں کی تہذیب کو سمجھنے کے لئے ہندوستان کی قدیم تاریخ سے واقفیت ضروری ہے - چوتھے علمی نقطۂ نظر سے پرانی زبان، روایات، مذہب، شاعری، علم الحساب، نجوم، سوشل اور سیاسی نظام کی یوں بھی خاص اہمیت ہے - پرانے زمانے میں بہت سی تصنیفیں ہوئی ہیں جو آج کل کے سوشل علوم،

فلسفہ اور لسانیات کے جاننے میں بہت مفید ثابت ہوئی ہیں - سچ تو یہ ہے کہ انیسویں صدی میں بوپ - گرم اور میکس مولر وغیرہ نے جو نئے نئے نظریئے تیار کئے وہ ہندوستانی تہذیب کی اصل بغیر قائم ہی نہیں رہ سکتے تھے - جب ہندوستانی مواد کا پورا استعمال ہو چکے گا تو آج کل کے سوشیالوجی (علم تمدن) کی صورت بدل جائیگی -

مواد اور مسالا

سو برس سے اہل علم کو شکایت ہے کہ قدیم زمانے میں ہندوستانیوں نے تاریخ بہت کم لکھی ' اپنی کتابوں عمارتوں یا مورتیوں پر تاریخ کی روشنی ڈالنے کی پروا نہیں کی اور اب ہمارے لئے پوری تاریخ لکھنا نا ممکن سا کردیا ہے ' سیاسی تاریخ کے بارے میں آج باوجود بہت سی تحقیق کے یہ شکایت درست معلوم ہوتی ہے - تاریخ تمدن کے متعلق بھی یہ شکایت صحیح ہے کہ تاریخ کے نہونے سے سلسلہ ارتقا معقول طور پر قائم نہیں ہوتا - لیکن اس کے بعد جو دقت پیش آتی ہے وہ مواد کی کمی سے نہیں بلکہ اس کی افراط اور بہتات سے پیدا ہوتی ہے -

ادب

سنسکرت اور پالی زبان کا ادب اس قدر وسیع ہے کہ برسوں کی لگاتار محنت کے بعد ان پر کچھ دسترس ممکن ہے - وید ' برہمن ' آرنیک اور اُپنشد ہی برسوں کے لئے کافی ہیں - ان کے بعد بہت سے شروت سوتر ' گرہ سوتر اور دھرم سوتر آتے ہیں جن کے لفظ لفظ میں تاریخ تمدن کا مسالا گویا کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے - دو بڑی رزمیہ منظومات رامائین اور خصوصاً مہا بھارت بحر بے پایاں کے مانند معلوم ہوتی ہیں - اس زمانے کے بعد بدھوں کا ادب شروع ہوتا ہے جسکے بانیم " پالی نکایہ " اور دوسری کتابیں ہزاروں صفحات میں ہیں - دوسری صدی عیسوی

کے قریب سنسکرت ادب کے چشمے پھر نکلنے لگتے ھیں - ایک طرف تو منو ' وشنو ' یاگ والک ' نارد ' برھسپت ' پراشر وغیرہ کے دھرم شاستر ھیں جن کا سلسلہ اٹھارویں صدی عیسوی تک جاری رھا - دوسری طرف وہ تصانیفات ھیں جو کسی قدر ... کے ساتھ آٹھویں صدی کے قریب اٹھارہ پرانوں کی صورت میں نمایاں ھوئیں - تیسرے دھرم شاستر ' (مذھبیات) کام شاستر ' (زوجیات) نیت شاستر (سیاسیات) وغیرہ ھیں جو دھرم سے قریبی تعلق رکھتے ھیں - چوتھے بھاس ' کالیداس ' بھارو ' بھو بھوتی ' بان بھٹ ' ماگھ ' دنڈی ' شوبندھ ' شمندر ' گوزاتھم سوم دیو وغیرہ کی غیر مذھبی نظمیں ھیں جن میں ھر ھر دور کے تمدن کی تصویر کھنچی ھوئی ھے - پانچویں بودھوں کا سنسکرت ادب ھے جسکی بہت سی کتابوں کا پتہ حال میں نیپال ' چین اور تبت میں لگا ھے - چھٹے سنسکرت اور پالی زبانوں میں جینیوں کا ادب ھے جو برھمن اور بودھ کے ادب سے کسی طرح کم نہیں ھے اور جو زیادہ تر انہیں مواد اور مسالے پر مشتمل ھے - ساتویں برھمن ' بدھ اور جین مصنفوں کی قواعد (صرف و نحو) لغات ' ریاضی ' نجوم اور دیگر فنون پر کتابیں ھیں جو اپنے موضوع کے علاوہ کبھی کبھی سیاست و تمدن پر بھی اشارے کرتی ھے - آٹھویں ان سب اقسام ادبیات کے شروح و حواشی ھیں جو تقریباً ساتویں صدی سے لیکر آجتک لکھے گئے ھیں - نویں اقصاے جنوب میں تامل زبان کا ادب ھے جسکی ابتدا سنہ قبل مسیح تک پہنچتی ھے - اس سے زائد کار آمد کتابوں کا ذکر آگے کیا جائیگا اور حتی الوسع انکی تاریخ بتانے کی کوشش کی جائیگی - یہاں صرف اس بات پر زور دینا ضروری ھے کہ ویدوں سے لے کر بارھویں صدی تک کا ادب ھمارے قدیم تہذیب و تمدن کی تاریخ کا اصلی اساس ھے -

لیکن خوش قسمتی سے کچھ اور مسالا ہے جو ادب کی کمی

تانبے کے پتر اور پتھر کے کتبے

کو بالکل تو نہیں لیکن بہت کچھ پورا کردیتا ہے۔ تیسری صدی قبل مسیح میں بودھ راجہ اشوک نے بہت سے مضامین رعایا کے فائدے کے لئے پتھروں پر کھدوائے جو آجتک اُسی طرح موجود ہیں اور جن کا مطلب پرنسیپ، فلیت، ہلٹز اور بھانڈرکر ایسے عالموں نے صاف کردیا ہے۔ دوسری صدی قبل مسیح میں اُتکل کے جین راجہ کہار ویل کا شاتبی کملا تحریر ہے۔ پہلی صدی عیسوی کے بعد آندھر، چھترپ وغیرہ راجاؤں کے، چوتھی صدی کے بعد گپت مہاراج دھراجوں کے؛ اور اس کے بعد بارھویں صدی تک ملک کے عموماً تمام راجاؤں کے خاندان کے کتبے پتھر اور تانبے کے پتروں پر کثرت سے ملتے ہیں۔ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی، رائل ایشیاٹک سوسائٹی، اور اس کی بمبئی کی شاخ؛ اور بہار اور اوڑیسہ ریسرچ سوسائٹی کے رسالوں میں؛ کا پس انسکرپشنم انڈیکرم، انڈین اینٹی کویری اور ایپی گرافیا انڈکا میں ایسے ہزاروں مضامین بیسوں اہل علم نے مرتب کرکے اپنی شرحوں کے ساتھ شایع کرائے ہیں۔ دکن کے کتبے جو تعداد میں اور زیادہ ہیں اور جو سترویں صدی تک ملتے ہیں ایپی گریفیا کرناٹکا، ساؤتھ انڈین انسکرپشنس اور مدراس، ایپی گریفسٹس رپورٹ میں بھی شائع ہوئے ہیں۔ ان کتبوں سے سیکڑوں راجاؤں اور مہاراج دھراجوں کی تاریخ اور ان کے کارنامے معلوم ہوتے ہیں، اور ان کے زمانۂ حکومت کا نقشہ کھنچ جاتا ہے۔ اور تہذیبی، مذہبی سماج، معاشیاتی حالت اور ادبیات کا بھی پتہ لگ

یہی بات سکے اور مہروں سے بھی ثابت ہوتی ہے جو سنہ قبل مسیح کی ابتدا سے پنجاب ' سندھ اور مالوہ وغیرہ میں ملتے ہیں ' کبھی کبھی تو یہ سکے مذہبی اور تمدنی مسئلے کو معجزہ کی طرح حل کر دیتے ہیں -

سکے اور مہر

تمدنی اور مذہبی تاریخ کے لئے پرانی مورتیاں اور مکانات کے کھنڈر بھی بہت کارآمد ہیں تکش شلا ' سارناتھ پاٹلی پتر وغیرہ کو کھود کر جو برتن ؟ مورتیں اور مکانات نکالے گئے ہیں ' الورہ ' اجنتا اور کارلی وغیرہ میں جو گپھائیں اور چیت (بدھ خانقاہیں) ہیں ' سانچی وغیرہ میں جو لات ہیں وہ قدیم فن تعمیر کے اچھے نمونے ہیں - ہندو تمدن کے اس حصے کو سمجھنے کے لئے لنکا ' ورما ' سیام' کوچین' چانپا 'جاوا ' سماترا اور والی کے اُن مندروں اور مورتیوں پر نظر ڈالنا بھی ضروری ہے جن کے اصول اور قاعدے ہندوستان سے لئے گئے تھے اور جو اصل میں ہندو تمدن کے اجزا ہیں -

مکان اور مورت

قدیم ہندوستان کے بارے میں کچھ غیر ملکی سیاحوں اور مصنفوں نے بھی اپنی دیکھی یا سنی ہوئی باتیں لکھی ہیں ان کے بیانات میں بہت سی ضروری باتوں کا تذکرہ ہے جن کو ہندوستانیوں نے معمولی سمجھکر کہیں نہیں لکھا - سنہ ۵ - ۶ ق - م میں دریاے سندھ کا مغربی حصہ ایران کی وسیع سلطنت میں مل گیا تھا - ہیروڈتس وغیرہ یونانی مورخین نے جن کے ملک کا تعلق ایران سے تھا ہندوستانیوں کے بارے میں بھی دو چار باتیں لکھی ہیں - سنہ ۳۲۷ ق - م میں مسیڈونیہ شاہ سکندر اعظم کے ساتھ کچھ یونانی مورخ بھی آئے تھے جن کے تاریخوں اور بیانات کے حصے مابعد کی تاریخوں میں ملتے ہیں - دس پندرہ برس کے بعد سیلوکس نکتر کے سفیر

غیر ملکی تحریریں

میگھستنیز نے اپنا دیکھا اور سنا ہوا بہت سا حال لکھا - اس کی اصل تحریر تو ضائع ہو گئی لیکن اس کی بہت سی باتیں اور تاریخوں میں ادھر اُدھر پائی جاتی ہیں اسی طرح کچھہ دوسری یونانی اور لاطینی کتابوں میں ہندوستان کے بارے میں سنہ عیسوی کے آگے پیچھے کی کچھہ باتیں لکھی ہوئی ہیں - قدیم مغربی ادب کے ان بکھرے ہوئے بیانات کو سنہ ۱۸۴۶ میں جرمن عالم ای ' اے شوانوک نے یکجا کر کے شائع کیا تھا - ان کا انگریزی ترجمہ جے ' ڈبلیو میکرینڈل نے کیا ہے - ان تحریروں کا استعمال کرتے وقت یہ خیال رکھنا ضروری ہے کہ زبان اور رسم و رواج سے ناواقف ہونے کے باعث غیر ملکی سیاح کبھی کبھی دھوکا کھا جاتے ہیں - دوسرے ہمارے پاس جو باتیں پہنچی سکی ہیں ان میں شاید بیچ کے لکھنے والوں نے جو ہندوستان سے بالکل اجنبی تھے کچھہ نمک مرچ لگا دیا ہے -

چینی

پانچویں اور ساتویں عیسوی صدی کے حالات کے لئے چینی سیاح بڑے کام کے ہیں جو بدھ بھگوان کی زندگی سے تعلق رکھنے والے مقامات کا درشن کرنے ' بودھ شاستر پڑھنے اور جمع کرنے آئے تھے فاہیان (پانچویں صدی) کا ترجمہ جائیلس نے اور لیج نے بھی انگریزی میں کیا ہے - اور تامس وارٹس نے " چائنا ریویو " کے آٹھویں حصے میں شرح کی ہے - ہیون سانگ یا یوان چانگ (ساتویں صدی) کا ترجمہ سیموئیل بیل نے اور تھوڑا سا وارٹس نے کیا ہے - اِتسنگ (ساتویں صدی) کا ترجمہ جاپانی تاکاکشو نے کیا ہے -

عرب

مغربی ایشیا سے ہندوستان کا تجارتی تعلق سنہ ۸۰۰ ق م سے چلا آتا تھا ' اس کے بعد بہت سے ہندو راجاؤں نے مغربی حکمرانوں سے میل ملاپ کے تعلقات بھی پیدا کئے - آٹھویں صدی کے مسلمانوں سے سیاسی تعلق شروع ہوا - آٹھویں

صدی میں سندھ پر محمد بن قاسم کی عرب فوج نے حملہ کرکے فتح پائی - عربوں میں تاریخ نویسی کا فن بہت ترقی پا چکا تھا - سلیمان ' ابوزیدالحسن ابن هردوا ' المسعودی ' الادریسی وغیرہ عربوں نے نویں اور دسویں صدی میں ہندوستان کا کچھ حال لکھا - تیرھویں صدی میں چچ نامہ پہلی تاریخ ہند و سندھ لکھی گئی جس میں آٹھویں صدی کی لکھی ہوئی بہت سی باتیں شامل کرلی گئیں - گیارھویں صدی میں پنجاب اور سندھ پر حملہ کرکے محمود غزنوی نے ہندوستان کا دروازہ شمال مغرب والوں کے لئے پھر کھول دیا - اس کے دربار کا ایک عالم البیرونی ہندوستان آکر سنسکرت کا پورا پنڈت ہوگیا - اس نے ہندو دھرم ' ادب اور ' سائنس وغیرہ کا ایسا نقشہ کھینچا جیسا پہلے کسی کے خیال میں بھی نہ آیا تھا - اس کے بعد اور مسلمان مورخوں کی تحریروں میں بھی ہندو تہذیب کا کچھ ذکر آگیا ہے - یونانی ' لاطینی' چینی اور عربی کتابوں کا بہت سا ترجمہ انگریزی کے ذریعہ ہندی میں بھی ہوچکا ہے -

جغرافیہ کا اثر

اس تمام مسالے کی بنیاد پر تاریخ لکھنے سے پہلے عرصہ گاہ تمدن پر ایک نظر ڈالنا ضروری ہے براعظم ایشیا کے جنوب میں ہندوستان تقریباً ۱۸ سو میل لمبا اور ۱۸ سو میل چوڑا ملک ہے جس کا رقبہ (برهما کو چھوڑ کر) تقریباً پندرہ لاکھ مربع میل ہے - لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ شمال کے جانب نیپال ' افغانستان اور وسط ایشیا کا کچھ حصہ اور جنوب میں لنکا یہ سب ہندو تہذیب کے دائرے میں شامل تھے - دوسرے فارس ' بلوچستان ' سندھ اور راجپوتانہ کا ریگستان پہلے اتنا بڑا نہ تھا جتنا کے آج ہے - آریل اسٹائن وغیرہ نے زمین کھود کر ریت کے نیچے سے جو شہر اور مکانات بر آمد کئے ہیں وہ ثابت کرتے ہیں کہ کسی زمانے میں ہندوستان کے باہر مغربی ریگستان کی جگہ پر

ھرے بھرے کھیت اور گھنی آبادی تھی - ان سب دلیلوں کو جمع کرنے سے یہ نتیجہ نکلا ھے کہ نویں صدی ق - م سے نویں صدی عیسوی تک قدرتی اسباب کے وجہہ سے زمین آھستہ آھستہ خشک ھوتی گئی' پانی کم ھوتا گیا اور ریت کے ڈھیر نکلنے لگے - جب تک ریگستان نہ تھا یا تھوڑا ھی تھا اس وقت ھندوستان اور مغربی ملکوں میں تجارت اور آمدورفت برابر جاری تھی - اس لئے ان ملکوں کی تہذیبوں نے ایک دوسرے پر بہت اثر ڈالا -

آب و ھوا کا تغیر

آب و ھوا کے بارے میں بھی یہ کہدینا ضروری ھے (جیسا ایلزورتھ ھنٹنگٹن نے ''تہذیب اور آب ھوا'' اور ''ایشیا کی نبض'' وغیرہ کتابوں میں اور دوسرے مصنفین نے دنیا بھر کی نئی پرانی معلومات جمع کرکے ثابت کیا ھے) کہ بہت سے مقاموں کی آب و ھوا تبدیل ھوگئی ھے - پرانے ھندوستان کے بارے میں قطعی طور پر تو کچھ نہیں کہا جا سکتا - لیکن سرسوتی وغیرہ ندیوں کے وجود سے' ریگستان کی کمی سے' جنگلوں کی بہتات سے اور اس اعتبار سے کہ سرد ملک سے آئے ھوئے آریوں نے اپنے ویدک لٹریچر میں گرمی کی شکایت نہیں کی ھے یہ ضرور اندازہ ھوتا ھے کہ شمالی ھندوستان کی آب و ھوا تین چار ھزار سال پہلے آج کل کی طرح گرم نہ تھی - شاید یہ بھی ایک وجہ ھو کہ رگ وید کے زمانے کی سی پر مسرت زندگی کبھی نصیب نہیں ھوئی - چھ ھزار برس پہلے کے ثبوت تو اب اچھی طرح پیش کئے جا سکتے ھیں - ھڑپا اور موھنجودڑو میں گینڈے اور ھاتھی کے نشانات تو ملتے ھیں مگر شیر ببر کا کوئی نشان نہیں ملتا - اس سے صاف ظاھر ھے کہ اُسوقت سندھ اور مغربی پنجاب میں نمی اور ھریالی زیادہ تھی - یہ بھی ثابت ھوچکا ھے کہ سندھ میں اُسی وقت سندھ ندی کے علاوہ ایک اور ندی بہتی تھی -

ہندوستان کے شمال میں کوہ ہمالیہ ہے جو دنیا کے تمام سلسلۂ ہائے

ہمالیہ پہاڑ

کوہ میں سب سے بڑا پہاڑ ہے ' جسکی ایک ہی گھاٹی میں پورا آلپس سما سکتا ہے اور پندرہ سو میل تک پھیلا ہوا ہے - اگر ہمالیہ نہ ہوتا تو تبت کی تیز سرد ہوائیں شمالی ہندوستان میں آدمیوں کا رہنا ہی مشکل کر دیتیں اور زمین کو زرخیز بنانے والی ندیاں کہیں بھی نہ ہوتیں ' یہی دیکھ کر ایک زمانے میں ہندؤں نے ہمالیہ کو دیوتا مانا تھا - جنوب مشرق اور جنوب مغرب سے آنے والی موسمی ہوائیں ہمالیہ سے رک کر ٹھنڈی ہو جاتی ہیں اور شمالی حصہ میں موسلا دھار پانی برساتی ہیں - تاریخ پر ہمالیہ پہاڑ کا ایک بڑا اثر یہ بھی ہوا ہے کہ تبت اور ترکستان سے یا یوں کہنا چاہئے کہ منگولیا کے حصے سے ہندوستان کا تعلق کم رہا ہے - شمال کے درے انتے چھوٹے' تنگ اور ڈراونے ہیں کہ ان میں سے ہوکر گذرنا بہت مشکل ہے -

شمال مشرق کا سلسلۂ کوہ

شمال مشرق کی طرف یہ سلسلۂ کوہ نیچا ہو گیا ہے اور اسلئے اس طرف سے کچھ آمد و رفت بھی ہوتی رہی ہے - ادھر سے کچھ منگولیا کے لوگ آکر آسام یا شاید مشرقی بنگال میں بھی آباد ہوئے تھے لیکن اسطرف کا ملک جنگلوں اور جنگلی لوگوں سے ایسا گھرا ہوا ہے کہ اس طرف سے تجارتی اور ذہنی تعلق بہت نہیں ہو سکا - چین اور ہندوستان سے جو تعلق تھا وہ زیادہ تر سمندر کی راہ یا وسط ایشیا کی طرف سے تھا -

شمالی مغربی گھاٹیاں

برخلاف اس کے ہمالیہ پہاڑ کے شمالی مغربی نیچی گھاٹیوں کے دروں نے ہندوستان کی پوری تاریخ پر اپنی مہر لگادی - اس طرف کئی درے ہیں جن میں سے ہوکر آریہ لوگ ہندوستان آئے تھے اور انکے بعد ایرانی ' یونانی ' کوشن '

سٹھین ، ہونڈ ، افغان اور ترک آئے جنھوں نے ہندوستان کی تہذیب وسیاست پر انقلابی اثرات ڈالے - ان ریاستوں سے گیارھویں صدی تک وسط ایشیا ، مشرقی ایشیا اور یورپ سے تجارت بھی بہت ہوتی رہی اور ادب ، فن اور فلسفہ کے خیالات کا بھی باہمی تبادلہ ہوتا رہا -

شمالی میدان

شمالی میدان جس میں سندھ ، گنگا ، برھمپتر اور معاون ندیاں بہتی ھیں دنیاں کے بڑے زر خیز اور آباد حصۂ ملک میں شمار کیا جاتا ھے - کلکتے سے پیشاور تک چلے جائیے کہیں نہ کوئی پہاڑی ٹیلا ملے گا اور نہ کوئی ریگستان - ہر جگہ ھرے بھرے کھیت لہلہاتے ھیں ، کھیتی کے لئے اتنی محنت نہیں کرنی پڑتی جتنی فرانس ، انگلستان ، جرمنی وغیرہ ایسے ٹھنڈے اور کچھ کچھ پہاڑی ملکوں میں کرنی پڑتی ھے - یہاں ھمیشہ سے زراعت ھی ایک خاص پیشہ ھے اور ساری تہذیب پر زراعت کی عظمت کی مہر لگی ہوئی ھے - لوگ زیادہ تر گاؤں میں رھتے ھیں ، گاؤں ھی زندگی کا مرکز ، سیاسی نظام کی بنیاد اور اقتصادی زندگی کی اصل ھے - اس میدان میں کوئی قدرتی روک نہ ھونے کے باعث ، تہذیب و مذھب کا نظام یکساں رھا ھے - چھوٹی چھوٹی باتوں میں تھوڑا بہت فرق ضرور تھا لیکن اصول کا کوئی اختلاف نہ تھا - جہاں تہذیب و عادات میں اتنی یکسانیت ہو وہاں سیاسی اتحاد کی کوشش بھی ضرور ھی ھوگی - برھمن گرنتھوں کے وقت ھی میں یعنی سنہ عیسوی سے تقریباً ایک ہزار برس قبل سمندر کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک پھیلنے والی سلطنت کا تصور پیدا ھوگیا تھا ، موریہ خاندان ، کھارویل ، آ ایلندر ، گپت ، وردھن اور گرجر پرتیہار خاندانوں نے اس تخیل کو عملی جامہ بھی پہنا دیا ، لیکن ریل ، تار ،

اور اسلکی وغیرہ کے پہلے دنیا بھر کی بڑی سلطنتوں کے دور دراز مقامات کا انتظام و حکومت بہت مشکل کام تھا - اس لئے کبھی تو بہت بڑی مملکت بن جاتی تھی اور کبھی اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے تھے - اٹھارہویں صدی تک ہندوستان کی سیاسی تاریخ اسی چکر میں مبتلا رہی - بڑی بڑی سلطنتیں کے زمانے میں بھی سفر کی موجودہ سہولتیں نہ ہونے کے باعث صوبوں کو بہت کچھ آزادی دینا پڑتی تھی ' ایسا سیاسی نظام جغرافی وجوہ کی بنا پر ناگزیر تھا - قدیم یونان سے مقابلہ کیجئے تو صاف معلوم ہو جائیگا کہ یہاں اتھینس اور کارنتھ ایسے شہر بن ہی نہیں سکتے تھے ' نہ ویسی شہری مملکت بن سکتی تھی اور نہ ویسی سرگرم سیاسی زندگی پیدا ہو سکتی تھی - سندھ اور گنگا کا دوآبہ میدان اتنا بڑا ہے اور اس کے معمولی حصے بھی اتنے بڑے ہوں کہ یہاں جمہوری سلطنت کے لئے سلطنت کے تمام لوگوں کا جمع ہونا یا نمائندوں کا بھی اچھی طرح ملنا جلنا مشکل تھا - یہی وجہ ہے کہ کئی معاملوں میں جمہوری سلطنت کا اصول تسلیم کرنے کے باوجود یہاں مرکزی حکومت میں جمہوریت کا رنگ پیدا کرنا مشکل تھا -

ندیاں

شمالی ہندوستان کے ساری زندگی پر ندیوں کا زیادہ اثر پڑنا ضروری تھا - پہاڑی دریاؤں کی مٹی کنارے کے میدانوں کو بہت زیادہ زرخیز بنا دیتی ہے - اس لئے ان صوبوں کی آبادی سب سے زیادہ تھی ' دریائی راستوں کے وجہ سے تجارت بھی ترقی پر تھی اور اُن کی شان بھی بہت زیادہ تھی - شہر بھی زیادہ تر ندیوں کے کنارے آباد تھے اور تہذیب کے مرکز تھے - کوئی تعجب نہیں کہ متعدد پرانے شہروں کی طرح یہاں بھی گنگا ' جمنا ' گوداوری اور کاویری ایسی بڑی ندیاں پاک اور مقدس مانی گئی ہیں -

شمالی میدان کے جنوبی کنارے پر ستپرا اور وندھیاچل کے سلسلے

دکن

میں جو کہیں بھی بہت اونچے نہیں ہیں اور ادھر ادھر خصوصاً مشرق میں اتنے نیچے ہوگئے ہیں کہ آنے جانے میں کوئی روک نہیں ہوتی - اس طرح کے پہاڑوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ شمال اور جنوب میں ایک بین فرق ہوگیا ' ذاتوں کا فرق ' زبانیں مختلف رہیں ' سیاسی تاریخ بھی اپنے اپنے علحدہ راستوں پر چلتی رہی ' لیکن تہذیب کی اصل ایک رہی - مذہب کے وہی اصول دونوں طرف رائج رہے ' سنسکرت اور پالی زبان کی تعلیم بھی ویسی ہی رہی ' زندگی پر ایک ہی طرح کی نظر رہی ' دونوں حصوں کے آپس میں تجارتی تعلقات بھی رہے - اور چوتھی صدی قبل مسیح کے بعد کئی بار دونوں میں گہرے سیاسی تعلقات بھی پیدا ہوگئے - شمال اور جنوب کی تہذیب کے اصل اصول ایک ہی تھے لیکن ان کے سلسلہ ہائے تاریخی کبھی کبھی علیحدہ رہے - ایک بڑا فرق اُن میں یہ تھا کہ شمال مغرب سے آنے والی قومیں یا تو دکن تک پہونچتی ہی نہ تھیں یا تھوڑی تعداد میں پہونچتی تھیں - نربدا اور کرشنا ندی کے بیچ کا حصۂ ملک اتنا ہموار اور زرخیز نہیں ہے جتنا شمالی میدان - نہ اُس کی آبادی اتنی گھنی تھی ' اور نہ خشکی کی تجارت اُس درجے کی تھی - لیکن مغربی اور مشرقی کنارے پر سمندر کے ذریعہ دور درو کے ملکوں سے تجارتی تعلقات کی سہولت تھی - سمندر کے راستے سے ہندو تہذیب اور ملکوں میں جاسکتی تھی اور غیر ملکی خیالات یہاں آسکتے تھے -

کرشنا ندی کے نیچے جو حصہ ہے اور جسے انتہائے جنوب کہہ سکتے

انتہائے جنوب

ہیں وہ پورب میں تو اکثر مقامات پر ہموار ہے لیکن مغرب میں پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے آنے جانے کی کوئی

قدرتی روک نہ ہونے کے باعث یہ بھی تہذیب کے اصل اصول کے اعتبار سے دکن اور شمال کے مانند ہوگیا ہے لیکن دور ہونے کی وجہ سے اس پر شمال کا اثر کم رہا ہے - شمال کی قومیں تھوڑی تعداد میں یہاں آئیں اس لئے یہاں کی تہذیب بعض حصوں میں شمال سے مختلف رہی ' کچھ اجتماعی ادارے سب سے نرالے ہی رہے ' زبان پر سنسکرت کا اثر بہت کم ہوا - مندر ' مورت اور مکانات وغیرہ بنانے کے طریقے بھی مختلف رہے - سیاسی نظام میں بھی گاؤں کا انتظام وغیرہ بھی اپنے ہی طرز کا رہا - اقصائے جنوب کی تاریخ بقیہ ہندوستان کا جزو ہونے کے باوجود اپنی ایک خصوصیت رکھتی ہے جس کا لحاظ تمدن کی تنقید اور تجزئے میں رکھنا ضروری ہے -

لنکا

اقصائے جنوب سے کسی قدر دور سنگلدیپ یا جزیرۂ لنکا واقع ہے جس کی سیاسی تاریخ ہندوستان سے زیادہ الگ رہی ہے لیکن جس کی تہذیب یعنی مذہب ' زبان ' تخیلات و عادات ' فن اور علوم پر ہندوستان کا اور خصوصاً اقصائے جنوب کا اثر ہمیشہ سے بہت رہا ہے - لنکا کے بارے میں بہت کہنے کی ضرورت نہیں ہے لیکن ہندوستانی تہذیب کی تاریخ میں اس کو بالکل چھوڑ دینا بھی ناممکن ہے -

دراوڑی قومیں

ہندوستان کے شمال میں شمال مغرب ' شمال مشرق ' وسط ہند اور مغرب میں تمام کوکن اور ملابار کے کنارے پر جو کوہستانی سلسلے ہیں انہوں نے تہذیب پر ایک اور اثر ڈالا ہے - ہموار میدانوں کو فتح کرنے والی قوموں سے شکست پاکر پرانے باشندے پہاڑیوں میں پناہ لے سکتے تھے وادیوں اور جنگلوں کی آڑ میں وہ اپنی ہستی ' اپنی زبان اور رسم و رواج کی حفاظت کرسکتے تھے - باہر کا تھوڑا بہت اثر پڑنے کے باوجود یہ قومیں اپنے پرانے ہی راستوں

پر چلتی رہیں ، آج بھی ان میں طرح طرح کے بیاہ ، وراے بھاگ ، مذہبی معتقدات اور جماعتی ادارے قائم ہیں - عام ہندوستانی تہذیب کے اثر سے یہ الگ رہی ہیں - اس کتاب میں ، اُن کا ذکر بہت کم آئیگا ، لیکن اُن سے تھوڑی سی واقفیت ضروری ہے -

آب و ہوا

آدمی کی سیرت پر صنعت و حرفت کا اثر بہت پڑتا ہے ، صنعت و حرفت آب و ہوا کے مطابق ہوتی ہیں - یہ تو صاف ہے لیکن پچھلے سو برسوں میں اہل علم نے یہ پتہ لگانے کی بھی کوشش کی ہے کہ خود آب و ہوا کا اثر سیرت پر کیسا پڑتا ہے - اس مشکل مسئلے پر یقینی طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا لیکن دو چار قیاسات ممکن ہیں - ہمارے ملک کا دار و مدار کھیتی پر ہے ، کھیتی مینھہ پر منحصر ہے بارش کا ہونا اپنے اختیار کی بات نہیں ہے - بلکہ خدا کی مرضی پر ہے - اساڑہ کے مہینے سے بھادوں تک تمام لوگ آسمان پر ٹکٹکی لگائے رہتے ہیں اور بارش کے لئے دعائیں مانگتے ہیں - اور اگر پانی نہ گرے تو اپنی مجبوری پر ہاتھ ملتے ہی رہ جاتے ہیں ، اگر کبھی زیادہ بارش ہوجائے یا پالا پڑ جائے تو بھی مجبور ہوکر کھیتوں کی تباہی دیکھنی پڑتی ہے - لوگ سوچتے ہیں کہ آدمی کی طاقت کچھ نہیں ہے ، خدا ہی قادر مطلق ہے - شاید یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں لوگ قسمت کو بہت مانتے ہیں ، دیوی دیوتاؤں کی پوجا بہت کرتے ہیں - دوسری طرف دن میں سورج کی چمک ، رات کی روشن چاندنی اور ستاروں کی دیوالی ، یہ سب چیزیں توجہ کو اوپر لیجاتی ہیں اور دیوتاؤں کا خیال کراتی ہیں - انگلستان کی طرح ہندوستان میں زیادہ کہرا نہیں پڑتا - خوب اوجالا رہتا ہے - اس کا اثر طبیعت پر یہ پڑسکتا ہے کہ کھلے ہوئے خیالات اور منطق کو تقویت

ہر کچھ ہو مگر منطق کی محبت ہندوستانی تہذیب میں ضرور دکھائی دیتی ہے ' دھرم اور ادب کے خیالات کا بھی کچھ تعلق شاید جغرافیہ سے ہے - ہمالیہ کی اونچی چوٹیاں ' ہزاروں میل لمبے میدان ' جھوم جھوم کر بہنے والی لمبی چوڑی ندیاں ' موسلا دھار مینھ اور طوفان ' آسمان پر نظام شمسی کا اجتماع ' یہ سب قدرتی مناظر خیالات میں جولانی پیدا کرتے ہیں -

ہندوستان کی وحدت

وسیع ہونے کے باوجود ہندوستان کی وحدت نقشے اور تاریخ پر صاف لکھی ہوئی ہے ' جیسا کہ جغرافیے کے زبردست عالم چیزوم نے کہا ہے ' دنیا میں کوئی ملک ایسا نہیں ہے جو ہمسایہ ممالک سے اتنا مختلف ہو جتنا کہ ہندوستان ہے - بہت پرانے زمانے میں جب آمد و رفت بہت مشکل تھی ہندوستانیوں نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ ہمارا ملک اور ہمارے عادات و رسوم ' باہر والوں سے جدا ہیں ' رامائین اور مہابھارت کے زمانے میں " کشمیر اور کنیا کماری تک کے اور سندھ سے برہمپتر تک کے حصہ ملک کو " بھارت ورش " کے نام سے پکارا جاتا تھا - آپس میں کتنا ہی فرق ہو لیکن دوسروں کے مقابلے میں سب " بھارت باشی " ایک ہی طرح کے معلوم ہوتے تھے - تہذیب کے بہت سے حصوں میں اس وحدت ویکرنگی کا اثر پایا جاتا تھا - گنگا جمنا ' سرسوتی ' سندھ ' نربدا ' گوداوری اور کاویری جو مقدس ندیاں مانی گئی ہیں ' وہ ملک کے تمام حصوں سے لپٹی ہیں ' آٹھویں صدی میں شنکراچارج نے بدری ناتھ کدار ناتھ ' رامیشور ' دوارکا اور جگناتھ یہ چار خاص تیرتھ کے مقامات ملک کے ایک ایک گوشے سے منتخب کئے تھے - دوسرے تیرتھ کے مقامات مثلاً ہردوار ' پریاگ ' بنارس ' گیا ' اوجین اور کانچی بھی ملک

بھر میں پھیلے ہوئے ہیں - برہم پران وغیرہ میں جو مقدس مندر سرود وغیرہ گنائے گئے ہیں وہ بھی ملک کے تمام حصوں سے لئے گئے ہیں، جھیلوں کے تیرتھ کے مقامات، سپید شکھر، پاوا پری، شرونڈیسوبل گوں، آبو پہاڑ وغیرہ بھی تمام ملک میں بکھرے ہوئے ہیں، پرانے زمانے میں ادب، سائنس، اور مذہب کی زبانیں سنسکرت اور پالی سارے ملک میں بڑھی جاتی تھیں - تکشلا، نالندہ بکرم شلا وغیرہ ودیا پیٹھوں میں ملک کے گوشے گوشے سے طالب علم آتے تھے، اپنی شہرت قائم کرنے کے لئے اہل علم سارے ملک میں گھوم کر "وگ وجے" کیا کرتے تھے، جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، اقتصادی اور سیاسی تعلقات ملک کے تمام صوبوں کو ایک دوسرے سے متحد کر دیتا تھا -

ملک کی پرانی تہذیب کا کچھ حال اس کتاب میں لکھا جائیگا،

تہذیب سے پہلے

لیکن تہذیب سے پہلے کی بحث اس کے دائرہ سے باہر ہے، اتنا کہدینا کافی ہو گا کہ کسی تہذیب کی تخلیق یکا یک نہیں ہوتی، آدمی کی زندگی کے پرانے آثار جو دنیا کے قریب قریب تمام حصوں میں گپھاؤں سے، زمین کے اور ندیوں کے نیچے سے نکلے ہیں اور جن کو ایک ساتھ پڑھکر عالموں نے سب سے پرانی زندگی کی جو تصویر کھینچی ہے اُن سے ثابت ہوتا ہے کہ کسی زمانے میں جیسے تیسے کچے گوشت اور جنگلی کند مول پر بسر کرتا تھا اور پتھر یا ہڈی کے بھدے اوزار بنا کر شکار کرتا تھا، بہت زمانہ گذر جانے پر اوزاروں کی شکل اور طاقت سدھر گئی، اور پرانا پتھر کا زمانہ بدل کر نیا پتھر کا زمانہ ہو گیا، اسکے بعد آہستہ آہستہ اور ترقی ہوئی اور کانسے کے ہتھیار بننے لگے جس سے یہ زمانہ کانسے کا زمانہ کہلاتا ہے - ان زمانوں کا ثبوت ہزاروں برس سے ملا ہوا ہے، اس زمانے میں جانوروں کے پالنے کی رسم بھی

جاری ہو گئی تھی ' اسکے بعد کھیتی شروع ہوئی اور پھر صنعت و حرفت کا زمانہ آیا ' آپس کی زندگی میں بھی تبدیلیاں ہوئیں ' شادی بیاہ کے طریقے قائم ہوئے ' خاندانوں کی بنیادیں پڑیں ' ہر ایک جماعت ایک مکھیا یا بڑا سردار ماننے لگی ' غیر شایستہ و نیم شایستہ زندگی کی یہ ہزاروں برس کی کہانی بہت دلچسپ ہے اور ان صفحوں سے غیر متعلق ہونے کے با وجود یاد رکھنے کے قابل ہے - ہندوستان کے یہ پرانے باشندے کس خاندان سے تھے ؟ - اس سوال کا جواب دینا ناممکن ہے ' پرانی کھوپڑیوں اور ہڈیوں پر بہت غور کیا گیا لیکن نہ تو اُن کا زمانہ ہی ٹھیک ٹھیک متعین ہوسکا اور نہ یہ پتہ لگ سکا ہے کہ اُن آدمیوں کا تعلق دوسری قوموں سے کیا تھا ' ممکن ہے کہ جس وقت آدمی کی پیدائش ہوئی اُس وقت ہندوستان یا تو اسٹریلیا سے جڑا ہوا تھا یا افریقہ سے یا دونوں سے ' اور ان صوبوں میں اور دیگر بے نشان حصوں میں کوئی ایک ہی قوم رہتی تھی ' لیکن اس کے بعد بڑھتے ہوئے سمندر کے ذرایع مسدود ہو جانے سے ادھر اُدھر کے لوگ ایک دوسرے سے علحدہ ہو گئے اور اپنے اپنے ڈھنگ پر نئی نئی جماعتیں قائم کرنے لگے ' لیکن ہزاروں برس سے کہیں کہیں زمین خشک ہو جانے سے یا آبادی بڑھ جانے سے یا دوسروں کی دولت پر قبضہ کرنے کی خواہش سے یہ مختلف جماعتیں ایک دوسرے کو ڈھکیلتی رہیں ' ادھر سے اُدھر جاتی رہیں ' کبھی ایک دوسرے کو تباہ کرتی رہیں ' کبھی ایک دوسرے سے ملتی رہیں ' کبھی ایک دوسرے کو غلام بنا کر دباتی رہیں ' یہ انقلابات اتنے بار ہوئے ہیں اور کبھی کبھی اتنے بڑے پیمانے پر ہوئے ہیں کہ دنیا میں کوئی قوم اپنے مقام پر قائم نہیں رہ سکی اور نہ کوئی قوم دوسری قوم کی آمیزش سے بچ سکی ہے ' تاریخ میں بلا آمیزش کوئی قوم کہیں نہیں ملتی .

ہندوستان میں

ہندوستان میں جہاں بہت سی قوموں کی نشو و نما ہوئی ہے اُن مقامات کو دیکھکر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ قوموں کی مخالطت باہمی یہاں تاریخ سے پہلے ہو چکی ہے ' وسط ہند کی دور دور کی گھاٹیوں اور جنگلوں میں ایک ہی طرح کی جماعت آباد ہے ' جن کی زبان ملتی جلتی ہے اور رسم و رواج یکساں نہیں ' معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ کسی پرانے زمانے میں میدانوں میں رہتے تھے لیکن کسی طاقتور قوم کے حملوں سے تنگ آکر انہیں پہاڑیوں کی پناہ لینی پڑی' یہ طاقتور قوم کون تھی ؟ - آریہ ' یا دریوڈ یا اور کوئی یہ بڑا مشکل سوال ہے جس کا جواب یقین کے ساتھ نہیں دیا جاسکتا - بلوچستان کے ایک حصے میں " براھوی " زبان بولی جاتی ہے جو اقصائے جنوب کے دریوڈ زبان سے ملتی جلتی ہے اور جو گرد و پیش کی کسی زبان سے تعلق نہیں رکھتی ' اس کا مطلب (۱) یا تو یہ ہے کہ دراوڈ لوگ شمال مغرب سے آئے تھے اور بلوچستان میں اپنا ایک جتھا چھوڑ کر یا کسی گروہ پر اپنا نقش قائم کرکے فوراً ہی یا کچھ دن بعد کسی وجہ سے دکھن چلے گئے (۲) یا کسی زمانہ میں یہ دراوڈ لوگ سارے ہندوستان کے قدیمی باشندے تھے ' اس کے بعد آریوں نے ان کو شمال سے نکال دیا یا اپنے میں ملا لیا ' لیکن کسی وجہ سے ایک ٹکڑا شمال مغرب میں رہ گیا ' ان دونوں خیالات میں سے ایک کا بھی ثبوت نہیں دیا جاسکتا ' لیکن یہاں اتنا اور کہدینا ضروری ہے کہ دراوڈ لفظ کا استعمال صرف سہولیت کے لیے کیا جاتا ہے - ورنہ واقعی دراوڈ کوئی قوم نہیں ہے' دکن میں کئی قومیں ہیں اور ہر قوم ایک دوسرے میں خلط ملط ہے دوسری بات یہ ہے کہ اگر ہمیں شمال میں رہنے والی قدیم قوموں کا پتہ بھی لگ جائے تو اس سے تاریخی زمانے کے باشندوں کے بارے میں زیادہ واقفیت نہیں ہوسکتی

پچھم سے آئی ہوئی قوموں کے آباد ہونے سے ایک نئی قوم پیدا ہو گئی۔

آریوں کے آنے سے پہلے شمال میں کون کون سی قومیں تھیں ؟ اسکی

ہڑپا اور موہنجوداڑو

تفصیل ویدک لٹریچر کی بنیاد پر آیندہ باب میں کی جائیگی ' یہاں اس بات پر زور دینا ضروری ہے کہ آریوں کے آنے سے پہلے ملک میں تہذیب کافی طور پر پھیل گئی تھی ' پچھلے سات برسوں میں آرکیالاجیکل ڈیپارٹمنٹ (محکمۂ آثار قدیمہ) کے جان مارشل ' راکھال داس بنرجی ' دیا رام سنہی ' وغیرہ نے سندھ اور مغربی پنجاب میں ہڑپا اور موہنجوداڑو کے مقامات کو کھود کر بہت سے برتن ' مکان مندر ' تالاب ' غسل خانے اور شہر نکالے ہیں جو اعلیٰ درجہ کی تہذیب کا ثبوت دیتے ہیں - یہ تہذیب کم سے کم چھ سات ہزار برس پرانی ہے ' اور سندھ ' پنجاب اور راجپوتانہ میں اور شاید ادھر اُدھر کے اور حصوں میں بھی پھیلی ہوئی تھی ' مصر اور بابل کی تہذیب سے موازنہ کرتے وقت معلوم ہوتا ہے کہ اُس پرانے زمانے میں بھی ہندوستان میں ان کے مقابلے میں اسائش زندگی کا زیادہ سامان تھا - ایک مثال لیجئے :— موہنجوداڑو شہر میں صفائی کا جیسا انتظام تھا ' گندگی بہانے کے لئے جیسی اچھی نالیاں تھیں ویسی جنوبی میسوپوتامیا کے مشہور شہر اُر میں بھی نہ تھیں -

ہڑپا میں ایک سو پچاس سے زیادہ مٹی کی مہریں ملی ہیں ' جن پر طرح طرح کی تصویریں بنی ہوئی ہیں ' ان تصویروں اور باقی چیزوں کے مطالعہ سے چھ سات ہزار برس پہلے کی زندگی کے متعلق بہت سی باتیں معلوم ہوتی ہیں ' اس زمانے میں سندھ اور مغربی پنجاب میں آج کل کی بہ نسبت پانی کہیں زیادہ برستا تھا ' سندھ

ندی کے پورب میں ایک اور ندی بہتی تھی جو اب موجود نہیں ہے' آبپاشی کا انتظام بہت اچھا تھا - کھیتی خوب ہوتی تھی - موھنجوداڑو میں جو

خوراک

گیہوں کے دانے ملے ہیں وہ آج کل کے پنجابی گیہوں کے ہیں ' کھانے پینے میں روٹی کے علاوہ دودھ کا بھی بہت استعمال ہوتا تھا ' نیم سوختہ ہڈیاں جو مکانوں میں ملی ہیں ' اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن دنوں مچھلی ' کچھوا ' گھڑیال ' بکری ' سور اور گاے کے گوشت کھانے کا بھی رواج تھا ' بہت سے مکانوں میں چرخے کے گھیرے (پنڈلیاں) بھی ملے ہیں ' جن سے معلوم ہوتا ہے کہ گھر گھر چرخا چلا کرتا تھا -

کپڑا

بہت باریک بنے ہوئے روئی کے کپڑوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ کپڑا بننے کا ہنر بہت ترقی پر تھا ' مرد ' اکثر ایک دھوتی پہنتے تھے اور ایک دوشالہ بدن پر اوڑھتا تھا جو بائیں کندھے کے اوپر سے ہوکر داہنے کندھے کے نیچے آجاتا تھا ' لیکن داہنے ہاتھ کو کھلا چھوڑ دیتا تھا ' مردوں میں بعض لوگ مونچھیں منڈاتے تھے اور بعض نہیں - زیادہ تر لوگ چھوٹی سی ڈاڑھی رکھتے تھے' بالوں کو ماتھے سے اوپر لیجاکر پیچھے ایک بڑی سی چوٹی بناتے تھے - بدقسمتی سے عورت کی ایک بڑی مورت ملی ہے ' اس کے بال بندھے ہوئے نہیں ہیں بلکہ کھلے ہوئے ہیں ' لیکن یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ عام رواج تھا یا نہیں -

زیور

اُس زمانے میں زیور پہننے کا بہت رواج تھا ' مرد اور عورت دونوں ہنسلی اور چھاپ (ایک زیور) پہنتے تھے - عورتیں ' کان میں بالی ' ہاتھ میں چوڑی ' کمر پر کردھنی اور پاؤں میں ساتھ وغیرہ بھی پہنتی تھیں - امیر آدمیوں

زیور سونے ، چاندي اور طرح طرح کے جواهرات کے هوتے تھے ، هاتھی دانت کا بھی استعمال هوتا تھا - زیور بنانے کے هنر میں اُس زمانے کے لوگ آج کل کے سناروں اور جوهریوں سے کسی طرح کم نہ تھے ، سونے کے بعض بعض زیور اس صفائی سے بنے هیں کہ تعجب هوتا هے - غریب آدمی سیپ اور کوڑی وغیرہ کے زیوروں سے تسکین حاصل کرلیتے تھے ، یہ کپڑے بہت کم پہنتے تھے ، غریب عورتیں صرف کمر پر ایک دھوتی باندہ لیتی تھیں ، ایک طوائف کي چھوٹی سی مورت ملی هے جو بالکل برهنہ هے -

گاڑي

سواری کے لئے امیروں کے پاس گاڑیاں تھیں ، جن میں دو پہئے هوتے تھے ، اوپر چھت هوتی تھی اور هانکنے والا آگے بیٹھتا تھا - هڑپا میں اسي گاڑي کا جو نمونہ کانسے کا بنا هوا ملا هے ، وہ مصر یا میسوپوٹامیا سے بہت پرانا هے ، اور دنیا میں گاڑی کا سب سے پرانا ڈھانچا هے -

مکان

رهنے کے مکانات اور سرکاری دفاتر کبھی کبھی بہت بڑے بنائے جاتے تھے ، ایک مکان ملا هے ، جو اُتر سے دکھن ۱۶۸ فٹ اور پورب سے پچھم ۱۳۶ فٹ هے ، جس میں دونوں طرف بہت سے مربع کمرے اور دالان هیں اور بیچ میں ایک بڑا کمرہ چھٹ گیا هے ، یہ جزیرۂ کریت کے مائنوں تہذیب کے زمانے کے پرانے محلات سے ملتا جلتا هے ، ممکن هے کہ کریت کی طرح یہاں بھی لگان کي شکل کي چیزیں وصول کرکے جمع کیجاتی هوں ، افسوس هے ، کے بہت سے مکانات اس بری حالت میں هیں کہ اُن سے کچھہ نتیجہ نہیں نکلتا ، لیکن دو باتیں صاف معلوم هوتی هیں ، ایک تو یہ کہ نہانے کے لئے غسلخانے بہت شاندار بنائے جاتے هیں ، اُن کی بعض بعض

دیواریں دس دس فٹ موٹی ہیں ، دھوپ یا آگ سے بنائی ہوئی اینٹیں بڑی خوبصورتی سے لگائی گئی ہیں ، فرش بھی اینٹوں کے ہیں اور بہت خوبصورت ہیں ، دوسرے یہ کہ تالاب بہت تھے ، اور شاید ان میں سے کچھ مقدس مانے جاتے تھے - مہروں سے معلوم ہوتا ہے کہ چیتے ، وغیرہ کا شکار بہت کھیلا جاتا تھا -

ہتیار وغیرہ

لوہے کی کوئی چیز نہیں ملی ہے ، بھالے ، کٹار ، گنڈاسے ، ہنسلے ، چاقو وغیرہ وغیرہ تانبے کے بنتے تھے ، ٹین اور سیسے کی بھی بہت سی چیزیں بنتی تھیں ، اکثر اوزاروں کے لئے کانس کا بھی استعمال کیا جاتا تھا ، تانبا شاید بلوچستان ، موجودہ راجپوتانہ اور شمالی افغانستان سے آتا تھا ، ٹین شاید ، کھراوں سے یا اور زیادہ پچھم سے آتا تھا ، یہ بھی ظاہر ہے کہ تجارت دور دور سے ہوتی تھی اور صنعت و حرفت بھی ترقی پر تھی ، مہروں سے پتہ چلتا ہے کہ ملک کی حفاظت کے لئے سپاہی ہوتے تھے ، جو دھات کی بنی ہوئی مضبوط ٹوپیاں پہنتے تھے ، ابتک کوئی ایسی چیز نہیں ملی جسکی بنیاد پر سیاسی و تمدنی نظام کے بارے میں کچھ لکھا جا سکے ،

سومیریں تہذیب

ہڑپا اور موہنجوداڑو کی تہذیب میسوپوٹامیہ کے سومیرین تہذیب سے بہت ملتی جلتی ہے لیکن اسکا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ ایک نے دوسرے کی نقل کی ، گمان ہوتا ہے کہ بیچ میں ریگستان نہ ہونے سے ہندوستان اور مغربی ایشیا میں باہم بہت آمد و رفت تھی اور اسلئے بہت سی باتوں میں یکرنگی ہو گئی تھی ، ہندوستان سے لیکر میڈیٹیرینین سی تک شاید ایک ہی عظیم‌الشان تہذیب تھی جسکی مختلف ملکوں میں مختلف شکلیں تھیں ، لیکن وہ بہت سی باتوں میں ملتی جلتی تھیں ،

بہر صورت کچھ ہو یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہئے کہ پرانے زمانے میں ہندوستان مغربی ملکوں سے بالکل الگ نہ تھا بلکہ غیر ممالک سے بہت تعلق رکھتا تھا ' دوسری یہ بات بھی خیال رکھنی چاہئے کہ ہندوستان کی قدیم تہذیب آریوں کی تہذیب سے بھی پرانی تھی اور جہاں تک ممکن تھا اس نے آریہ تہذیب پر بہت اثر ڈالا ' موہنجوداڑو میں پوجے کے بہت سے لنگ ملے ہیں ' ویدک ادبیات میں شِشن دیوتاؤں کی برائی کی گئی ہے ' اس سے ثابت ہوتا تھا کہ آریوں میں پہلے لنگ کی پوجا نہیں ہوتی تھی ' لیکن ویدک زمانے کے بعد انہوں نے غیر آریوں سے شیو لنگ کی پوجا اختیار کی ' ہڑپا اور موہنجوداڑو کے متعلق ابھی تک تحقیقات جاری ہے ' ممکن ہے کہ آگے چل کر آریوں کے غیر آریوں سے اور بہت سی باتوں کے لینے کے بھی ثبوت ملیں -

بدھی پرشاد

رگ وید کا زمانہ

(منڈل ۱—۹)

ہڑپّا اور موہنجوداڑو کے کھنڈرات سے جس تہذیب کا پتہ چلتا ہے،

رگ وید

اس سے پہلے کی تاریخ کا ابھی تک پتہ نہیں چلا ہے۔ اور سب تہذیبوں کی طرح اس میں تبدیلیاں ہوئی ہوں گی، شاید کچھ ترقی ہوئی ہوگی، دوسری تہذیبوں سے تعلق کے باعث بہت کچھ باہمی اثر پڑا ہوگا، لیکن ابھی تک اس کے تاریخی آثار نہیں ملے ہیں۔ ہڑپّا اور موہنجوداڑو کے کھنڈرات کے بعد تاریخ رگ وید سے شروع ہوتی ہے۔ رگ وید دس منڈلوں میں منقسم ہے، جن میں کل ملاکر ایک ہزار اٹھائیس منتر ہیں۔ یہ منتر مختلف رشیوں نے مختلف اوقات اور مختلف مقامات پر بنائے تھے، لیکن ان میں صحیح ترتیب قائم کرنا ناممکن ہے۔ کئی عالموں نے منتروں کی زبان، ان کے دانز، خیال اور مصنفین کو پیش نظر رکھکر اس کے زمانے کی تحقیق کی کوشش کی، لیکن کافی مواد نہ ہونے کے باعث اس میں کامیابی نہ ہوسکی۔ یقینی طور پر تو صرف اتنا ہی کہا جاسکتا ہے کہ دسویں منڈل کے منتر اور منتروں کے بعد طیار کئے گئے تھے۔ اس لئے سب سے قدیم تہذیب کا بیان پہلے ہی

۹ منڈلوں کی بنیاد پر کیا جائے گا - دسویں منڈل کا استعمال بعد کی تہذیب کے لئے ہوسکتا ہے - پہلے ۹ منڈلوں کے بارے میں خیال ہے کہ سب سے پہلے دو سے سات تک منڈل بنائے گئے تھے جو گرت سمد ' وشوا متر ' کامدیو اتری ' بھرد دواج اور وسشٹھ رشیوں کے نام سے ہیں - ان کے بعد شاید وہ منتر طیار کئے گئے جن کا نمبر پہلے منڈل میں ۵۱ سے ۱۹۱ تک ہے - اس کے بعد پہلے منڈل کے دوسرے منتر یعنی شروع کے پچاس منتر اور آٹھویں منڈل کے منتر بنائے گئے - اس کے بعد سوم دیوتا سے تعلق رکھنے والے منتر شاید ان آٹھ منڈلوں سے نکال کر اکٹھا کئے گئے اور یہ منتروں کا مجموعہ نویں منڈل کی صورت میں ظاہر ہوا [۱] -

رگ وید کا زمانہ

رگ وید کے منتروں میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جس سے ان کی تاریخ کا فیصلہ کیا جاسکے ' اہل علم نے بہت کچھ ظن و تخمین سے کام لیا ہے لیکن ابھی تک کوئی ایسا نتیجہ نہیں نکل سکا جس پر سب لوگ متفق الرائے ہوں - تقریباً ساٹھ ستر برس ہوئے مشہور و معروف جرمن عالم میکس مولر نے ویدک اور کلاسک سنسکرت کے فرق کا مقابلہ گریک زبانوں کے فرق سے کرکے یہ خیال کیا تھا کہ رگ وید عیسوی سنہ کے ۱۰۰۰ — ۱۲ سو سال پہلے بنایا گیا ہوگا ' لیکن یہ صرف خیال ہے ' تمام زبانوں میں ایک ہی ترتیب سے تبدیلیاں نہیں ہوتیں - اس زمانے کے دو بڑے ویدک عالم میکڈانل اور کیتھ نے میکس مولر کی یہ رائے تسلیم کرلی ہے لیکن کچھ اور عالموں کی رائے ہے کہ رگ وید کے زمانے کو اور بہت پیچھے لیجانا چاہئے ' جوتش کی تحقیقاتوں کی بنیاد پر جرمن اہل علم جے کوبی نے رگ وید کا زمانہ

---

[۱] — دیکھئے آرنلڈ ' ' ویدک میٹر ' رگ وید سنگھتا کا مقدمہ نوشتہ میکس مولر ' میکڈانل ' ہسٹری آف سنسکرت لٹریچر ' صفحہ ۳۸ — ۴۰ -

قریب قریب ۴۰۰۰ برس قبل مسیح ' اور بال گنگا دھر تلک نے تقریباً ۸۰۰۰ برس قبل مسیح ٹھہرایا ہے ' لیکن پوری تحقیقات کرنے سے یہ رائیں بھی محض خیالی رہ جاتی ہیں - مشکل یہ ہے کہ قدیم ہندوستان میں جوتش کی بہت سی گنتیاں تھیں اور ٹھیک ٹھیک پتہ نہیں چلتا کہ رگ وید میں کون سی گنتی مانی گئی ہے - حال میں مغربی ایشیا کے بغزک وائی نامی مقام پر متّنی کتبے ملے ہیں جو ۱۴۰۰ برس قبل مسیح کے ہیں اور جن میں ویدک دیوتاؤں کا حوالہ ہے - ان سے ویدک تہذیب کی قدامت تو ثابت ہوتی ہے لیکن رگ وید کے زمانۂ تصنیف پر کوئی روشنی نہیں پڑتی ' اب تک عالموں کی بحث جاری ہے ' حال ہی میں ونٹرنز نے اس نظریہ کی تائید کی ہے کہ رگ وید ۲۵۰۰ برس قبل مسیح میں تصنیف کیا گیا تھا ' اس لئے رگ وید ۱۲۰۰ ق - م یا یوں کہئے کہ ۲۰۰۰ ق - م میں ضرور موجود تھا ' اور ممکن ہے کہ اس سے بھی بہت پہلے تصنیف کیا گیا ہو ' سب سے پرانے منتر شاید بہت ہی قدیم ہیں [۱] -

آریہ

رگ وید کی تہذیب تو منتروں کے زمانۂ تصنیف سے بھی قدیم ہے ' وہ بہت اونچے درجے کی تہذیب ہے ' اس کے ارتقا میں سیکڑوں برس لگے ہوں گے ' رگ وید کی زبان بھی بہت ترقی کرچکی ہے اور بہت پیچیدہ ہوچکی ہے ' اس کی ترقی میں بھی سیکڑوں برس لگے ہوں گے - یہ ساری تہذیب جس قوم میں شروع ہوئی اور اتنی بڑھی اسے رگ وید نے خود آریہ بتلایا ہے ' رگ وید

[۱]—رگ وید کے زمانۂ تصنیف کے لئے دیکھئے :—میکس مولر ' رگ وید سنگھتا کے دیباچے ' میکڈانلڈ ' ہسٹری آف سنسکرت لٹریچر' صفحہ ۴۸—۵۰ ' کیمبرج ' کیمبرج ہسٹری آف انڈیا ۳ ' صفحہ ۱۱۳—۱۰۹ جیکوبی ' انڈین انٹی کویری ۲۳ ' صفحہ ۱۵۴ وغیرہ ' تیبو' انڈین انٹی کویری ۲۴ ' صفحہ ۲۹۱ و ۸۵ بال گنگا دھر تلک ' اریَن—ونٹرنز - کلکتہ یونیورسٹی ریڈر شپ لکچرس صفحہ ۱ وغیرہ -

ہی میں اس بات کے کئی ثبوت ملتے ہیں کہ یہ آریہ لوگ کہیں باہر سے ہندوستان میں آئے تھے ، رگوید میں دریائے جمنا تک ملنے والے قدرتی مناظر ، حیوانات اور نباتات کا حوالہ ملتا ہے ، آگے کی ادبیات میں مشرقی حصہ ملک کی مختلف باتیں بھی ملتی ہیں ، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آریہ مغرب سے آکر پہلے پنجاب میں آباد ہوئے اور پھر آگے کیطرف بڑھے ، سارے رگ وید میں غیر آریوں کے ساتھ لڑائی کی کشمکش موجود ہے ، اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ باہر سے آنے والے آریوں کو قدیم باشندوں سے بہت لڑنا پڑا ، اس میں تو کوئی شک نہیں معلوم ہوتا کہ آریہ لوگ کسی زمانے میں مغربی دروں میں سے ہوکر ہندوستان میں داخل ہوئے تھے ، لیکن یہ پتہ لگانا بہت مشکل ہے کہ یہ پہلے کہاں رہتے تھے اور دوسری قوموں سے اُن کے کیا تعلقات تھے - سنسکرت ، پشتو ، فارسی وغیرہ ایشائی زبانوں میں اور گریک ، لیٹن ، جرمن ، انگریزی ، فرنچ اور روسی وغیرہ زبانوں میں بہت سی یکسانیت ہے ، پتا ، ماتا ، بھائی وغیرہ وغیرہ کے ظاہر کرنے والے بہت سے الفاظ اور بہت سے افعال صاف طور سے ایک ہی مادہ سے مشتق ہیں ، اس لئے انیسویں صدی میں اہل علم کو خیال ہوا تھا کہ یہ سب زبانیں ایک ہی قدیم زبان کی مختلف صورتیں ہیں - اور ان سب زبانوں کے بولنے والوں کے آبا و اجداد اس قدیم زبان کے بولنے والے ایک ہی جماعت کے افراد تھے - یہ قدیم آریہ جماعت تھی اور یہ لوگ بہت قدیم زمانے میں ایک ہی مقام پر رہتے تھے یہاں تک تو اہل علم متفق تھے - اس خیال کو میکس مولر وغیرہ نے اپنی تصانیف اور لکچروں کے ذریعہ ایسا پھیلایا کہ اس کی حیثیت مسلمات میں سے ہوگئی - ہندوستان ، افغانستان ، فارس اور یورپ کے زیادہ تر باشندے ایک ہی آریہ جماعت کی اولاد مان لئے گئے ، قدیم مقام کے بارے میں علماء کے مختلف

خیالات تھے - بہتوں کی رائے تھی کہ یہ مقام وسط ایشیا تھا جو اس قدیم زمانے میں سر سبز و زرخیز خطہ تھا ، لیکن آھستہ آھستہ وہ خشک ھونے لگا اُس وقت آریہ لوگ اُسے چھوڑ کر مغرب ، جنوب ، اور پھر یورپ کے ممالک میں جا بسے ، لیکن کچھ عالموں کی رائے تھی کہ قدیم مقام ، مشرقی روس میں تھا - کچھ اور رایوں کے مطابق یہ مقام فن لینڈ میں تھا ، جہاں اب بھی سنسکرت سے بہت ملتی جلتی ایک زبان بولی جاتی ھے ، یا یہ پرانا گھر وسط یورپ میں ، موجودہ بوھیمیہ (چیکو سلو وا کیا) میں تھا ، جہاں کے درخت اور جانور وغیرہ ایسے معلوم ھوتے ھیں جیسے پرانی رچاؤں میں مذکور ھیں - بال گنگا دھر تلک کی رائے تھی کہ یہ مقام کہیں قطب شمالی کے قریب تھا ، یہ بحث ابھی طے نہیں ھوئی تھی کہ دوسرے اطراف سے تمام آریہ تصورات پر مخالفت شروع ھوگئی ، قومیت کے مسائل پر غور کرنے والے کچھ عالموں نے اس بات پر زور دیا کہ زبان کی یکسانیت سے قوم کی یکسانیت نہیں ثابت ھوتی ، لیکن پرانی ھڈیوں اور کھوپڑیوں کی ناپ سے ظاھر ھوتا ھے کہ آریہ زبان بولنے والوں کے آبا و اجداد ایک قوم سے نہیں ھوسکتے ، وہ مختلف قوموں پر مشتمل ھوں گے - زبان ، مذھب اور تہذیب کی یکسانیت سے صرف اتنا ھی ثابت ھوسکتا ھے کہ یہ لوگ کسی زمانے میں ایک ترقی کرنے والی جماعت کے زیر اثر تھے یا ایک دوسرے کی نقل کرتے تھے - اس لئے اب پرانے آریہ تصورات نہیں تسلیم کئے جاتے ، یا یوں کہئے کہ اس ترمیم شدہ صورت میں مانے جاتے ھیں - موجودہ اعتقادات سے ھندوستان کی تاریخ کے بارے میں ایک نتیجہ یہ نکلتا ھے کہ شمالی ھندوستان میں بھی جو لوگ باھر سے آئے وہ آریوں کی اولاد نہیں مانے جا سکتے - بہت سے آریہ ھندوستان آئے تھے لیکن وہ اپنے [illegible]

کہ پرانے باشندوں کو نیست و نابود کر دیں ، ان کی مضبوط تہذیب نے کچھ صدیوں میں سارے ملک پر قبضہ جما لیا لیکن سارے ملک کو آباد کرنا ان کے لئے ناممکن تھا ۔

پنجاب میں آریہ

یہ تو صاف ظاہر ہے کہ آریہ لوگ ہندوستان میں شمال مغرب کے دروں سے آئے تھے لیکن ہزمل وغیرہ کچھ عالموں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ کچھ آریہ کشمیر کے راستوں سے آئے اور ہمالیہ کے دامن میں چلتے ہوئے گنگا جمنا کے میدانوں میں آ بسے ، اس خیال کی تائید لسانیات کے مشہور و معروف عالم ، ہو گریرسن نے مختلف ملکوں کی مروجہ زبانوں کے مقابلے کی بنیاد پر کی ہے ، لیکن ابھی تک اس خیال کو مضبوط کرنے کے لئے کوئی ناقابل تنقع ثبوت نہیں ملا ہے ، جب تک یہ رائے اور مضبوط نہ ہوجائے اس وقت تک ہمیں اسی خیال کے مطابق تاریخ لکھنا پڑے گی یعنی یہ کہ آریہ لوگ شمال مغرب سے آئے تھے ، گمان غالب یہ ہے کہ سب آریہ ایک ساتھ نہ آئے ہوں گے ، جیسا کہ عموماً انسانی گروہ کا خاصّہ ہے ، وہ چھوٹی بڑی تعداد کے جھنڈوں میں آئے ہوں گے ، رگ وید کے زمانے میں وہ سارے پنجاب میں تو پھیل ہی گئے تھے لیکن گنگا اور جمنا کے کناروں میں بھی پہونچ گئے تھے ، منتروں میں پانچوں ندیوں کا بار بار حوالہ دیا گیا ہے - تیستا یعنی جہیلم ، اسکنی یعنی چناب ، پروشنی یعنی راوی ، بپاش یعنی بیاس اور شتودری یعنی ستلج - جمنا کا ذکر تین بار اور گنگا کا ایک بار ملتا ہے ، گنگا کے پورب کی ندیوں کا اشارہ رگ وید میں کہیں نہیں ہے ، اناجوں میں چاول کا ذکر نہیں ہے ، کیونکہ وہ پورب کی طرف پیدا ہوتا ہے - جانوروں میں چیتے کا اشارہ نہیں ہے کیونکہ وہ بھی پورب کی طرف رہتا ہے - ان باتوں سے رگ وید

نے آریوں کے رہنے اور چلنے پھرنے کے جغرافیائی حدود اچھی طرح ظاہر ہوتے ہیں -

بدقسمتی سے رچاؤں میں ایسا تاریخی مواد نہیں ہے کہ اُس زمانے کی زندگی کی پوری تصویر کھینچی جاسکے ' تاہم کچھ موٹی موٹی باتوں کا پتہ لگ سکتا ہے -

آریوں کی عام زندگی

زندگی بسر کرنے کے دو طریقے تھے - ایک تو مویشی کا پالنا دوسرے کھیتی ' بھیڑ بکری بہت تھیں جو کھانے کے کام آتی تھیں - اسباب لادنے کے لئے گدھے بھی پالے جاتے تھے - سفر کے لئے ' دوڑ دھوپ اور لڑائی کے لئے گھوڑے بھی بہت تھے - بڑے آدمیوں کے پاس سواری کے لئے رتھ ہوتے تھے جنھیں گھوڑے کھینچتے تھے - رکھوالی اور شکار کے لئے کتے پالے جاتے تھے ' شکار کے ذریعہ تفریح و ورزش کے علاوہ خورش کا سامان بھی ملا کرتا تھا ' سب سے مفید جانور گاے اور بیل تھے ' گاے سے دودھ اور دودھ سے گھی اور مکھن وغیرہ بھی بنتا تھا - جن کا استعمال خوراک میں کثرت سے کیا جاتا تھا ' بیل ہل چلاتے تھے اور گاڑی بھی کھینچتے تھے ' یہ کبھی کبھی کھانے کے بھی کام میں آتے تھے ' کھیتی کے ذریعہ بہت سے اناج ' ترکاری اور پھل پیدا کئے جاتے تھے - آبپاشی کے لئے تالاب اور کلیا (یعنی ایک طرح کی نہریں) تھیں - مگر کبھی کبھی ایسی خشک سالی ہوتی تھی کہ غریب آدمیوں کے جینے کے لالے پڑ جاتے [۱] رہنے کے لئے جو مکانات تھے اُن کی تعمیر میں لکڑی کا

---

[۱]—رگ وید ۱ — ۱۲۶ — ۴۳ — — ۱ — ۱۰ — ۳ — — ۱ — ۶۰ — ۴ — — ۸ — ۵۵ — ۳ — — ۱ — ۱۸۳ — ۳ — — ۷ — ۱۸ — ۲۳ — — ۳ — ۴۵ — ۳ — — ۷ — ۴۹ — ۲ — — ۳ — ۵۳ — ۱۵ — — ۸ — ۸ — ۱۱ — — ۸ — ۵۵ — ۱۴ — عام زندگی کا اشارہ ہر ایک منڈل کے بہت سے منتروں میں ہے -

استعمال بہت کیا جاتا تھا - مکانوں میں جو احاطے ہوتے تھے ' وہ بھی لکڑی کے بنتے تھے ' مکانوں میں بہت سے کمرے ہوتے تھے اور آنگن بھی ہوتے تھے [۱] زیور پہننے کا رواج ' بہت تھا - امیر آدمی سونے اور جواہر کے طرح طرح کے زیور پہنتے تھے ' [۲] آریوں کا یہہ گروہ قریب ہی کے نہیں بلکہ دور دور کے ملکوں سے بھی تجارت کرتے تھے [۳] -

مرد

عام زندگی کی اور بہت سی باتوں کا ذکر آگے کیا جائیگا ' یہاں صرف یہہ بتانے کی ضرورت ہے کہ عام زندگی کی کل باتیں آریہ جماعت میں ایک سی تھیں اور اس کے بعد کی تاریخ میں بھی ایک ہی طرح قائم رہیں - آریہ لوگ اس زمانے میں مختلف جنوں (گروہوں) میں تقسیم تھے ؛ ہر ایک جن ایک مستقل سیاسی گروہ معلوم ہوتا ہے ' پانچ جن خصوصیت کے ساتھہ طاقتور اور اہم تھے ' پورو ' تروشش ' یدو ' آنو اور دروہو - ان کا تذکرہ بہت سی رچاؤں میں آیا ہے ان کے علاوہ بھرت گندھار ' اوشینریس وغیرہ بھی تھے -

جماعت

مختلف مقاموں میں رہنے کے باوجود ' آریہ لوگوں کی مذہبی' جماعتی اور سیاسی مجلس اور اُن کے رسم و رواج ایک طرح کے تھے - رگ وید کے زمانے تک ورن کے امتیازات قائم نہیں ہوئے تھے - کھانے پینے اور شادی بیاہ کے معاملے میں پچھلے زمانے

---

[۱] —رگ وید — ۷ — ۹۹ — ۳ — — ۱ — ۵۹ — ۱ — — ۱ — ۵۹ — ۶ — — ۷ — ۵۵ — ۸ — —

[۲] —رگ وید ۱ — ۳۷ — ۲ — — ۱ — ۱۰۶ — ۲ — — ۵ — ۵۴ — ۱۱ — —

[۳] — رگ وید ۱ — ۴۸ — ۳ — — ۱ — ۵۶ — ۲ — — ۱ — ۱۱۶ — ۵ — —

کیطرح روک ٹوک نہیں ہوئی تھی لیکن کمی وجوہ سے لوگوں میں مختلف جماعت اور درجے قائم ہورہے تھے ' اور مستقبل کے جماعتی نظام کا تخم بارآور ہو رہا تھا اس عظیم انقلاب کے اسباب سیاسی ' قومی ' اقتصادی اور مذہبی تھے - ان اسباب پر اور اس سلسلۂ تغیر پر رچائیں کچھہ روشنی ڈالتی ہیں - آریہ نظام پر سب سے زیادہ اثر آریہ اور غیر آریہ کے جنگ اور باہمی تعلقات کا پڑا ۔

غیر آریہ

رگ وید (جو آریوں کی کتاب ہے) غیر آریوں کی برائی سے بھرا ہوا ہے ' اگر اتفاق سے غیر آریوں کی کوئی تصنیف ہمارے پاس ہوتی توشاید آریوں کے بارے میں بھی ویسی ہی بری باتیں لکھی ہوئی ملتیں - کچھہ بھی ہو آریوں کی ان فضول باتوں سے ہم یہہ نتیجہ نہیں نکال سکتے کہ ہندوستان کے پرانے غیر آریہ باشندے جنگلی تھے ' سچ تو یہہ ہے کہ خود رچاؤں میں ایسے ایسے اشارے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ غیر آریوں کی تہذیب اونچے درجہ کی تھی - غیر آریوں کے گروہ تھے ' مثلاً داس ' کرات ' کیکتہہ شاندوں - دسیو بھی شاید اُسی گروہ کا دوسرا نام ہے جو اکثر داس کہلاتا تھا ' لیکن یہہ بھی ممکن ہے کہ اُن کا ایک علحدہ گروہ رہا ہو ' داسوں کے ساتھہ ساتھہ پلنتریوں کا تذکرہ بھی کئی بار آیا ہے ' شاید ان دونوں جماعتوں کا قریبی تعلق رہا ہو - رگ وید میں تو نہیں لیکن اُس کے بعد کے ادب میں چانڈالوں کا ذکر بھی بار بار آیا ہے - شاید آریوں کو یہہ غیر آریہ لوگ ' گنگا کے کہیں پورب میں رگ وید کے زمانے کے بعد ملے ' شودر کا لفظ سب سے پہلے رگ وید کے دسویں منڈل کے پرش سوکت میں آیا ہے ' در اصل یہہ بھی سنسکرت کا لفظ نہیں معلوم ہوتا ' شاید یہہ ایک ایسے بڑے غیر آریہ گروہ کا نام

تھا کہ آگے چلکر یہہ ایک دوسرے ورن کا مفہوم [۱] بن گیا ' ان مختلف غیر آریہ جماعتوں کی تہذیب شاید کچھہ الگ الگ رهي هو ليكن مواد کی کمی کے باعث اسکي پوری تصریح نہیں کی جا سکتي - مگر عموماً انکے رہنے سہنے کے بارے میں کچھہ رچاؤں سے پتہ لگ سکتا ھے - رہنے کے لئے وہ مکان بناتے تھے جنکو کبھی کبھي موقع پاکر آریوں نے جلا دیا [۲] کم سے کم داسوں اور دسیوں کے اپنے اپنے شہر تھے جنکو نیست و نابود کرنے کي استدعا آریوں نے بار بار اندر سے کي ھے [۳] حفاظت اور جنگ کے لئے اُن کے پاس فوجیں بھي تھیں اور قلعے بھي ' قلعوں میں وہ اپنا اپنا خزانہ رکھتے تھے [۴] بہت سے غیر آریہ یا کم سے کم اُن کے سردار بڑے امیر تھے ' یہہ اُن منتروں سے ظاهر هوتا هے جن میں آریوں نے اندر سے درخواست کي ھے کہ غیر آریوں کو مار کر ان کا جمع کیا هوا مال همیں دیدو [۵] غیر آریوں کی اپنی زبانیں تھیں جو غیر آریوں کو عجیب سی معلوم هوتی تھیں [۶] آریوں نے ان کو " اریہ برت " وغیرہ کہا هے جس سے ظاهر هوتا هے کہ ان کے دھرم ' دیوتا ' اور قوانین الگ الگ تھے [۷] -

---

[۱]—رگ وید کے عام منتروں کے علاوہ خصوصیت کے ساتھہ دیکھئے ' رگ وید ۳ — ۵۳ — ۱۴ — — ۷ — ۱۸ — ۵ — — اتھر وید ' ۱۰ — ۴ — ۱۴ — — باج سنیئي سنگہتا ۳۰ — ۶ — — میر ئت ۶ — ۳۲ — ۷ — ۲۳ — —

[۲]—رگ وید ۷ — ۵ — ۶ — —

[۳]—رگ وید ۱ — ۱۰۳ — ۳ — — ۱ — ۱۱۷ — ۲۱ — — ۲ — ۲۰ — ۶ — ۷ — — وغیرہ -

[۴]—رگ وید ۳ — ۳۰ — ۱۳ — — ۲ — ۲۰ — ۶ — ۷ — —

[۵]—رگ وید ۱ — ۱۷۶ — ۳ — ۴ — — ۸ — ۴۰ — ۶ ' ۱۰ — —

[۶]—رگ وید ۷ — ۶ — ۳ — —

[۷]—رگ وید ۸ — ۷۰ — ۱۱ — — ۴ — ۱۶ — ۹ — ۱۰ — — ۷ — ۶ — ۳ — — ۱ — ۱۷۵ — ۳ — — ۹ — ۴۱ — ۲ — —

ان رچاؤں سے صاف ظاہر ہے کہ زبان ' رسم و رواج اور مذہبی معاملات

آریوں اور غیر آریوں میں اختلاف

کے اعتبار سے آریوں اور غیر آریوں میں بڑا فرق تھا ' اس کے علاوہ ان کے جسموں کی ساخت اور رنگ میں بھی اختلاف معلوم ہوتا ہے ' کہیں کہیں اُنہیں " اناس " یعنی بغیر ناک والا کہا گیا ہے ' جس سے ظاہر ہے کہ کم سے کم کچھ غیر آریہ جماعت والوں کی ناک آریہ جماعت کے لوگوں کی ناک سے چھوٹی ہوتی تھی ' اس سے زیادہ نمایاں فرق رنگ کا تھا ' آریوں کے مقابلے میں غیر آریوں کا رنگ بہت کالا تھا ' سنسکرت میں رنگ کو ورن کہتے ہیں ' ورن کی وجہ سے " ورن ووستا " کا نام پڑا اور اس کا آغاز ہوا [1] آج کل کی طرح قدیم زمانے میں بھی ' گورے رنگ والوں کو کالے رنگ والوں سے کچھ نفرت تھی -

اس زمانے میں غیر آریوں کو اپنی زمین اور دولت ' اپنی تہذیب

آریوں اور غیر آریوں کے تعلقات

اور اپنے قیام ہستی کے لئے آریوں سے گھمسان لڑائیاں لڑنا پڑیں ' اُس خوفناک لڑائی کا زور شور آج بھی رگ وید کے ہر ایک منڈل سے نمایاں ہے ' حملہ کرنے والوں کا مقابلہ غیر آریوں نے قدم قدم پر بڑی بہادری سے کیا ' رگ وید کے پڑھنے سے کبھی کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آریوں کے دانت کھٹے ہو رہے ہیں اور وہ اپنے دیوتاؤں کی پناہ لے رہے ہیں ' لیکن آخر میں غیر آریوں نے شکست پائی ' شاید فوجی نظام ' حربی قوتوں اور عقل و ہمت میں وہ آریوں سے گھٹ کر تھے ' شاید اُن سب نے مل کر دشمن کا مقابلہ نہیں کیا ' ان کے کل

---

[1]—رگ وید ۲ — ۲۰ — ۶ — ۷ میں اندر کالے داسوں کی فوجوں کو نیست و نابود کرتا ہے - رگ وید ۹ — ۴۱ — ۱ میں کالے چمڑے کو دور بھگانے کی بات ہے -

گروہوں کو ایک ایک کرکے آریوں نے ہرا دیا ، شاید آریہ تہذیب غیر آریہ تہذیب سے اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ اُس کی فتح لازمی تھی - کبھی کبھی آریوں اور غیر آریوں میں اتحاد بھی ہوجاتا تھا - رگ وید میں بل بوتھم نامی ایک شخص ہے جو داس معلوم ہوتا ہے ، لیکن اس کی فیاضی اور آزاد خیالی کی تعریف میں رشی نے نغمہ سرائی کی ہے ، کبھی کبھی آریہ لوگ خود آپس میں لڑتے تھے ، داش راگیہ کی لڑائی میں مختلف راجاؤں نے مل کر سوداس پر حملہ کیا ، لیکن سوداس نے ان کے چھکے چھوڑا دئے ، اس سخت باہمی جنگ میں ، آریوں نے غیر آریوں سے بھی کچھ مدد لی ، لیکن یہ صلح دائمی نہیں ہو سکتی تھی ، آخر میں آریوں نے کل غیر آریوں کا اقتدار چھین لیا ، شکست پر کچھ غیر آریہ مار ڈالے گئے ، کچھ بھاگ کر وسط ہند کی پہاڑیوں اور گھاٹیوں میں جابسے جہاں ان کی نسل کے لوگ آج تک پائے جاتے ہیں - بقیہ غیر آریوں نے آریوں کی حکومت تسلیم کرلی ، بہت سے غلام بنا لئے گئے ، داس گروہ کے اتنے غیر آریہ ، غلام بنائے گئے کہ داس لفظ کا مطلب ہی غلام ہوگیا اور اب تک ہے - [۱] لیکن شاید غیر آریوں کی تعداد اتنی تھی کہ سب غلام نہیں بنائے جاسکتے تھے ؛ بہت سے غلام ہوکر کھیتی باری ، نوکری یا نیچے درجے کے کام کرنے لگے شکست کے بعد آریوں اور غیر آریوں کی لڑائی کا کوئی سوال نہ تھا ، دونوں طبقے امن و صلح کے ساتھ رہنے لگے ، لیکن غیر آریوں کا درجہ بہت نیچا تھا ، ایک تو وہ عام تہذیب میں آریوں سے گھٹ کر تھے ، دوسرے اُن کا رنگ کالا تھا ، تیسرے شکست کے کلنگ کا ٹیکا ان کے

---

[۱]—رگ وید ۷ — ۸۶ — ۷ — — ۸ — ۵۶ — ۳ — — ۱۰ — ۶۲ — ۱۰ وغیرہ میں لفظ " داس " کے معنی " غلام " نہیں - غلام کے لفظ کے لئے انگریزی میں سلیو (Slave) ہے ، وہ بڑی سلاو قوم کے نام سے نکلا ہے - جس کے بہت سے اشخاص دوسروں سے شکست پاکر غلام بنائے گئے تھے -

ماتھے پر تھا ' چوتھے زمین و دولت چھن جانے سے وہ غریب ہوگئے تھے اس حالت میں جہاں کہیں ایسے دو طبقے ساتھ ساتھ رہتے ہیں وہاں کچھ سوالات پیدا ہو ہی جاتے ہیں ' دو تہذیبوں کا تعلق ہوا نہیں کہ ایک کا اثر دوسرے پر پڑنے لگا - قدرتاً یہ اثر محکوم پر زیادہ پڑا کرتا ہے ' لیکن حکمرانوں کا طبقہ بھی اُس سے بالکل بری نہیں ہو سکتا - غیر آریوں نے آریوں کے دھرم ' دیوی ' دیوتا ' زبان اور رسم و رواج بہت کچھ اپنا لئے لیکن آریوں نے غیر آریوں کی کچھ باتیں دانستہ یا نادانستہ ضرور ہی اختیار کرلی ہونگی ' ایسے موقع پر حکمرانوں کو فکر دامنگیر ہوتی ہے کہ کہیں ہماری تہذیب نیست و نابود نہ ہو جائے اُس وقت وہ اپنے سے نیچے محکوم طبقے کو اپنے سے دور رکھنے کی خواہش کرتے ہیں ' اس عام اثر سے کہیں زیادہ خطر ناک مسائل ایک طبقے کے دوسرے سے ملنے پر پیدا ہوتے ہیں - جہاں دو طبقوں کے مرد اور عورت پاس پاس رہتے ہیں وہاں شادی بیاہ کے یا ناجائز تعلقات ہو ہی جاتے ہیں لیکن یہ خلط ملط حکمران طبقے کے اکثر لوگوں کو بہت برا معلوم ہوتا ہے ' اگر محکوم طبقے کا آدمی ' غریب اور کالا ہو تو بہت افسوس ہوتا ہے اور اندیشہ ہوتا ہے کہ ہماری تہذیب ' ہماری نسل ' ہمارے ذہن کی طاقت ' سیرت کی خصوصی قوت بلکہ ہماری اصلی زندگی ان کے خلط ملط سے مٹی میں نہ مل جائے - آج تک کالے اور گوروں کے متعلق یہی حالت جنوبی افریقہ اور ممالک متحدہ امریکہ کے جنوبی ریاستوں میں موجود ہے - وہاں اگر کوئی لڑکی کالے آدمی سے بیاہ کرے یا دوستی بھی کرے تو گوری قوم کے لوگ مشتعل ہوکر دونوں کا کام تمام کر دیں - کسی کالے آدمی پر اگر گوری عورت پر نظر ڈالنے کا جھوٹا یا سچا جرم لگایا جائے تو امریکہ میں اُسے زندہ جلا دیتے ہیں یا اور کسی طرح

بیرحمی کے ساتھ مار ڈالا جاتا ھے ' کوئی گورا آدمی کالی عورت سے شادی نہیں کرنے پاتا - اگرچہ جنوبی افریقہ اور امریکہ دونوں ملکوں میں گورے آدمی کالی عورتوں سے اکثر ناجائز تعلقات رکھتے ھیں - دونوں ملکوں میں کالے آدمی سیاسی زندگی سے دور رکھے جاتے ھیں ' تعلیم ' دولت اور شان و شوکت کے موقعے اُنہیں بہت کم دئے جاتے ھیں ؛ کہنے کا یہ مطلب نہیں ھے کہ قدیم ھندوستان میں ٹھیک یہی حالت تھی - تہذیب و قومیت کے یہ مسائل ان حالات کے ماتحت ھر جگہ مختلف صورتوں میں نمایاں ھوتے رھتے ھیں ' لیکن اس بات پر زور دینا ضروری ھے کہ غیر آریوں کی شکست کے بعد ان کے اور آریوں کے پاس پاس رھنے سے ' تہذیب اور زندگی کی باھمی مخالطت سے عجیب عجیب سوالات پیدا ھوئے - اپنی تہذیب اپنی قومیت اور اپنے خون کے تحفظ کے خیال سے ' اپنے اقتدار کے پندار سے اور غیر آریوں سے نفرت کے باعث آریوں نے غیر آریوں سے تعلقات کو روکنے کی خواھش کی ' رگ وید میں تو باھمی شادی بیاہ کے بارے میں کوئی قاعدہ نہیں ملتا ؛ لیکن آگے چل کر دھرم سوتروں میں یہ قاعدہ ملتا ھے کہ کوئی برھمن اپنی لڑکی شودر کے ساتھ نہ بیاھے ' لیکن کچھ حالتوں میں برھمن شودر کی لڑکی سے بیاہ کر سکتا ھے - ممکن ھے کہ رگ وید کے زمانے میں ایسا کوئی قانون نہ رھا ھو لیکن باھمی تعلقات کو روکنے کے لئے کچھ نہ کچھ کوشش ضرور ھی ھوئی ھوگی ' یہاں دو طاقتوں کا مقابلہ تھا ' ایک تو وہ عام انسانی طاقت جو تعلقات کے لئے مجبور کر رھی تھی ' دوسری طرف آریوں کی خود داری یا یہ کہئے کہ غرور کے باعث ترک تعلقات کی طاقت کار فرما تھی جو آریہ جماعت کو بالکل پاک و صاف رکھنے کی خواھش کر رھی تھی ' پہلی طاقت نے بہت کچھ باھمی تعلقات پیدا کرا ھی دئے ' اور آریوں اور غیر آریوں کا خون کچھ مل ھی

گیا ' لیکن آخیر میں اس طاقت کا زور کم ھی کر دیا گیا - غیر آریوں سے شادی بیاہ کرنے کے کچھ سخت قاعدے بنائے گئے ' اور باھمی تعلقات کي بندش کر دی گئی ' اس طرح ذات پات کی رسم شروع ھوئی - ابتدا میں اگر سچ پوچھئے تو دو ھي طبقے تھے ' گورے اور کالے - یعنی ایک وہ جماعت جو بہت کچھ آریہ تھی اور دوسری وہ جماعت جو بہت کچھ غیر آریہ تھی - آگے چل کر پہلا طبقہ برھمن کہلایا اور دوسرا شودر ' یہ نام رگ وید کے پہلے نو منڈلوں میں نہیں آئے ھیں ' شاید اُس وقت تک یہ رسم پوري طرح قائم نہیں ھو سکی تھی -

آریہ جماعت

لیکن آریہ اور غیر آریہ کے اس بڑے قومی اختلاف کے علاوہ خود آریوں میں بھی کچھ اختلافات پیدا ھو چلے تھے - یہ سچ ھے کہ اس وقت کل آریوں میں ' ضروري گوتر چھوڑ کر شادی بیاہ کے تعلقات ھو سکتے تھے - کھانے پینے کے معاملے میں تو کسی طرح کی روک ٹوک تھی ھی نہیں ' کام کاج یعنی پیشوں کے لئے پوری آزادی تھی - مثلاً ایک رشی کہتا ھے کہ میرا باپ وید ھے ' اور میری ماں پسنہاری ھے ' میں شاعری کرتا ھوں لیکن ھر طبقے میں غیر مساوات کے باعث اور مذھبی ' فوجی یا اقتصادي ضرورتوں کے باعث جماعتیں بن جاتی ھیں ' مگر جذبات و خیالات اور حالات کے اختلاف کے باعث یا مختلف پیشوں کي وجہہ سے بھی لوگ اپنی ایک علحدہ جماعت بنا لیتے ھیں ' جہاں کہیں پیشے یا ذھن کا اختلاف ھوتا ھے وھاں مختلف جماعتوں کا بن جانا بالکل قدرتی ھے - جیسے جیسے سوشل نظام پیچیدہ ھوتا جاتا ھے ویسے ھی درجے بڑھتے جاتے ھیں اور ان کے باھمی تعلقات بھی پیچیدہ ھوتے جاتے ھیں - رگ وید کے زمانے میں سوشل نظام اتنا پیچیدہ نہیں ھوا تھا جتنا ھزار پانچ سو برس کے بعد

ھو گیا ' تاھم اتنے اختلافات ضرور ھوگئے تھے کہ متعدد طبقے پیدا ھو جائیں -

پہلا طبقہ تو مذھبی کریا کانڈ والوں کا تھا جو برھمن کہلائے ' رگ وید کے آریوں کو عاقبت کی اتنی پروا نہیں تھی جتنی کہ ان کی نسلوں کو چار پانچ سو برس کے بعد پیدا

دھرم

ھو گئی ' رگ وید کے پہلے نو منڈلوں میں تناسخ کا کوئی اشارہ نہیں ' اعمال کے اصول بھی کہیں نہیں ھیں ' اُس زمانہ میں آریوں کی نظر زیادہ تر اسی موجودہ زندگی پر تھی ' یہیں وہ آنند حاصل کرنا چاھتے تھے - زندگی کا جوش و خروش جیسا اُس دور میں تھا ویسا کسی آیندہ زمانے میں نہیں ملتا ' اس معاملے میں ویدک آریہ مابعد کے ھندؤں کے بہ نسبت قدیم رومن اور یونانیوں سے زیادہ ملتے جلتے ھیں ' تاھم آریہ لوگ بہت سے دیوتاؤں پر اعتقاد رکھتے تھے ' اُن سے اس زندگی کے آرام کی دعائیں مانگتے تھے ' ان کی پوجا کے لئے منتر بناتے اور گاتے تھے ' یگیہ کرتے تھے اور بل چڑھاتے تھے - آپس میں سوم رس تقسیم کرتے تھے - رگ وید کے دیوتا زیادہ تر پرکرت (مناظر) کے دیوتا ھیں ' یعنی دوسرے قدیم ملکوں کی طرح یہاں بھی مناظر قدرت کے موثرات اور ان کی طاقتوں کو دیوتا مان لیا گیا تھا - دیو یعنی آکاش (خلا) ایک دیوتا ھے اور اس کے مقابلے میں پرتھوی (زمین) ھے ' دیو کے ساتھ ساتھ یا یوں کہئے کے بہت کچھ اس کی جگہ پر ورن دیوتا ھے جس کا شمار بڑے بڑے دیوتاؤں میں ھے - بہت سے منتروں میں اس کی تعریف کی گئی ھے ' ایک اور بڑا دیوتا ھے اندر ' جو میگھ اور طوفان کا دیوتا ھے ' جو پانی برساتا ھے ' جو لڑائی میں آریوں کی مدد کرتا ھے اور غیر آریوں کو تباہ کرتا ھے - سوتر ' متر ' پوکھن اور بشن ' سورج سے تعلق رکھنے والے دیوتا ھیں ' اور سورج خود ایک

دیوتا ہے - شیو اور مُرت طوفان کے ' رودر ' بایو ' اور بات ہوا اور پرجلیہ پانی کے دیوتا ہیں ' اوشا ' صبح کی خوبصورت دیوی ہے ' اگن اور سوم بھی بڑے دیوتاؤں میں ہیں ' اُن کے علاوہ اور بھی بہت سے دیوتا ہیں ' اور ریبھو ' اپسرا ' گندھرو وغیرہ غیر دنیاوی ہستیاں ہیں - یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ آگے چل کر ان دیوتاؤں کی صورت بدل گئی ' یعنی انہیں ناموں سے دوسرے دیوتا پکارے جانے لگے ' اور باتوں کی طرح مذہبی اعتقادات بھی مائل بہ تغیر ہوتے ہیں - ہمیشہ ایک طرح نہیں رہتے ' پرانے نام رہ بھی جائیں تو ان کا مفہوم بدل جاتا ہے - رگ وید میں آدمی اور دیوتاؤں کا جیسا تعلق ہے ویسا مابعد کے ہندو لٹریچر میں نہیں ہے - یہاں دیوتا ' انسانی زندگی سے الگ نہیں ہے - آریوں کا اعتقاد ہے کہ دعا کرتے وقت فوراً وہ مدد کرتے ہیں ' دشمنوں کو تباہ کرتے ہیں ' وہ آدمیوں سے محبت کرتے ہیں اور محبت چاہتے ہیں - ہندؤں میں بھگتوں کی جماعت کا سر چشمہ رگ وید ہے ' یہاں کچھ منتروں میں آدمی اور دیوتا کے مابین شدید محبت تسلیم کرلی گئی ہے - دیوتاؤں کو خوش رکھنے کی بڑی ضرورت ہے ' ان کی عنایت ہو تو پانی خوب برسے گا ' دولت اور اناج میں ترقی ہوگی ' جانور تندرست رہیں گے ' گھر ' گاؤں شہر اور سلطنت میں خوش حالی رہے گی ' زندگی سکھ سے بسر ہوگی ' سب کا فرض تھا کہ دیوتاؤں کی بھگتی میں منتروں کا ورد رکھیں اور گھی ' اناج ' دودھ ' گوشت اور سوم کے ذریعہ یگیہ کرکے اُنکے لئے بل دیں -

یگیہ

معمولی پوجا پاٹ تو سب کر سکتے تھے ' لیکن سماج کو کچھ ایسے لوگوں کی بھی ضرورت تھی جو اپنا سارا وقت یا کم از کم زیادہ وقت مذہبی کاموں میں صرف کر سکیں ' نئے منتروں کی تصنیف ضروری تھی جو خاص حالتوں ہی کے

ذریعہ ہو سکتی تھی ' نئے پرانے منتروں کا مطلب سب کو سمجھانے کے لئے بھی ایسے آدمیوں کی ضرورت تھی جو اور کاموں سے بری ہوں ' آہستہ آہستہ یگوں کے قاعدے بڑھنے لگے ' بہت بڑے پیمانے پر یگیہ ہونے لگے جن کے لئے بہت سے آدمیوں کو بہت زمانے تک طیاری اور مصروفیت کی ضرورت پڑتی تھی ' صرف سوم یگیہ ہی کے لئے کئی کئی پروہتوں کی ضرورت تھی - مثلاً ایک ہوتر

برہمن

چاہئے تھا ' جو منتر سنائے ' ایک ادھ وری چاہئے تھا جو کریا کانڈ کرے اور برائیوں کو دور کرے ' ایک اودگاتر چاہئے تھا جو سوم کے گیت گائے اور اُنکو کئی مددگاروں کی ضرورت تھی - رگ وید سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسے یگوں میں اکثر سات پروہت کام کرتے تھے ' ایک رچا میں ان کا شمار اس طرح کیا گیا ہے :— ہوتر ' پوتر ' نیشٹ ' اگنیدھ ' پرشاشتر ' ادھوری اور برہمن - یگیہ کا سارا کانڈ ایسا پیچیدہ ہو رہا تھا کہ ہر شخص نہ تو اُسے یاد رکھ سکتا تھا اور نہ پورا کر سکتا تھا ' اس لئے ایک پروہت کی جماعت طیار ہونے لگی جو برہمن کہلائی ' اور جو عام لوگوں کی مذہبی ضرورتوں کو پورا کرتی تھی جو لوگ اپنی صفتوں یا اپنے اعمال یا خواہشوں سے پروہتی کے قابل تھے وہ برہمن ہوگئے ' ان کے گھروں میں ان کے لڑکے عادتاً منتر پڑھنا یا تصنیف کرنا سیکھتے تھے ' - اپنے باپوں کے ساتھ رہ کر یگیہ کے طریقے جان جاتے تھے ' پروہت کا پیشہ سیکھنے کی جیسی آسانی اور سہولت اُنکو تھی ویسی کسی کو نہ تھی ' وہ بڑی اپنے خاندان کا کام کرنے لگے اس طرح آہستہ آہستہ علحدہ ایک برہمن جماعت طیار ہوگئی ' پہلے اور لوگ بھی اس میں شامل ہوتے ہوں گے ' لیکن رفتہ رفتہ باہر سے آنے والوں کی تعداد کم ہوتی گئی - رگ وید کے زمانے میں برہمن جماعت کے لوگ غیر برہمن سے شادی بیاہ کرسکتے تھے ' لیکن عام طور پر

بہت لوگ اپنے ہی خاندان میں شادیاں کرتے تھے ' نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کو ابھی تک شادی کے بارے میں پوری آزادی تھی ' لیکن انھوں محبت انھیں سے ہوتی تھی جن سے اکثر ملاقات ہوتی تھی - اور جو زیادہ تر سامنے رہتے تھے ' یعنی جو اپنے ہی جماعت کے تھے - یورپ امریکہ اور دوسرے ملکوں میں آج کل بھی ایسا ہی ہوتا ہے ' اس لئے شادی کی آزادی ہونے پر بھی برہمنوں کا طبقہ آہستہ آہستہ ایک علیحدہ طبقہ ہوتا گیا -

رگ وید کی کچھ رچاؤں سے برہمنوں کے اعمال اور منصب کا کچھ اندازہ ہوتا ہے - ایک جگہ کہا ہے کہ برہمن سوم رس سے سال بھر کا یگیہ کرتے تھے - دوسری جگہ برہمن اور آبا و اجداد سوم پینے کے لئے ملتے ہیں جس سے ظاہر ہے کہ برہمنوں کا درجہ بہت بلند تھا - [۱] بہت سے منتروں میں پروہتوں کی یا دیوتاؤں کے پروہت اگنی کی تعریف کی گئی ہے ' اور پروہتوں کو دان دینے کا تذکرہ ہے ' دان میں ' زیور ' کپڑے ' رتھ ' مکان ' مویشی یعنی گائے بیل ' گھوڑے اور کتے وغیرہ دئے جاتے تھے [۲] -

ایک جگہ کہا ہے کہ سرسوتی کنجوس کو تباہ کر دیتی ہے [۳] جس کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو برہمنوں کو دان نہیں دیتا وہ تباہ ہو جاتا ہے ' جو برہمن راجاؤں کے پروہت تھے وہ قدرتاً با اثر تھے '

---

[۱] رگ وید ۷ — ۱۰۳ — ۱ ، ۷ ، ۸ — —

[۲]—رگ وید ۶ — ۷۵ — ۱۰ — —

[۳]—مثلاً رگ وید ۱ — ۴۴ — ۱۰ ، ۱۲ — — ۳ — ۲ — ۸ — — ۲ — ۲۴ — ۹ — — ۱ — ۱ — ۱ — — ۳ — ۳ — ۲ — — ۵ — ۱۱ — ۲ — — ۷ — ۷۰ — ۴ — — ۱ — ۱۲۶ — ۱ — ۴ — — ۵ — ۳۰ — ۱۲ — ۱۵ — — ۷ — ۱۸ — ۲۱ ، ۲۴ — — ۸ — ۱ — ۳۲ ، ۳۴ — — ۱ — ۳۱ — ۲ — — ۵ — ۲۷ — ۱۷ — — ۵ — ۳۹ — ۴ — — ۵ — ۴۲ — ۸ — — ۶ — ۲۷ — ۸ — —

[۴]—رگ وید ۶ — ۶۱ — ۱ —

لیکن ابھی بڑے بڑے پروہت بھی ضرورت پڑنے پر سب کام کرتے تھے وشوامتر اور وسشت تو میدان جنگ تک میں جاتے تھے [۱]

جس طرح مذہبی ضرورتوں کی بنا پر برہمنوں کا طبقہ قائم ہوا،

چھتری

اُسی طرح جنگی ضرورتوں کے باعث چھتری جماعت پیدا ہوئی، یہ کہا جا چکا ہے کہ آریوں کو غیر آریوں سے بہت دنوں تک سخت لڑائی لڑنا پڑی، غیر آریوں کی شکست کے پہلے کبھی کبھی آپس میں بھی لڑ پڑتے تھے [۲]، شکست کے بعد آپس کی لڑائی گویا روز کی بات ہوگئی - یوں تو لڑائی میں بہت دنوں تک سب طرح کے لوگ میدان میں آتے تھے اور دشمن کا مقابلہ کرتے تھے جیسا کہ رگ وید میں کئی جگہہ کہا گیا ہے، میدان میں لوگ جمع ہوتے ہیں اور اپنی طاقت دکھاتے ہیں، [۳] صبح کی دیوی کے بارے میں ایک رشی کہتا ہے کہ اوشا (یعنی طلوع صبح) اس طرح آتی ہے جیسے لڑائی کے لئے عام آدمی [۴] ہتھیاروں سے اپنی جان و مال کی حفاظت کرنا سب کا فرض تھا، لیکن تمام لوگوں کے لئے بار بار میدان میں جانا قوم کے لئے مناسب نہیں ہو سکتا تھا - اگر سب مرد ایک ساتھ میدان جنگ میں پہونچ جائیں تو کھیتی کون کرے،

---

[۱]—رگ وید ۳ — ۳۳ — — ۷ — ۱۸ — —

[۲]—جنگ کی مثالوں کے لئے دیکھئے رگ وید ۱ — ۵۱ — ۹ — — ۱ — ۱۰۳ — ۳ — — ۱ — ۱۱۷ — ۲۱ — — ۱ — ۱۳۰ — ۸ — — ۲ — ۲۰ — ۶ ، ۸ — — ۵ — ۲۹ — ۱۰ — — ۵ — ۳۳ — ۴ — — ۵ — ۳۴ — ۶ — — ۶ — ۲۲ — ۱۰ — — ۶ — ۳۵ — ۶ — — ۶ — ۴۷ — ۲۰ — — ۶ — ۶۰ — ۶ — — ۶ — ۶۷ — ۵ — — ۸ — ۲۵ — ۷۳ — — ۸ — ۴۱ — ۷ ، ۹ — — ۹ — ۴۱ — ۱ — ب

[۳]—رگ وید ۴ — ۲۴ — ۴ — — ۶ — ۲۶ — ۱ — —

[۴]—رگ وید ۷ — ۷۹ — ۲ — —

مویشیوں کی پرورش اور دوسرے کام کون کرے ' گھر پر عورتوں اور بچوں کی حفاظت کیوں کر ہو ' مذہبی اور دینی ' اقتصادی اور سوشل زندگی کو ٹھیک ٹھیک جاری رکھنے کے لئے ضروری تھا کہ کچھ لوگ تو جنگی خدمات میں اپنی زندگی صرف کریں اور باقی کبھی کبھی ضرورت پڑنے پر ان کے ارد گرد جمع ہو جایا کریں یعنی ایک منظم فوج ہو ' اُس کا سردار ہو ' نائک ہو ' اس کی تعلیم کا اور ہتھیاروں کا ٹھیک ٹھیک انتظام ہو ' ان کے لئے گھوڑے اور دوسرے جانور برابر طیار رہیں - اس طرح کی فوج میں وہی لوگ شامل ہوئے جو ہمت ور تھے بہادر تھے ' جسم کے اعتبار سے مضبوط تھے اور میدان جنگ سے محبت رکھتے تھے - ایسی فوج شاید کسی نے مقررہ وقت پر دانستہ طور پر نہ بنائی ہوگی ' لڑائی کے زمانے میں خود بخود اس کی نشو و نما ہو گئی ' آہستہ آہستہ وہ خود ہی ضرورتوں کے مطابق ہر ایک آریہ جماعت میں بن گئی تھی - ان سپاہیوں کے لڑکے بھی اپنے خاندان کی روایات کے مطابق سپاہیوں کا کام اختیار کرتے تھے - اپنے خاندانی پیشے کے اختیار کرنے کا رجحان آج بھی ہر ملک میں پایا جاتا ہے - قدیم زمانے میں یہ میلان اور بھی زیادہ تھا ' کیونکہ اُن دنوں پیشے کی تعلیم زیادہ تر گھر ہی میں مل سکتی تھی - اس طرح آریہ جماعت میں ایک جنگی طبقہ طیار ہوا - فوجی طاقت کے باعث اسی جماعت کے ہاتھ میں سیاسی اقتدار کی بھی باگ رہی ' چھتریوں کا یہ فوجی اور سیاسی مقتدر طبقہ بہت دنوں تک تو اوروں سے شادی بیاہ کے تعلقات رکھتا رہا لیکن برہمنوں کی طرح یا یوں کہئے کہ جماعت کی حیثیت سے اس کا رجحان بھی زیادہ تر آپس ہی میں تعلقات قائم کرنے کی جانب تھا ' قوت اور اقتدار کے باعث اس طبقے کی بڑی دھاک بندھی ہوئی تھی ' اسے قدرتی طور پر تفاخر تھا اور سارا سماج اس کا لوہا مانتا

تھا - رگ وید میں چھتري ہونے کے منصب کا تفوق تسلیم کیا گیا ہے اور اُن لوگوں کي برائی کی گئی ہے جو جھوٹ موٹ چھتري ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں [۱] -

وشِ

جیسے جیسے برہمنوں اور چھتریوں کا طبقہ طاقتور ہوتا گیا وہ عام لوگوں سے زیادہ تر الگ ہوتے گئے ' باقی آریہ جماعت وشِ کہلانے لگی - وشِ کے لفظ سے پہلے ساری آریہ جماعت کا تصور کیا جاتا تھا ' اس کے اصلی معنی تو صرف بیٹھنا ہیں ' گھومنے پھرنے کے بعد جب آریہ لوگ زمین پر بیٹھ گئے ' یعنی زمین پر مستقل طور پر آباد ہو گئے ' اور خاص کر کھیتی باڑي سے زندگی بسر کرنے لگے تو ان کي بستي وشِ کہلانے لگی ' یہ لفظ بسنے والوں کا یعنی عام لوگوں کا مفہوم بن گیا - برہمنوں اور چھتریوں کے طبقے کے بن چکنے کے بعد ایک ایسے لفظ کی ضرورت تھی جو بقیہ جماعت کے لئے استعمال کیا جا سکے ' اس کے لئے وش کا لفظ استعمال کیا جانے لگا - ایک منتر میں پہلے چھتریوں کے لئے طاقت کی دعا مانگی گئی ہے اور پھر وش کے لئے بھی وہی دعا مانگی گئی ہے [۲] رگ وید کے پہلے نو منڈلوں میں ویش کا لفظ کہیں نہیں آیا ہے ' صرف ' وش کا لفظ استعمال کیا گیا ہے ' وش بہت بڑا طبقہ تھا ' اس طبقے کے لوگ کھیتی کرتے تھے ' مویشی پالتے تھے اور طرح طرح کی دستکاری وغیرہ کے بہت سے کام کرتے تھے ' آہستہ آہستہ اپنے پیشوں کے مطابق بہت سے اور چھوٹے طبقے وش جماعت کے اندر بن گئے -

---

[۱]--رگ وید ۷ — ۱۰۳ — ۱۳ — —

[۲]--رگ وید ۸ — ۳۵ — ۱۷ ' ۱۸ — —

پیشوں کی تفریق کے علاوہ ایک اور سبب بھی تھا جس سے طبقے

مختلف طبقے

طیار ہوئے جیسا کہ فرنچ عالم سنیارت نے بتایا ہے کہ آریوں میں قدیم زمانہ سے یہ رواج تھا کہ گوتر یا خصوصی تعلقات کے دایرے میں بیاہ نہیں کرتے تھے ' لیکن اکثر دوسرے خاص گوتروں میں شادی بیاہ کے تعلقات رکھتے تھے ' گوتر کے اندر اور گوتر کے باہر باہمی ازدواجی تعلقات کے رسم کے باعث بھی بہت سے طبقے قائم ہوگئے ' برہمنوں اور چھتریوں کے طبقے اور دوسرے چھوٹے چھوٹے طبقوں کے بننے میں سیکڑوں برس لگے ہونگے - جماعتوں کی نشو و نما ہمیشہ آہستہ آہستہ ہوتی ہے - اور وہ ایک مدت میں جاکر جڑ پکڑتے ہیں ' رگ وید کے زمانے میں جماعتوں کی تنظیم ہو چکی تھی ' لیکن ما بعد کی ذات پات کی رسم ابھی دور تھی ' آریوں کے درمیان اس وقت تک باہمی شادی بیاہ کے تعلقات جاری تھے - ایک طبقے سے دوسرے طبقے میں داخل ہونا اُس وقت تک ممکن تھا - پیشہ میں بھی آزادی تھی - یہہ ضرور ہے کہ عملاً ایسا کم ہوتا تھا لیکن اسکی کوئی ممانعت نہ تھی ' کھانے پینے میں تو مطلق کوئی روک ٹوک تھی ہی نہیں -

موازنہ -

ہم یہ کہہ چکے ہیں کہ طبقے کل جماعتوں میں بن جاتے ہیں - پرانے زمانے میں کئی ملکوں میں ویسے ہی طبقے تھے جیسے ہندوستان میں ' مثلاً ایران میں بالکل اسی طرح کی تفریق تھی ' پرانی روایتوں کی بنیاد پر فارسی کا شاعر فردوسی کہتا ہے کہ راجہ جم نے چار طبقے تیار کئے ' [۱] لیکن اصل یہ ہے کہ وہاں بھی یہ طبقے صدیوں کی تمدنی نشو و نما کے بعد تیار ہوئے ' قدیم ' بابل ' اسیریا اور مصر ' وغیرہ میں بھی طبقے پائے جاتے تھے -

---

[۱]—شاہنامہ ' ۱ — ۱۳۲ — —

آریہ طبقے کے لئے تو رگ وید شاھد ھے ' لیکن کیا غیر آریوں

غیر آریہ طبقہ

میں بھی طبقے تھے ؟ غیر آریوں میں کئی جماعتیں تھیں یہ تو رگ وید سے نمایاں ھے ' لیکن ممکن ھے کہ یہ غیر آریہ جماعت میں ' آریوں سے خلط ملط سے پہلے مختلف طبقے رھے ھوں ' وہ طبقے بھی شاید انہیں اسباب کی بنا پر پیدا ھوئے ھوں گے جن سے آریہ طبقے پیدا ھوئے -

شکست کے بعد جب غیر آریہ ' آریوں سے دب کر رھنے لگے تو انکی پرانی تفریق کچھہ تبدیل ھو گئی ھوگی ' لیکن بالکل مٹ نہ گئی ھوگی - مجلس یا سماج\کی ھیئت اجتماعی کے بدلنے میں جتنی دیر لگتی ھے اتنی ھی مٹنے میں بھی لگتی ھے ' کبھی کبھی تو حالات بدل جانے پر بھی وہ مٹائے نہیں مٹتیں ' پرانے غیر آریہ طبقے کسی نہ کسی شکل میں قائم رھے ھونگے ۔

آریوں اور غیر آریوں میں جو کم و بیش مخالفت ھوگئی تھی '

مخلوط طبقے

اس سے پیدا ھونے والی جماعت کا کیا حشر ھوا ؟ یہاں رگ وید سے کوئی مدد نہیں ملتی - اتنا ھی قیاس کیا جا سکتا ھے کہ شاید اُن میں سے کچھ آریہ جماعت میں رہ گئے ھوں اور شاید کچھہ غیر آریہ جماعت میں چلے گئے ھوں - یہ بھی ممکن ھے کہ شاید ان کے علیحدہ طبقے بن گئے ھوں ' جیسا کہ آج تک افریقہ میں اور ممالک متحدہ امریکہ کی جنوبی ریاستوں میں یا ایک چھوٹے پیمانے پر لنکا ' ھندوستان وغیرہ اکثر ممالک میں پائے جاتے ھیں - ان مخلوط طبقوں کا شمار خواہ آریوں میں ھوا ھو یا غیر آریوں میں لیکن عملاً یہ طبقے علحدہ ھی تھے -

طبقوں کی یہ وسیع تفریق ذات پات میں کیونکر تبدیل ہوگئی یہ آگے بتایا جائیگا ' رگ وید - کے زمانے کے بارے میں یہ وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ھے کہ ایک طرف

خلاصہ بیان

آریوں میں اور دوسری طرف غیر آریوں میں بہت بڑا فرق تھا - خود آریوں میں کم سے کم تین طبقے تھے ' لیکن شاید اُن کے اندر چھوٹے چھوٹے اور طبقے بھی بن رھے تھے ' شاید غیر آریوں میں بھی کئی طبقے تھے ' اور ممکن ھے کہ مخلوط جماعت میں بھی علیحدہ علیحدہ طبقے رھے ھوں -

غیر آریہ طبقوں کی عام تمدنی زندگی کے بارے میں وثوق کے ساتھ کچھہ نہیں کہا جا سکتا - ممکن ھے کہ زمانے کے مطابق وہ آریوں کی جماعت کا رنگ اختیار کرتے جاتے ھوں -

عام تمدنی زندگی

آریوں کی تمدنی زندگی کی ایک جھلک رگ وید سے ملتی ھے ' تنظیم کے اصول اور عمل میں عورتوں کا درجہ بہت بلند تھا ' کسی طرح کا پردہ نہ تھا ' عام زندگی کے علاوہ سماج کے مذھبی و ذھنی پیشوائی میں بھی عورتوں کا ھاتھہ تھا ' اُس زمانے میں جوبھی تعلیم رائج تھی اس کے دروازے عورتوں کے لئے بھی کھلے ھوے تھے - -

جن عورتوں میں مذھبی لٹریچر تیار کرنے کی استعداد تھی ' اُن کو اپنے اس میلان کے مطابق کام کرنے کی روک ٹوک نہ تھی - کچھہ عورتیں رشی تھیں جن کی تصانیف مردوں کی طرح رگ وید سنگھتا میں آج تک شامل ھیں - [١] ھمت اور بہادری میں بھی عورتیں کم نہ تھیں ' بعض عورتیں تو میدان جنگ میں جاکر مردوں کی طرح بہادری دکھلاتی تھیں ' مثال کے لئے ایک روایت ھے کہ بشپلا ' لڑائی میں

[١] —رگ وید ' ١ ' ١١٧ — ١ ' ١٧٩ — ٥ ' ٢٨ — ٦ ' ١٠ ' ٢ — ٨ ' ٩١ —

گئی تھی ' جب لڑتے لڑتے گھائل ہوگئی تو آشونو نے اس کا علاج کیا [۱] شادی کے معاملے میں بھی عورتوں کو بہت آزادی تھی ' اکثر جوان عورتیں اور مرد آپس میں ملا کرتے تھے اور اپنی پسند کے مطابق آپس میں محبت کرتے تھے اور اپنی پسند کے موافق ایک دوسرے سے بیاہ کر لیا کرتے تھے - [۲] بعض بعض نوجوان عورتیں ' اپنی خوبصورتی پر پھولے نہ سماتی تھیں ' اور اپنے عشاق کے دلوں کو لبھا لینے میں بڑي ہوشیار ہوتی تھیں - [۳] کبھی کبھی یہ عاشق و معشوق چھپ کر ملنے کی کوشش کرتے تھے ' ایک مقام پر ایک نوجوان منتر کے ذریعہ اپنی معشوقہ کے گھر والوں کو سلانے کی کوشش کر رہا ہے - [۴] ان بیانات سے اور شادی کے بعد بھی ہونے والے سنسکاروں سے صاف ظاہر ہے کہ اُس زمانے میں نوعمری کی شادیاں نہیں ہوتی تھیں - رگ وید میں نہ کہیں نو عمري کی شادي کا تذکرہ ہے اور نہ کوئی ایسی بات ہے جس سے نو عمري کی شادي کا ذرا بھی خیال ہو سکے ' بخلاف اس کے ایک حوالے سے ظاہر ہوتا ہے کہ عورتیں کبھی کبھی ادھیڑ عمر میں شادی کرتی تھیں مثلاً گھوشا نامی ایک عورت بڑي عمر تک کنواري ھي رھی [۵] بعض بعض عورتیں ایسی تھیں جو شادی سے بالکل انکار کردیتی تھیں اور اپنے باپ یا بھائی کے ساتھ رہتی تھیں ' ایک جگہ ایک عورت کا تذکرہ ہے جو اپنے ماں باپ کے گھر ھی میں بوڑھی ہوتی جاتی ہے [۶] -

---

[۱]-- رگ وید ' ۱ ' ۱۱۲ ' ۱۰ — ۱ ' ۱۱۶ ' ۱۵ — ۱ ' ۱۱۷ ' ۱۱ ' ۱ ' ۱۱۸ ' ۸ —

[۲]—رگ وید ' ۱ ' ۱۱۵ ' ۲ — ۹ ' ۳۲ ' ۵ — ۹ ' ۵۶ ' ۳ —

[۳]—رگ وید ' ۱ — ۱۲۳ ' ۱۰ —

[۴]—رگ وید ' ۷ ' ۵۵ ' (۵ ' ۶ ' ۸) —

[۵] رگ وید ' ۱ ' ۱۱۷ ' ۷ —

[۶]—رگ وید ' ۲ ' ۱۷ ' ۷ —

سگائی پکی ہو جانے کے بعد مقررہ وقت پر] دولہا اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کی برات لیکر بیٹی والے کے یہاں جاتا تھا یہاں دولہن کے رشتہ دار اور احباب ان سب کی آو بھگت کرتے تھے، وقت مہورت پر دولہا دلہن کو ایک پتھر پر چڑھا کر اسکا پان گرہن (ہاتھ پکڑنا یعنی شادی کرنا) کرتا تھا اس کے بعد دونوں آگ کی پرکرما کرتے تھے، بیاہ کی اس رسم کے بعد بڑی خوشی منائی جاتی تھی جس میں لڑکی لڑکے، مرد اور عورت اچھے سے اچھے کپڑے پہن کر شریک ہوتے تھے [۱] کبھی کبھی بیاہ میں جہیز بھی دیا جاتا تھا، اس جشن کے بعد برات رخصت ہو جاتی تھی، دولہا، دولہن کو رتھ پر بٹھلاتا تھا، ملنگ گاتے ہوئے سب لوگ بیٹے والے کے یہاں واپس چلے آتے تھے، شادی کی یہ رسمیں بہت دنوں تک اسی طرح جاری رہیں، اور آج کل بھی بہت کچھ ایسی ہی ہیں -

بیاہ کی رسم

رگ وید کے زمانے میں کچھ گنتی کے لوگ خصوصاً راجہ، مہاراجہ یا بڑے پروہت متعدد شادیاں کرتے تھے - [۲] محدود حلقے میں متعدد شادیوں کی رسم اب تک جاری رہی، لیکن یاد رکھنا چاہئیے کہ فطرت عورتوں اور مردوں کی تعداد کو تقریباً برابر رکھتی ہے تھوڑے ہی سے آدمی ایک سے زیادہ شادی کر سکتے ہیں، اقتصادی وجوہ سے اور عام خانگی امن و آرام کی وجہ سے متعدد شادیاں محدود ہی رہتی ہیں، تاہم یہ ماننا پڑے گا کہ متعدد شادیوں کی رسم کو قبول کرنا ہی عورتوں کے مرتبے کو کچھ کم کر دینا ہے، کیونکہ اُس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ عورتیں صرف حظ نفس کا ایک سامان

کثرت ازدواج

---

[۱]—رگ وید، ۴، ۵۸، ۹ —

[۲]—رگ وید، ۱، ۶۲، ۱۱ — ۱، ۷۱، — ۱ — ۷، ۱۸، ۲ — ۷، ۲۶، ۳ -

ہیں ' متعدد شادیوں کی رسم عورتوں کے دل پر ایسی چوٹ پہونچاتی ہے اور ان کے ذہنی سکون میں اس درجہ اختلال پیدا کرتی ہے کہ سوکنوں میں دن رات جھگڑا ہونا ایک عام بات ہو جاتی ہے - رگ وید سے ظاہر ہے کہ متعدد شادیاں کرنے والے بڑے بڑے لوگ کبھی کبھی خانگی جھگڑوں کے افکار سے بری طرح پریشان رہتے تھے [۱] -

عقد بیوگاں

رگ وید میں عقد بیوگاں کے خلاف کچھ نہیں ہے ' لیکن یہ ٹھیک ٹھیک نہیں معلوم ہوتا کہ بیوائیں اپنے دیوروں ہی سے بیاہ کرتی تھیں یا کسی اور سے بھی کرسکتی تھیں - دسویں منڈل میں ایک رچا ہے جو آریہ تہذیب میں بیواؤں کی حالت پر کچھ روشنی ڈالتی ہے ' مرگھٹ میں اپنے شوہر کی نعش کے پاس بیٹھی ہوئی بیوہ سے کہتے ہیں کہ " اُٹھو ' اے خاتون ! تم اس کے پاس پڑی ہو جس کی زندگی ختم ہوچکی ہے ' اپنے شوہر سے دور ہٹ کر زندہ انسانوں کی دنیا میں آؤ اور اس کی بیوی بن جاؤ جو تمہارا ہاتھ پکڑتا ہے اور تم سے بیاہ کرنے کو راضی ہے " [۲] اسی طرح اتھر وید میں ہے کہ " یہ عورت یعنی بیوہ عورت پرانے دھرم پر چلتی ہوئی تمہارے لوک کو پسند کرتی ہوئی ' تمہارے پاس جو مر گئے ہو پڑی ہے ' لیکن اس کو بھی اولاد اور دولت ' عطا کرو ' اے عورت اُٹھ ! زندہ لوگوں کی دنیا میں آجا " (—— مثل سابق) [۳] متعدد صدیوں کے بعد پنڈتوں نے وید کی رچاؤں کا مطلب تبدیل کرکے اس سے ستی کا طریقہ نکالا ' لیکن یہ صاف ہے کہ اس زمانے میں بیوہ شوہر کے ساتھ ستی جلائی

---

[۱]—رگ وید ' ۱ ' ۱۰۴ ' ۳ — ۱ ' ۱۰۵ ' ۸ —

[۲]—رگ وید ' ۱۰ ' ۱۸ ' ۸ —

[۳]—اتھر وید ' ۱۸ ' ۳ ' ۱ — ۲ —

جاتی تھی - تاہم ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر بیوہ مرگھٹ میں شوہر کے پاس جب اس کے جلانے کی تیاری ہورہی ہے کیوں لٹائی جاتی ہے ' تاریخی واقعات کی کمی کے باعث اس سوال کا کوئی ٹھیک جواب نہیں دیا جاسکتا ' لیکن ایک خیال ہوتا ہے کہ دنیا کی بہت سی قدیم قوموں میں آدمیوں کے اور خاص کر بڑے آدمیوں کی نعش کے ساتھ ان کی عزیز چیزوں کے جلانے یا دفن کرنے کا رواج تھا ' اُن کا خیال تھا کہ روح کو دوسرے عالم میں بھی ان چیزوں کی ضرورت پڑے گی ' کسی طرح یہ چیزیں ان کے پاس پہونچ جائینگی اور اُنہیں پاکر انہیں آسودگی و راحت ملے گی ' بعض قوموں میں عورتوں کا شمار ان ضروری چیزوں میں کر لیا گیا ' اور وہ شوہروں کے ساتھ دفن ہونے یا جلائی جانے لگیں ' ممکن ہے کہ کسی ماضی بعید میں آریوں میں بھی یہ رسم رہی ہو ' یہ ہم کہہ چکے ہیں کہ رگ وید کی تہذیب کی پشت پر متعدد صدیوں کی نشو و نما کام کرتی رہی ہے ' اگر کسی پرانے زمانے میں آریوں میں ستی کی رسم جاری تھی تو آہستہ آہستہ تہذیب کی رفتار نے اُسے مٹا دیا ' بیواؤں کا جلانا تو موقوف ہوگیا لیکن قدیم رواج کی ایک لکیر باقی رہ گئی جیسا کہ اکثر ہوا کرتا ہے ' اس مٹی ہوئی رسم کے مطابق بیوہ مرگھٹ چلی جاتی تھی اور تھوڑی دیر کے لئے شوہر کی نعش کے پاس لیٹ جاتی تھی ' بعد میں یعنی چوتھی صدی ق - م کے قریب بعض ہندوستانی قبائل میں ستی کی رسم کیونکر شروع ہوگئی ' یہہ ہم آگے بتائینگے ' یہاں صرف اس بات پر زور دینا ضروری ہے کہ بہت قدیم زمانہ میں آریوں میں یہ رسم ممکن ہے رہی ہو مگر رگ وید کے وقت میں یہ بالکل نہ تھی ' بر خلاف اس کے بیواؤں کا عقد ہو سکتا تھا ' دیور کے ساتھ شادی کی رسم تو ثابت ہے ' لیکن اگر

دیور کی شادی پہلے ہو چکی ہو ، یا بھاوج سے شادی کرنے کو راضی نہ ہو تو کیا ہوتا ہے ؟ رگ وید اس معاملہ میں خاموش ہے لیکن اُس زمانہ کے عام مجلسی نظام اور زندگی سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ بیوہ کسی اور شخص سے بیاہ کر لیتی ہوگی ، ایک منتر [۱] کی بنا پر جرمن عالم پشیل نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ جس عورت کا شوہر غائب ہو گیا ہو ، وہ دوسری شادی کر سکتی تھی ، لیکن ویدک لٹریچر سے اس کا پورا پورا ثبوت نہیں ملتا -

کنبہ

آریوں کے کنبہ کی زندگی ، اور موروثی حقوق ، عورتوں کی تعظیم کے اصولوں کی بنیاد پر قائم تھے -

گھر کا مالک

باپ یا دادا ایک طرح کا گھر کا مالک ہوتا تھا ، جس کا حکم گھر کے اور لوگ مانتے تھے [۲] - گھر کے مالک سے بہادری اور فیاضی کی توقع کیجاتی تھی [۳] ، باپ کے مرنے کے بعد لڑکا گھر کا مالک ہوتا تھا ، عام طور پر وہ خاندان کی دولت کا مالک سمجھا جاتا تھا ، مکان ، گھوڑے ، گائے ، بیل ، روپیہ پیسہ ، زیور ، ہتھیار اور غلام وغیرہ سب پر اُس کا قبضہ رہتا تھا ، لیکن کبھی کبھی بھائیوں میں بٹوارا بھی ہو جاتا تھا ، [۴] - بھائیوں کا ایک بڑا فرض یہ تھا کہ شادی ہونے تک بہنوں کی پرورش کرتے رہیں ، اسی لئے سنسکرت میں بھائی کے لئے بھراتر ایک لفظ ہے یعنی پالنے والا ، جن لڑکیوں کے بھائی نہ تھے اُن کو کبھی کبھی

---

[۱]—رگ وید ، ۱ ، ۱۸۵ ، ۸ —

[۲]—رگ وید ، ۲ ، ۵۳ ، ۲ —

[۳]—رگ وید ، ۲ ، ۲۹ ، ۸ —

[۴]—رگ وید ، ۷۱ ، — ۷ ، ۵ —

بڑی مصیبت اُٹھانا پڑتی تھی ' ایک رچا میں ایک غریب لڑکی کا جس کا بھائی نہ تھا ذکر ہے کہ جو ناجائز طریقے سے زندگی بسر کرتی تھی [۱] -

رگ وید کے زمانے سے آج تک ہندوستان میں مشترکہ خاندان کی رسم چلی آتی ہے' اس سے شخصی آزادی کم ہو جاتی ہے اور عورتوں کا منصب کسی قدر گھٹ جاتا ہے '

عورت

لیکن کم سے کم رگ وید کے زمانے میں عورتوں کا درجہ کم نہیں ہونے پایا' ساس ' سسرے ' دیور اور نند کے ساتھ رہ کر بھی بہو کا اثر زیادہ تھا ' اپنے شوہر کے ساتھ وہ منتر پڑھتی تھی ' یگیہ کرتی تھی ' دان دیتی تھی ' سوم رس بناتی اور پیتی تھی [۲] - ایک ویدک منتر میں رشی کہتا ہے کہ شوہر اور بیوی محبت کے ساتھ' باہم ملکر بہت سے مذہبی کام انجام دیتے ہیں ' سنہرے زیور پہنے ہوئے لڑکے لڑکیوں کے ساتھ آرام کرتے ہیں اور پوری زندگی پاتے ہیں [۳] عورت گھر کا انتظام کرتی تھی ' اور بہت سے کاموں کے علاوہ تانے بانے کا کام بھی انجام دیتی تھی [۴] ' اس میں شک نہیں کہ کہیں کہیں اگنی دیوتا کی مشابہت گھر کی عورت سے دی گئی ہے جو گھر کے تمام لوگوں کی خبرداری رکھتی ہے[۵] ایک جگہہ اوشا دیوی کے بارے میں رشی کہتا ہے کہ وہ گھر کی عورت کی طرح سونے والوں کو جگاتی

---

[۱]—رگ وید' ۱ ' ۱۲۴ ' ۷ —

[۲]—رگ وید ' ۱ ' ۱۳۱ ' ۳ — ۵ ' ۴۳ ' ۱۵ —

[۳]—رگ وید ' ۷ ' ۳۱ ' ۵ ' ۸ — شوہر اور بیوی کی محبت کے لئے رگ وید ۱ ' ۱۰۵ ' ۲ بھی دیکھئے

[۴]—رگ وید ' ۲ ' ۳ ' ۶ — ۲ ' ۳۸ ' ۴ —

[۵]—رگ وید ' ۱ ' ۶۶ ' ۳ —

ہوئی آتی ہے [۱] عورت کے بغیر گھر، گھر نہیں ہے، ایک منتر میں رشی کہتا ہے " اے میگھ ون بیوی ہی گھر ہے، بیوی ہی گرہستی ہے " [۲] یہ بھی کہتا ہے کہ " اے اندر تم سوم رس پی چکے، اب گھر کی طرف جاؤ، گھر میں تمہاری پیاری بیوی ہے، تمہارے لئے وہیں راحت ہے " [۳] ایک منتر میں اندر کے منھ سے یہ ضرور کہلایا ہے کہ عورتوں کی عقل کمزور ہوتی ہے، اُن کو اپنے جذبات پر قابو نہیں ہوتا [۴] لیکن عام طور سے عورتوں کی بڑی عزت تھی -

اولاد کی خواہش

قدیم ایرانیوں، یونانیوں اور رومیوں کی طرح ویدک اریوں میں بھی اولاد کی بہت خواہش تھی - اگن دیوتا سے استدعا کرتے ہوئے ایک رشی کہتا ہے " ہم تمہارے پاس اکیلے ہی بیٹھے نہ رہ جائیں، ہماری بہادر اولاد بھی ہو، اور ہمارا گھر اولاد سے بھرا ہوا ہو [۵] اسی منتر میں پھر پوری عمر اور بہادر اولاد کی درخواست کی ہے [۶] ایک دوسرا رشی دعا مانگتا ہے کہ ہم محتاج نہ ہوں، ہمیں بھی بہادر لڑکوں کی کمی نہ ہو، مویشیوں اور جانوروں کی بھی کمی نہ ہو، اور نہ ہماری برائی کی جائے [۷] ایک دوسرے رشی کو یقین ہے کہ سوم دیوتا پوجا کرنے والے کو دودھ دینے والی گائے اور تیز گھوڑا دیتا ہے اور ایسا بہادر

---

[۱] —رگ وید، ۱، ۱۲۴، ۴ —

[۲] —رگ وید، ۳ — ۵۳، ۴ —

[۳] —رگ وید ۳، ۵۳، ۶ —

[۴] —رگ وید، ۸، ۳۳، ۱۷ —

[۵] —رگ وید، ۷، ۱، ۱۱، ۱۲، ۱۹ —

[۶] —رگ وید، ۷، ۱، ۲۴ —

[۷] —رگ وید، ۳، ۱۶، ۵، ۶ —

لڑکا دیتا ہے جو علم میں ' گھر کے کاموں میں اور عام مجلسوں میں ' ملنے جلنے میں ہوشیار ہو اور باپ کے لئے باعث فخر ہو [۱] -

اس کا سبب

اولاد کی خواہش ایک قدرتی خواہش ہے جسے فطرت نے جماعت کی حفاظت کے لئے نہایت قوی بنایا ہے - لیکن اس کے کچھ اور خاص وجوہ بھی تھے ' ایک تو مشترکہ خاندان میں ماں باپ کو لڑکوں کی وجہ سے بڑا سہارا ہوجاتا تھا ' دوسرے مرنے کے بعد روح کے سکون کے لئے لڑکا شرادھ کیا کرتا تھا - اگر کوئی شرادھ کرنے والا نہ ہو تو بڑی مصیبت کا سامنا ہوتا تھا - تیسرے لڑکے کی وجہ سے نسل قائم رہتی تھی - خاندانی اقتدار کے زمانے میں تمام قوموں میں خاندان کے مٹ جانے کا اندیشہ نہایت خوفناک مسئلہ سمجھا جاتا تھا اور بے اولادی سب سے بڑی بات سمجھی جاتی تھی - چوتھے شاید آریوں کو اپنی تعداد بڑھانے کی بڑی ضرورت بھی تھی - غیر آریوں سے یا آپس میں جنگ کے لئے ' فتح کی ہوئی زمین کو آباد کرنے کے لئے اور یوں بھی سوسائٹی میں غیر آریوں سے شمار میں زائد ہوکر انہیں دبانے کے لئے کثیر تعداد کی ضرورت تھی - اس طرح جب ایک بار اولاد کی اہمیت تسلیم کر لی گئی تو وہ خود بخود اولاد کی خواہش کا سبب بن گئی -

گود لینا

جن کے کسی طرح اولاد نہ ہوتی تھی وہ کبھی کبھی دوسروں کے لڑکوں کو گود لے لیا کرتے تھے - گود لئے ہوئے لڑکے بڑے لاڈ پیار سے پالے جاتے تھے ' ایک مدت کی مادرانہ محبت اور پدرانہ شفقت ' انہیں پر صرف ہونے لگتی تھی - لیکن جیسا کہ ایک ویدک منتر سے ظاہر ہے گود لئے ہوئے لڑکے اصلی لڑکوں کی طرح نہیں ہوتے تھے -

---

[۱] — رگ وید ' ۱ ' ۹۱ ' ۲۰ —

آریہ خاندانوں کا بیاں غلاموں کا تذکرہ کئے بغیر پورا نہیں ہوسکتا -

غلام

قدیم ہندوستان میں غلامی کی رسم رائج نہ تھی ' اور نہ اس طرح مجلسی نظام کی بنیادیں تھیں جیسے یونان اور روم میں - تاہم یہاں خاص کر امیروں کے یہاں بہت سے لونڈي ' غلام تھے - ایک رشی اوشا سے لڑکوں کے ساتھ ساتھ غلاموں کے لئے بھی دعا مانگتا ھے [۱] ' غلاموں کو سخت محنت کرنی پڑتی تھی [۲] - وہ ایک طرح کی دولت سمجھے جاتے تھے اور دان میں دئے جاسکتے تھے - ایک رشی کہتا ھے کہ اگنی دیوتا ' ابھیار ورتن چائمان نے مجھ کو بیس بیل کے ساتھ ساتھ بہت سی لڑکیاں بھی دیں [۳] دوسری جگہ کہا گیا ھے کہ راجہ ترس دسیو نے پچاس لونڈیاں دان میں دیں [۴] -

مہمانداری

تاریخ کی دوسری قوموں کیطرح قدیم آریہ تہذیب پر غلامی کا جو داغ لگتا ھے اس کو مٹانے کی کوشش کرنا فضول ھے - لیکن یہ نہ سمجھنا چاھئے کہ وہ لوگ رحم کے جذبات سے بالکل خالی تھے مثلاً اُس سماج میں مہمانداری ایک بڑا وصف سمجھی جاتی ھے ' رگ وید میں اگن دیوتا کو آتیتھ (مہمان) کے نام سے یاد کیا گیا ھے ' [۵] - راجہ دیوداس مہمانوں کی اس درجہ تواضع کرتا تھا کہ اُسے اتیتھیی گوے کا خطاب دیا گیا تھا [۶] عام لوگ بھی مہمانداری میں کم نہ تھے ' گھر کا سب سے اچھا کمرہ مہمان کو رھنے کے لئے دیا جاتا تھا

---

[۱]—رگ وید ۱ ' ۹۲ ' ۸ -

[۲]—رگ وید ۱ ' ۸۶ ' ۷ -

[۳]—رگ وید ۶ ' ۲۷ ' ۸ -

[۴]—رگ وید ۸ ' ۱۹ ' ۳۶ -

[۵]—رگ وید ۷ ' ۳ ' ۵ -

[۶]—رگ وید ۱ ' ۵۱ ' ۶ — ۱ ' ۱۱۲ ' ۱۴ — ۴ ' ۲۶ ' ۶ — ۳۷ ' ۲۲ —

[۱] اسکے علاوہ آریوں کا یہ فرض تھا کہ سب کے ساتھہ شرافت کا برتاؤ کریں ' ایک رشی دعا مانگتا ھے کہ اے " ورون دیوتا ' اگر ھم نے بھائی ' دوست ' رفیق ' ھمسایہ یا اجنبي کا کچھہ بھی بگاڑا ھو تو ھمارے یہ گناہ دور کرو [۲] -

تعلیم

قریب قریب ھر فرقہ میں بچوں اور جوانوں کو اپنے مقاصد اور رسم و رواج کو قائم رکھنے کی تعلیم دیجاتی ھے ' رگ وید میں لکھنے کے رواج کا کہیں ذکر نہیں ھے ' رشی اور دیگر اشخاص بھي منتر یاد رکھتے تھے ' اور زبانی تعلیم کے ذریعہ اپنی اولاد کو سکھا دیتے تھے ' معلوم ھوتا ھے کہ اس کے علاوہ ایک طرح کي پاٹ شالائیں بھی تھیں استاد؛ طالب علموں کو پڑھاتے بھي تھے - ایک منتر میں تعلیم پانے والے طلبہ کی مثال برسات کے مینڈکوں سے دی ھے [۳] اور بہت سے ویدک جملوں کیطرح یہ مثال بھي آیندہ ھندو ادب میں بار بار ملتي ھے -

مجلسي قانون کامعیار

رگ وید میں سماج کے مجلسي قانون کا بہت بڑا معیار قائم کیا گیا ھے - اُس میعار کے مطابق سب لوگوں کو چاھئےکہ مل جل کر رھیں اور رت یعني صداقت یا یوں سمجھئے کہ دھرم کو اپنی زندگي کا سہارا سمجھیں -

آدمي کیا دیوتا بھی دھرم کی حفاظت کرتے ھیں ' خود دیوتاؤں نے اپنے لئے سخت قاعدے بنا رکھے ھیں [۱] اس کے علاوہ دیوتا کبھی اندر کے

---

[۱]—رگ وید ۱ ' ۷۳ ' ۱ -

[۲]—رگ وید ۵ ' ۸۵ ' ۷ -

[۳]—رگ وید ۷ ' ۱۰۳ ' ۵ اسی نقل میں ۷ ' ۷۸ ' ۴ بھی دیکھئے -

[۴]—رگ وید ' ۱ ' ۳۶ ' ۵ -

قاعدوں کے خلاف ورزی نہیں کرتے [۱] دنیا میں جو کچھ ہے اس کی بنیاد میں رت (صداقت) ہے - متروورن دیوتا باطل کو فتح کرکے رت (حق و صداقت) کی پرورش کرتے ہیں [۲] دیوتا ورن کے قاعدے ہمیشہ حق ہیں [۳] ورن کو باطل سے دلی نفرت ہے اور صداقت کو ترقی دیتا ہے [۴] اسی منتر میں رشی کہتا ہے کہ دیوتا رت (صداقت) میں پیدا ہوتے ہیں ' رت کی پرورش کرتے ہیں اور ترقی دیتے ہیں اور باطل سے سخت نفرت کرتے ہیں ' وہی دیوتا راجاؤں کی اور عام آدمیوں کی حفاظت کریں [۵] رت کو بڑھانے کی غرض سے متروورن آدمیوں پر اُسی طرح نظر رکھتے ہیں جیسے گڈریے اپنی بھیڑوں پر [۶] سورج بھی چرواہے کی طرح ذی روح ہستیوں کے اعمال کا جایزہ لیتا ہے اور متروورن کو بتلاتا ہے [۷] سیرت کی نگرانی کی غرض سے دیوتاؤں نے نگرانی کرنے والے بھی مقرر کر دئے ہیں [۸] بہت سے منتروں میں جھوٹ کی بڑی مذمت کی گئی ہے - [۹] اور جھوٹا الزام لگانے والے کو بددعا دی گئی ہے [۱۰] اکثر منتروں میں رشیوں نے دیوتاؤں سے دعا مانگی ہے کہ ہمیں اچھے راستے پر چلاؤ -

---

[۱]—رگ وید ' ۷ ' ۴ ' ۶۰ -

[۲]—رگ وید ' ۱ ' ۱۵۲ ' ۱ -

[۳]—رگ وید ۵ ' ۶۳ ' ۱ -

[۴]—رگ وید ۷ ' ۶۶ ' ۱۳ -

[۵]—رگ وید ۷ ' ۶۶ ' ۱۰ -

[۶]—رگ وید ۴ ' ۴۵ ' ۴۳ وغیرہ -

[۷]—رگ وید ۴ ' ۳۰ ' ۱ ' ۲ ' ۳ — ۶ ' ۶۷ ' ۵ — ۸ ' ۴۱ ' ۷ — ان کے علاوہ رگ وید ۸ ' ۲۵ ' ۷ ' ۸ — ۱۰ ' ۶۳ ' ۴ اور ۸ — وغیرہ بھی دیکھئے

[۸]—رگ وید ۵ ' ۴۴ ' ۳ — ۵ ' ۶۳ ' ۱ -

[۹]—مثلاً رگ وید ۱ ' ۱۴۷ ' ۵ — ۱۰ ' ۹ ' ۸ -

[۱۰]—رگ وید ۷ ' ۱۰۴ ' ۸ ' ۹ .

مذھبی اصول اور اس کے معیار کے سلسلۂ بیان میں رگ وید کے

مذھبی معتقدات

مذھبی معتقدات کا بہت سا ذکر ھوچکا ھے ' لیکن اس موضوع کو مکمل کرنے کے لئے کچھ اور بتانا بھی ضروری ھے - رگ وید میں ۳۳ دیوتا مانے گئے ھیں ' لیکن وہ سب ایک درجے کے نہیں ھیں ' بعض زیادہ بزرگی اور اثر رکھتے ھیں اور بعض کم -

دیوتا

سب سے بڑے دیوتا تین معلوم ھوتے ھیں - اندر ' جس کے لئے ۲۵۰ منتر ھیں ' اگن جس کے لئے تقریباً ۲۰۰ منتر ھیں اور سوم ' جس کے لئے ۱۰۰ سے زائد منتر ھیں - دیو ' اور پرتھوی چھ منتروں میں سب کے ماں باپ بتلائے گئے ھیں ' بارش کا دیوتا پرجنّیہ کے لئے اور پرلوک کے دیوتا یم کے لئے تین تین منتر ھیں - سوریہ خود ایک بڑا دیوتا ھے اور اس کی بھی بہت سی صورتیں ھیں ' اس کے ایک جزوی سوتر کی عبارت میں وہ مشہور ساویتری یا گایتری منتر ھے جو ھندؤں میں آج تک پڑھا جاتا ھے [۱] - پوشن بھی سوریہ کا ایک جزو ھے ' جو سب کو بڑھاتا ھے - وشنو کے بارے میں کہا گیا ھے کہ وہ تین چھلانگ بھرتا ھے ' جس سے قیاس کیا جاتا ھے کہ وہ بھی سوریہ کی ایک بدلی ھوئی صورت ھے - رگ وید میں وہ بہت چھوٹے درجے کا دیوتا ھے ' لیکن اُس زمانے کے بعد جب پرانوں نے اُسے پرمیشر بنا دیا تو اُس کی چھلانگوں کی بنیاد پر بلی بامن کی کتھا تیار ھوئی - رگ وید میں دیو کی لڑکی اور پربھا کی دیوی اُشا کی خوبصورتی کی تعریف دلکش شاعری میں کی گئی ھے - دنیا کی نیچرل شاعری اور عاشقانہ شاعری کا یہ پہلا نمونہ ھے اور بڑے ھی معرکے کا ھے ' آشون بھی دیو کے لڑکے ھیں وہ ھمیشہ جوان اور خوبصورت رھتے ھیں اب تک

---

[۱]—رگ وید ۳ ' ۶۲ ' ۱۰ -

جتنے دیوتا گنائے گئے ہیں ان میں سے اندر ، اگن اور پرتھوی کو چھوڑ کر باقی سب کے سب آسمان (یا خلا) کے ہیں ، وہیں اوپر وہ رہتے ہیں اور وہیں سیر کرتے ہیں ، ان کے علاوہ متعدد دیوتا ہوا کے بھی ہیں - ان میں اندر سب سے زیادہ با اقتدار ہیں - رگ وید میں بار بار کہا گیا ہے کہ اندر ، ورت سے لڑائی کرکے اُسے شکست دیتا رہتا ہے ، بیشمار مذہبی کہانیوں کی طرح اس کی بنیاد میں بھی مناظر قدرت ہیں - ورت کو شکست دینے کا اصل مفہوم اتنا ہی ہے کہ اندر بار بار بادلوں کو چھید کر پانی برساتا ہے ، ردر یاشیو کا نام صرف تین چار منتروں میں آیا ہے ، وہ زندگی کو بڑھاتا ہے ، لیکن اُس وقت اُس کی اہمیت زیادہ نہ تھی ، ردر کا لڑکا مرت ، بڑا مہیب اور متوالا تھا ، وایو ، یا ہوا بھی ردر کی طرح زندگی کو بڑھانے والا دیوتا ہے ، زمین کے دیوتاؤں میں خود پرتھوی ہی دیوتا ہے ، اگنی ، خاص گھر کا دیوتا ہے ، سوم ، سوم رس کا دیوتا ہے ، لیکن آگے چل کر سوم کا مفہوم چاند ہوگیا - نویں منڈل کے سب منتر اور باقی منڈلوں کے بھی تھوڑے سے منتر سوم کی تعریف میں کئے گئے ہیں - دیوتاؤں کے علاوہ ، سمندر ، اور سرسوتی وغیرہ ندیوں کی اور درختوں ، پہاڑوں وغیرہ کی تعریف بھی کہیں کہیں دیوتا کی طرح کی گئی ہے [۱]

دیوتاؤں سے تعلقات

رگ وید میں یہ مانا گیا ہے کہ دھرم آتما ، دیوتاؤں کے عالم میں جاتے ہیں اور گنہ گار نرک میں جاتے ہیں [۲] لیکن جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں تناسخ کا اصول رگ وید کے پہلے نو منڈلوں میں نہیں ہے ، ابھی ریاضت کا بھی

[۱]—دیوتاؤں کے لئے رگ وید کا کوئی سا منڈل یا منتر دیکھئے -

[۲]—رگ وید ، ۴ ، ۱۲ ، ۵ — ۴ ، ۵ ، ۵ — ۷ ، ۱۰۴ ، ۳۰ وغیرہ -

کوئی ذکر نہیں ہے ' دیوتاؤں کے لئے پرارتھنا ' پوجا ' اور یگیہ کا قاعدہ تھا ' لیکن زندگی کا تصور اس قدر پر کیف تھا کہ ابھی کسی کو ریاضت کرنے کا خیال نہیں آیا تھا ' دیوتاؤں کی طرف سے بھی ابھی تک اتنا خوف و دہشت کا خیال نہ تھا جتنا محبت اور دوستی کا خیال تھا مثلاً ایک رشی اگنی کو دوست اور باپ کہتا ہے [۱] دوسرا رشی کہتا ہے کہ پنچوں کے فائدے کے لئے اگنی ہر ایک گھر میں قیام کرتا ہے وہ جوان ہے ؛ عقلمند ہے ' گھر کا ہے اور ہمارا بہت قریبی عزیز ہے [۲] دوسری جگہ، کہا گیا ہے کہ اگنی مہربانی کرنے والا دوست ہے ' باپ ہے ' بھائی ہے ' لڑکا ہے ' سب کا پرورش کرنے والا ہے [۳] اور منتروں میں اگنی کو گھر کا مالک کہا گیا ہے [۴] ایک رشی کہتا ہے کہ اب ہم منتر گا چکے ' ہمارے گھر میں اگنی ' ایلچی کی طرح قیام کرے ' [۵] اور دیوتاؤں کے بارے میں بھی اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا گیا ہے - ایک رشی کہتا ہے کہ اے اندر ' باپ کی طرح تم ہماری بات سنو [۶] بعض بعض رشی دیوتاؤں کو اپنا محبوب سمجھتے ہیں [۷] ایک رشی سوم کو بڑا محب سمجھتا ہے [۸] ایک منتر میں یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ جو دیوتاؤں سے محبت کرتا ہے اُس سے دیوتا بھی محبت کرتے ہیں [۹] ادتھّوں

---

[۱]—رگ وید ۱، ۳۱، ۱۶ —
[۲]—رگ وید ۷، ۱۵، ۱، ۲، ۷ —
[۳]—رگ وید ۱، ۹۴، ۱۵ — ۲، ۱، ۹ — ۶، ۱، ۵ —
[۴]—رگ وید ۵، ۱، ۵ — ۵، ۸۰۶ — ۸، ۴۹، ۱۹ —
[۵]—رگ وید ۵، ۶ — ۸ —
[۶]—رگ وید ۱، ۱۰۴، ۹ —
[۷]—رگ وید ۶، ۲۵، ۱ — ۸، ۴۷، ۲ —
[۸]—رگ وید ۸، ۶۸، ۷ —
[۹]—رگ وید ۴، ۲۳، ۵، ۶ —

بلکہ تمام دیوتاؤں کی جانب اشارہ کرکے کہا گیا ہے کہ تم سچ مچ ہمارے عزیزہو ، ہم پر مہربانی کرو [۱] -

تفریح و تفنن

محبت اور مسرت کے عالم میں آریہ لوگ اطمینان کی زندگی بسر کرتے تھے ، دوسرے عالم کی بہت فکر نہ تھی ، ریاضت کا کوئی خیال نہ تھا ، کھانے پینے کی کوئی روک ٹوک نہ تھی ، گوشت خوری کا رواج سب میں جاری تھا ، شراب اور سوم رس خوب پیا جاتا تھا - جرمنوں کی طرح ہندو آریہ بھی جوا بہت کھیلتے تھے [۲] ناچ اور گانے کا بہت شوق تھا ، کھلے میدانوں میں عورت اور مرد بہت شوق سے ناچتے تھے ، فن موسیقی کو بہت ترقی ہوچکی تھی ، ستار ، بانسری اور ڈھول وغیرہ رائج تھے [۳] اور بھی بہت سے دل بہلاؤ کے سامان تھے ، مثلاً ، رتھوں کی دوڑ اکثر ہوتی تھی اور اُس میں بڑا لطف آتا تھا [۴] سب لوگوں کو خصوصاً عورتوں کو ندیوں اور تالابوں میں نہانے کا بہت شوق تھا [۵] رگ وید کے زمانے میں جیسی مسرت اور مجلسی آزادی تھی ویسی کبھی ہندوستان میں نہیں دیکھی گئی ، اس معاملے میں آریوں نے آگے چل کر دوسرا راستہ اختیار کیا ، لیکن فرقے اور تنظیم کے معاملے میں وہ رگ وید ہی کی

---

[۱]—رگ وید ، ۸ ، ۴۷ ، ۲ — ۲ ، ۲۹ ، ۴ — ان کے علاوہ دیکھئے رگ وید ۳ ، ۵۳ ، ۵ — ۴ ، ۲۵ ، ۲ — ۸ ، ۳۵ ، ۱۸ وغیرہ —

[۲]—رگ وید ، ۲ ، ۱۲ ، ۴ — ۱۰ ، ۳۴ ، ۱۸ —

[۳]—رگ وید ۱ ، ۱۹۲ ، ۴ — ۱ ، ۲۹ ، ۳ — ۷ ، ۵۸ ، ۹ — ۸ ، ۲۰ ، ۲۲ — ۹ ، ۱ ، ۸ — ۵ ، ۲۲ ، ۱۲ —

[۴]—رگ وید ، ۸ ، ۶۹ ، ۴ — ۱ ، ۶۰ ، ۵ — ۹ ، ۳۳ ، ۵ —

[۵]—رگ وید ، ۵ ، ۸۰ ، ۵ — ۹ ، ۶۹ ، ۴ —

لکیروں کو پیٹتے رہے ' سیاسی تنظیم میں بھی وہ بہت کچھ اُسی راستے پر رہے جسے پہلے ویدک آریوں نے نکالا تھا -

سلطنت کا انتظام

سلطنت کے انتظام کے متعلق لکھنے کے لئے رگ وید میں کافی مثال نہیں ہے ' لیکن ایدھر اودھر کے بیانات کو جمع کرکے تھوڑا سا حال لکھا جا سکتا ہے ' رگ وید میں اکثر راجہ کا ذکر آیا ہے ' معلوم ہوتا ہے کہ راجہ موروثی ہوا کرتا تھا ' یعنی ایک ہی خاندان سے راجہ کا انتخاب ہوا کرتا تھا [۱]

راجہ

راجہ کے تقرر کا رواج کیسے نکلا ' اس کے بارے میں رگ وید کچھ نہیں کہتا ہے ' لیکن اتیرے برھمن اور تیتریہ برھمن میں دو پرانی کہانیاں ہیں جو تاریخ پر بہت روشنی ڈالتی ' اتیرے برھمن میں کہا گیا ہے کہ ایک دفعہ دیوتاؤں اور راکششوں میں لڑائی ہوئی..............راکششوں نے دیوتاؤں کو شکست دے دی..........دیوتاؤں نے کہا کہ ہم لوگوں نے اپنے میں راجہ نہ کھلے کے باعث شکست کھائی - ہمکو راجہ بنانا چاہئے - (راجا نم کروامہے)

راجگی کی ابتدا

اس تجویز پر سب لوگ راضی ہوگئے [۲] تیتریہ برھمن کہتا ہے کہ ایک مرتبہ دیوتاؤں اور راکششوں میں لڑائی ہوئی ' پرجاپت نے اپنے بڑے لڑکے اندر کو چھپا دیا کہ کہیں طاقت ور راکشش اسے مار نہ ڈالیں ' اسی طرح کیدھو کے لڑکے پرلادہ نے اپنے لڑکے وروچن کو چھپا دیا کہ کہیں دیوتا اُسے مار نہ ڈالیں' دیوتاؤں نے پرجاپت

---

[۱]—رگ وید ۴ ' ۱ ' ۱۲ ' ۱۰ —

[۲]—ایتریہ برھمن ۱ ' ۱۴ —

کے پاس جاکر کہا کہ بغیر راجہ کے لڑائي کرنا ناممکن ہے - یکیہ کرکے انہوں نے اندر سے راجہ ہونے کی درخواست کی [۱] ان دونوں خیالات سے معلوم ہوتا ہے کہ آریوں میں ابتدا ہی سے یہ عقیدہ تھا کہ لڑائی کی ضرورتوں سے راجہ کی تخلیق ہوئي ' آجکل کے اہل علم کی تحقیقات سے بھی یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ لڑائی میں قوتوں کو یکجا کرنے کے لئے ایک سرگروہ رکھنے کی ضرورت سے دنیا میں سلطنت یا راجگی کی ابتدا ہوئی ' معلوم ہوتا ہے کہ آپس میں اور غیر آریوں سے لڑائی ہونے کے باعث راجاؤں کی ابتدا ہوئی تھی اور مسلسل لڑائیوں کے قائم رہنے کے سبب سے یہ رواج مستقل ہو گیا تھا ' دوسرے آپس کے جھگڑوں کے فیصلے کے لئے بھي راجہ کی ضرورت تھی ' تیسرے سوسائیٹی کے اُن کاموں کے انتظام کے لئے بھي ایک راجہ کی ضرورت تھی جن میں بہت سے آدمیوں کی امداد کی ضرورت تھی ' رگ وید میں منتروں اور آگن دیوتاؤں نے اپنے راجگی کے معاملے میں جو باتیں کہی ہیں اُن سے نتیجہ نکلتا ہے کہ اس دنیا کے راجہ بہت شاندار ہوتے تھے ' امن اور انتظام قائم رکھتے تھے ' اور لوگ اُن کے احکام کی تعمیل کرتے تھے [۲]-

راجہ کا طرز معاشرت اور فرائض

پروں کا راجہ قرس دسیو کہتا ہے کہ " — — — دیوتا مجھے ورن کے کاموں میں شامل کرتے ہیں — — — میں راجہ ورن ہوں ' دیوتا مجھے وہ طاقت دیتے ہیں ' جن سے راکششوں کی تباہی ہوتی ہے — — میں اندر ہوں ' میں "ورن ہوں [۳]

[۱] — تیتریہ برهمن ۱ ' ۵ ' ۹ —

[۲] - رگ وید ' ۳ ' ۴۳ — ۵ ' ۴۹ ' ۱ — ۷ ' ۶۴ ' ۲ — ۸ ' ۵۶ ' ۱ — ۶۷ ' ۱ — وغیرہ رگ وید ۲ ' ۲۷ ' ۱۰ — ۲ ' ۲۷ ' ۱ — ۵ ' ۶۲ ' ۳ — ۵ ' ۸۵ ' ۳ — ۶ ' ۷۰ ' ۱ — ۷ ' ۸۶ ' ۱ — ۱ ' ۷ ' ۸۷ — بھي دیکھئے -

[۳] — رگ وید ' ۴ ' ۴۲ —

— — — اس سے بھی ظاہر ہے کہ راجاؤں کا منصب بہت بلند تھا اور وہ اپنے کو دیوتاؤں کے برابر سمجھتے تھے ، جو لوگ راجہ کا حکم نہیں مانتے تھے ، اُن پر قوت کا مظاہرہ کیا جاتا تھا [۱] لیکن زیادہ تر لوگ خود ہی راجہ کا حکم مانا کرتے تھے ، ایک راجہ کا تذکرہ ہے جو آرام و اطمینان سے اپنے محل میں رہتا تھا اور جس سے رعایا محبت کرتی تھی [۲] -

راجہ کا فرض تھا کہ رعایا پر مہربانی رکھے مثلاً راجہ لوگوں کو تحائف دیتا تھا [۳] جہاں اگنی کو گاؤں کا حفاظت کرنے والا کہا گیا ہے وہاں یہہ مطلب معلوم ہوتا ہے کہ گاؤں کی حفاظت کرنا راجہ کا فرض تھا [۴] ایک رشی کہتا ہے کہ دیوتا اُس راجہ کی حفاظت کرتے ہیں جو حفاظت چاہنے والے برہمن کی مدد کرتا ہے [۵] دوسری جگہہ کہا گیا ہے کہ سوم یومان راجہ کی طرح فوجوں کے اوپر بیٹھتا ہے [۶] جس سے ظاہر ہے کہ فوجوں پر حکمرانی کرنا راجہ کا فرض تھا ، اندر ایک کے بعد دوسری لڑائی لڑتا ہے اور ایک کے بعد دوسرے پُر (یعنی مٹی کے قلعے) کو توڑتا ہے [۷] اگنی بھی قلعے اور خزانے پر قبضہ کرتا ہے [۸] یہی کرنا راجہ کا فرض تھا ، راجے بڑی شان سے رہتے تھے ،

---

[۱] —رگ وید ، ۷ ، ۶ ، ۵ — ۹ ، ۷ ، ۵ —
[۲] —رگ وید ، ۴ ، ۵ ، ۸ —
[۳] —رگ وید ، ۱ ، ۶۷ ، ۱ —
[۴] —رگ وید ۱ ، ۱۴۴ ، ۱ —
[۵] —رگ وید ۴ ، ۵۰ ، ۸ ، ۹ —
[۶] —رگ وید ۹ ، ۷ ، ۴ —
[۷] —رگ وید ۱ ، ۵۳ ، ۷ — ۷ ، ۱۸ — وغیرہ -
[۸] —رگ وید ۳ ، ۱۵ — ۴۷ — ۴ ، ۲۷ ، ۱ — وغیرہ -

یہ قیاس رگ وید کے اُن منتروں سے ہوتا ہے جہاں راجہ متر اور ورن کے ہزار کھمبے والے مضبوط اور اونچے محل پر خیال آرائی کی گئی ہے [۱] یہ بھی کہا گیا ہے کہ راجاؤں کی طرف دیکھنا مشکل ہے، وہ سونے کي طرح معلوم ہوتے ہیں [۲] اس سے قیاس ہوتا ہے کہ وہ سنہرے اور بہت ہی چمکیلے کپڑے پہنتے تھے جیسا کہ ضروري تھا، انتظامی معاملات میں بہت سے کام کرنے والوں سے مدد ملتی تھی -

پروہت

یہ ہم کہہ چکے ہیں کہ پروہت راجہ کے ساتھ رہتا تھا اور بہت اثر رکھتا تھا، رگ وید میں اگنی کو بڑا پروہت اور لڑائی میں مدد کرنے والا مانا گیا ہے [۳] دوسري جگہ متر، ورن، اگنی اور آدتیوں کے ایلچیوں اور ہرکاروں کا ذکر ہے جو سچے، عقلمند اور کامل الفن تھے اور جو چاروں طرف دیکھ بھال کرتے تھے، خبریں لاتے تھے اور حفاظت کا انتظام کرتے تھے [۴] ان خیالات کی بنا پر وہ لوگ راجہ کے عمال معلوم ہوتے ہیں جن سے راجہ اس طرح کے کام لیا کرتے تھے، کئی جگہ سنانی (فوج کے سردار) کا ذکر ملتا

سنانی

ہے جو فوج کا سردار تھا [۵]، جس کو راجہ مقرر کیا کرتا تھا، ویدک لٹریچر میں گرامنڑي کا بھی ذکر آیا ہے گرام کے لفظ کے معني جھتھ کے ہیں جو سنسکرت لٹریچر میں اکثر ملتا ہے، شاید بہت پہلے جب آریہ اپنے مویشیوں کو لیکر ادھر اُدھر

---

[۱]—رگ وید ۲، ۴۱، ۵ — ۷، ۸۸ — ۵ —

[۲]—رگ وید ۱، ۱۸۵، ۸ — ۸، ۶، ۳۸ —

[۳]—رگ وید ۱، ۴۴، ۱۰ — ۳، ۲، ۸ —

[۴]—رگ وید ۷، ۶۱، ۳ — ۱، ۲۵، ۳ — ۶، ۶۷، ۵ — ۷، ۶۳، ۳ — ۴، ۴، ۳ — ۸، ۴۷، ۱۱ —

[۵]—رگ وید ۷، ۲۰، ۵ — ۹، ۹۶، ۱ —

گھوما کرتے تھے اور کسی ایک جگہہ پر بہت دن تک نہ رہتے تھے تو اُس وقت ہر گھومنے والے گروہ کو گرام کہتے تھے' کھیتی کا رواج بڑھنے پر جب یہ گرام ایک خاص جگہہ پر بس گیا تو یہ بستی بھی گرام کہلانے لگی' بستی کے معنوں میں گرام یا گاؤں اب تک استعمال کیا جاتا ہے - گاؤں کا مکھیا یا اگوا گرامنی کہلاتا تھا' وہ موروثی حق دار ہوتا تھا' یا گاؤں کے رہنے والے اُس کا انتخاب کرتے تھے یا پھر راجہ اُس کو مقرر کرتا تھا - یہ ٹھیک ٹھیک نہیں کہا جاسکتا' شاید تینوں رسمیں تھوڑی تھوڑی رائج تھیں کچھہ بھی ہو گرامنی کا درجہ بہت اونچا تھا' وہ راج کے خاص عہدہ داروں میں گنا جاتا تھا' رگ وید میں کہیں کہیں ورج پت کا لفظ بھی آیا ہے' لیکن اس کے معنی گرامنی ہی معلوم ہوتے ہیں -

گرام

گرامنی

ورج پت

رگ وید کے زمانے میں' راجہ یا اس کے عمال بےخوف نہ تھے' ان کو دھرم کے مطابق انتظام کرنا پڑتا تھا اس کے علاوہ پبلک کے بھی سیاسی حقوق تھے' ویدک لٹریچر میں سبھا اور سمتی کا ذکر بہت جگہہ آیا ہے' ان کی اصل صورت کے بارے میں ابھی تک اہل علم کی جماعت میں اختلاف ہے' لڈوگ کی رائے ہے کہ سمتی میں سب لوگ رہتے تھے لیکن سبھا میں صرف بڑے آدمی یعنی مگھوں یا برہمن ہی بیٹھتے تھے - سِمَر کی رائے ہے کہ سبھا تو گاؤں کے لوگوں کی تھی اور سمتی عوام کی' ہیلی برانت' میکڈانلڈ اورکیتھہ کی رائے ہے کہ دونوں میں کوئی خاص فرق نہ تھا' سمتی کا

سبھا یا سمیتی

مطلب پبلک سے ھے اور سبھا کا بیٹھنے کی جگھہ سے ' لیکن اتھر وید میں سبھا اور سمتی کو پرجا پت کی دو لڑکیاں کہا گیا ھے [۱] - جس سے معلوم ھوتا ھے کہ یہ دونوں ادارے ایک دوسرے سے ملتے جلتے تھے ' لیکن الگ الگ تھے ' رگ وید میں ایک تیسرا لفظ ویدتہ بھي کئی بار آیا ھے جسکا مطلب کہیں تو مذھبی ' کہیں عام و معمولي ' کہیں فوجي جتھا ھے ؛ کہیں مکان کہیں یگیہ اور کہیں عقل وغیرہ ھے ' ویدتھہ لفظ کے استعمال سے تو کہیں ان اداروں کے بارے میں کوئی خاص بات نہیں معلوم ھوتی لیکن سبھا اور سمتی سے اچھی طرح ثابت ھوتا ھے کہ یہاں لوگ ملکر تمام ضروری معاملات پر غور کرتے تھے ؛ قاعدے بناتے تھے سیاسی اصول قائم کرتے تھے اور پیچیدہ مقدموں کا فیصلہ کرتے تھے - سب لوگ یہاں

فرائض

بحث کرسکتے تھے اور معاملات سلطنت میں اپنی عقل کي مطابق حصّہ لے سکتے تھے ' یہاں راجہ بھی آتا تھا اور کرسي صدارت کو زیب دیتا تھا - ممکن ھے کہ ایک راجہ کے مرنے پر دوسرے کا انتخاب سبھا یا سمتی میں ھوتا ھو ' لیکن سب تذکروں کا مقابلہ کرنے سے یہہ زیادہ ممکن معلوم ھوتا ھے کہ راجہ عام طور پر موروثي ھوتا تھا ' لیکن پبلک کے سامنے قاعدہ کے مطابق منظوري لیجاتی تھی ' رگ وید کی سمتی قدیم یونان ' روم اور جرمني کي سبھاؤں سے ملتي جلتی ھے -

رگ وید کے زمانے میں سلطنت کی جانب سے کون کون سے تکس لئے

ٹکس

جاتے تھے ' اسکا ذکر بہت کم ملتا ھے ' معلوم ھوتا ھے کہ ٹیکس بہت کم تھا ' شاید راجہ کے پاس بہت سي زمین تھی ' جسکی آمدنی سے سلطنت کا بہت سا خرچ چلتا تھا ' شاید اپنی

---

[۱]—اتھر وید ۷ ' ۱۲ ' ۱ —

آمدنی سے کچھہ حصہ لوگ راجہ کو دیتے تھے' ایک جگہ پر کہا گیا ہے کہ جیسا راجہ امیروں کو کھاتا ہے ' اُسی طرح اگنی جنگلوں کو کھاتا ہے [۱] اس سے قیاس ہوتا ہے کہ امیروں سے زیادہ ٹیکس لیا جاتا تھا -

انصاف

انصاف کے متعلق بھی رگ‌وید سے بہت کم پتہ چلتا ہے ' شاید بہت سے جھگڑوں کا فیصلہ خاندان کے مکھیا کردیتے تھے' رگ وید میں جوشت وا‌ے' ویرویہ الفاظ آئے ہیں [۲] اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ انصاف کے اصولوں میں مختلف فرقوں کی زندگی کی قدر و منزلت ملحوظ رہتی تھی' آگے چلکر دھرم سوتروں میں سلسلہ‌وار بتایا گیا ہے کہ فلاں کو مارنے سے اتنی گائیں دینی پڑینگی اور فلاں کے لئے اتنی - اس سے خیال ہوتا ہے کہ رگ وید کے زمانے میں بھی کچھہ ایسا ہی قاعدہ جاری تھا - لیکن کچھہ خطاؤں کے لئے اور طرح کی بھی سزائیں دیجاتی تھیں' رگ وید میں دیوتاؤں اور آدمیوں کے جیل خانے کا ذکر ہے [۳] جس

سزا

سے قیاس ہوتا ہے کہ کچھہ خطاؤں کے لئے اس زمانے میں بھی جیل خانے کی سزا دیجاتی تھی' دو منتر میں ذکر ہے کہ گاؤں والوں کی سو بھیڑ مار ڈالنے کے جرم میں ریجراس کو اسکے باپ نے اندھا کر دیا [۴] اس ذکر سے کوتمبک ڈنڈ [خانگی سزا] کی رسم کی تائید ہوتی ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کبھی کبھی جسمانی سزا بھی دیجاتی تھی' دیرگھہ تمس کی کتھا ایسا سے قیاس ہوتا ہے' لیکن پورا ثبوت نہیں ملتا کہ جرم ثابت کرنے کے لئے پانی اور آگ سے بھی

---

[۱]—رگ وید ۱ ' ۶۵ ' ۴ -

[۲]—رگ وید ۲ ' ۳۲ ' ۴ - وغیرہ -

[۳]— رگ وید ۴ ' ۱۲ ' ۵ -

[۴]— رگ وید ۱ ' ۱۱۶ ' ۱۶ ' ۱ ' ۱۱۷ ' ۱۷ -

امتحان کا عمل جاری تھا یا نہیں [۱] کئی جگہہ مدہ مشی کا لفظ آیا ھے جس سے معلوم ھوتا ھے کہ بہت سے جگہڑوں کا فیصلہ پلچوں کے ذریعہ ھو جاتا تھا ، کبھی کبھی چور ، اناج ، کپڑے ، روپیہ پیسہ اور گائے وغیرہ چرا لیجاتے تھے ، پتہ لگنے پر اُن کو سزائیں دیجاتی تھیں [۲] -

رگ وید میں راجنیہ لفظ کا استعمال دومعنوں میں ھوا ھے ، ایک تو

راجنیہ

راجہ اور دوسرے زمیندار - معلوم ھوتا ھے کہ راجہ کے ارد گرد بہت سے زمیندار تھے جو راجہ کا اقتدار تسلیم کرتے تھے لیکن خاندان کے لحاظ سے خود کو راجہ سے کم نہیں سمجھتے تھے - ارو جو سلطنت کے دئے ھوے حقوق سے فائدہ اٹھاتے تھے -

سنہشاہ

کئی جگہ سمراج کا لفظ بھی آیا ھے ، جس سے معلوم ھوتا ھے کہ بہت سے معمولی راجے کسی ایک راجہ کا اقتدار تسلیم کر لیتے تھے ، اُس وقت یہ راجہ سمراٹ (شہنشاہ) کہلانے لگتا تھا [۳] -

---

[۱]—رگ وید ۱ ، ۸ : ۱ ، ۲ وغیرہ -

[۲]—رگ وید ۱ ، ۱۶۵ ، ۱ — ۱ ، ۳۲ ، ۲ ، ۳ — ۸ ، ۲۹ ، ۶ — ۴ ، ۲۹ ، ۵ -

[۳]—میکڈانل اور کیتھہ ، انڈکس ۲ صفحہ ۳۳۳ -

بنارسی پرشاد

طبقۂ اُمراء عہد سلطانی میں

قرون وسطی کے سیاسی نظام پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ تین طبقوں پر مشتمل تھا - اول سلطان اور اس کی اولاد، دویم امرا، سوم حکام اعلیٰ و ادنیٰ - ان تینوں طبقوں میں دوسرا بلحاظ وقعت و ثروت کے اہم ترین تھا - حقیقت تو یہ ہے کہ سلطنت دھلی کی تاریخ میں سلاطین اور خاص کر ایسے جو اس خطاب کے فی الواقع شایاں ہیں، اُن چمکدار ستاروں اور سیاروں کے مثل ہیں جو طلوع ہوکر تھوڑی دیر کے لئے لوگوں کو حیرت میں ڈال کر غایب ہو جاتے ہیں - اس میں کلام نہیں کہ قطب الدین ایبک، شمس الدین التمش، غیاث الدین بلبن، علاالدین خلجی، محمد تغلق، سکندر لودی وہ مشہور و معروف ہستیاں ہیں جن کے کارنامے حشر تک کالعدم ہونے والے نہیں - مگر تین سو سال کے طول طویل عرصہ میں یہ پانچ یا چھ نام ستون راہ سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتے - اس کے علاوہ یہ لوگ بھی تو امیری سے ھی ترقی کرکے تاج داری تک پہنچے تھے - پس اگرچہ سلسلۂ سلطنت کو قائم رکھنے کا سہرا ان کے سر ہے لیکن اس معنی میں نہیں کہ وہ سلطان تھے بلکہ اس حیثیت سے کہ وہ امیر تھے اور ایسے امیر کہ جنھوں نے کارھاے نمایاں کر دکھائے، یہاں تک کہ لقب سلطانی کے اھل ثابت ہوئے -

موجودہ دور کے مبصرین کا از منہ وسطی کے تواریخی کتب پر یہ اعتراض ہے کہ یہ عوام الناس کے حالات سے خالی ہیں - جمہوریت کی اٹھتی ہوئی لہر کو دیکھتے ہوئے یہ اعتراض کسی حد تک جائز تصور کیا جاسکتا ہے

مگر قرون وسطی کی فضا کے لحاظ سے غیر ضروری ہے - جب کہ سیاسی امور میں عوام‌الناس کا کوئی دخل نہ تھا - جب کہ ہر قسم کے قوانین کی پابندی کرنا ان کا فرض تھا اور حاکم کی فرماں‌برداری کرنا ان کا شیوہ، پھر بھلا اگر مورخین نے ان کے حالات کو نظر انداز کر دیا تو اس میں گلے کی کیا بات ہے - تعجب تو یہ ہے کہ طبقۂ امرا کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے بھی مورخوں نے ان کے حالات قلمبند کرنے میں نہایت ہی اختصار سے کام لیا ہے - اصل میں تو قرون وسطی کی تاریخ امیروں کے کارناموں سے بھری ہوئی ہونا چاہئے تھی نہ کہ سلاطین کے حالات سے کیونکہ فی نفسہ امیر ہی وہ لوگ تھے جنہوں نے سلطنت کی بنیاد کو پائدار و مستحکم بنایا - یہ اراکین سلطنت کہلاتے تھے - ان میں اور سلطان میں لازم و ملزوم کا علاقہ تھا -

پس طبقہ امرا کی امتزاجی ہیئت، اس کی دستوری حیثیت، اس کا سیاسیات پر اثر اور اس کی اقتصادی و معاشرتی اہمیت پر کسی قسم کی بحث بعید از دلچسپی نہ ہوگی - مگر قبل اس کے کہ ان مسائل پر کوئی مزید روشنی ڈالی جائے یہ بتانا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ فرداً فرداً اس طبقہ کے لوگ ایک پایہ کے نہ تھے - بہتوں نے تو اپنی زندگی کا افتتاح غلامی سے کیا تھا اور رفتہ رفتہ ترقی کرکے مناصب اعلی تک پہنچ گئے تھے لیکن اکثر ایسا بھی ہوتا کہ ممالک غیر کے شہزادے افلاس و تنگدستی سے عاجز آکر ہندوستان میں پناہ گزیں ہوتے - جب سلطان کو پتہ چلتا تو وہ ان کو طبقہ اُمرا میں داخل کر لیتا تھا - اس کے علاوہ جب کبھی کوئی فوجی سردار قوت بازو سے تاج و تخت کا مالک بن بیٹھتا تو بمقتضائے موقع و وقت اپنے عزیز و اقربا کو امیر بنا دیتا تھا -

اُس عہد میں سلطان کی بلا مرضی کوئی امیر نہیں بن سکتا تھا - وجہ یہ کہ اس رتبہ کے واسطے فوجی عہدہ کا ہونا نہایت ضروری تھا - اس عہدہ کا عطا کرنا یا نہ کرنا یہ امر خالصاً سلطان کی رائے پر مبنی تھا - اس کے متعلق ایک اور دلچسپ بات ہے اور وہ یہ کہ باوجود اس امر کے کہ کسی شخص کا فوجی عہدہ پر تقرر ہوگیا ہو یہ ضروری نہ تھا کہ وہ فوجی خدمات انجام بھی دے - سرکاری نوکر اور خاص کر ایسا کہ جس کی کچھ قدر و منزلت ہو وہی ہوتا تھا کہ جو فوجی ملازمت میں داخل ہو گیا ہو - حسب دستور یہ عہدے شخصی ہوتے تھے نہ کہ ارثی یہ لازم نہ تھا کہ کسی امیر کا لڑکا اپنے والد کے شغل و خطاب کو پا ہی لے یہ دوسری بات تھی کہ کسی امیر کی خدمات سے خوش ہوکر کوئی سلطان اس کے لڑکے کو اپنے والد کا شغل و خطاب عطا کردے مگر اس کو کرم سلطانی کہتے تھے جس کا کہ کوئی علاقہ 'حق' یا دستوری حقوق سے نہ تھا - اس زمانہ میں لفظ 'حق' بالکل مہمل تھا - چنانچہ سلطان کو پوری آزادی تھی کہ کسی امیر کو اس کے عہدے سے معزول کردے اور اس کی تمام جائداد منقولہ و غیر منقولہ ضبط کر لے - امیروں کو ایسے طرز عمل کے خلاف چون و چرا کرنے کی قطعی گنجایش نہ تھی - اس دور میں امیر چار تدریجی درجوں کے ہوتے تھے - درجہ اول کا امیر خاں کہلاتا تھا اور ان میں سب سے اعلیٰ کا خطاب الغ خاں اعظم ہوتا تھا - دوسرے درجہ کے امیر ملک کہلاتے تھے - اور تیسرے درجہ کے امیر کے نام سے منسوب ہوتے تھے - ان کے بعد فوجی افسروں کا نمبر آتا تھا مثلاً سپہسالار ' سرخیل وغیرہ - ہر درجہ کی مناسبت شغل و خطاب ' اور اقطاع سے ہوتی تھی - خطابوں کی تو کوئی انتہا ہی نہ تھی - ہر سلطان اپنی مرضی و خواہش کے مطابق خطاب ایجاد کر لیتا تھا جیسے خواجہ جہاں ؛ خاں جہاں ؛

خانخاناں ، قدر خاں ، عمادالملک ، قوام الملک ، نظام الملک ، اعظم الملک قتلغ خاں ، الغ خاں ، صدر جہان وغیرہ وغیرہ -

دستوری نقطۂ نظر سے امیر تین قسم کے ہوتے تھے اول وہ جن کو یہ عہدہ وراثتاً ملا ہوا تھا - دوسرے وہ جو سلطان الوقت کے بلائے ہوئے تھے اور تیسرے وہ جو نیچے درجے سے رفتہ رفتہ ترقی کرکے اس عہدہ تک پہنچ گئے تھے - عہد سلطنت کے آغاز میں تیسری قسم کے امیروں کی تعداد بمقابلہ اول دو کے زیادہ تھی وجہ یہ کہ فرماں رواؤں کو اپنے غلاموں پر پورا اعتماد تھا وہ ان کی تعلیم و تربیت کے واسطے مناسب انتظام کرتے تھے اور حتی المقدور ان کی آسایش و آرام کا خیال رکھتے تھے - انہیں غلاموں میں سے جو ہونہار ہوتے وہ ترقی کر جاتے تھے اور مالک پر جان نثار کر دینے کے واسطے ہمیشہ کمر بستہ رہتے تھے - محمد غوری نے جو سلوک اپنے غلاموں کے ساتھ کیا وہ شہرۂ آفاق ہے - ان غلاموں نے بھی اپنے کارناموں سے اپنے مالک کی عزت و ناموس کو قایم رکھا -

مگر غلاموں کو امیر بنانے کا دستور عہد سلطنت کے اول حصہ میں ہی زوروں پر رہا - جب تخت نشین ہونے کے بعد قطب الدین ایبک کو اپنا پایہ مستحکم کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی تو اس نے پہلے تو محمد غوری کے باقی ماندہ ہندوی افسروں کے ساتھ صلح کر کے ان کو اپنا مطیع و منقاد بنایا - پھر اس نے بہت سے اور امیر بنائے جن میں بیشتر غلام تھے - ایسے امیروں کی ایک زندہ مثال التمش ہے - قاعدہ یہ تھا کہ جس غلام کو امیر بنانا ہوتا تھا اُسے آزاد کر کے پھر اس کے سپرد اقطاع یا شغل یا سپہ سالاری کرتے تھے - ممکن ہے کہ آرام جس کو کہ آخیر میں سلطان کا اتنا قرب حاصل ہوگیا شروع میں غلام ہی رہا ہو - لیکن اس کا کوئی خاطر خواہ ثبوت نہیں ملتا ہے - جب

قطب الدین کے لاولد مرنے پر تاج وتخت کی وراثت کا سوال پیدا ہوا تو لاهور میں تو کچھ امیروں نے آرام کا ساتھ دیا مگر دهلی میں سپہ سالار اسمعیل امیر داد نے التمش کو بداؤں سے بلا کر تخت نشین کیا لیکن قطبی اور معزی امیروں نے اس کی سخت مخالفت کی حتیٰ کہ بدرجہ مجبوری التمش کو جنگ کرنا پڑی - کچھ تو دهلی کے گرد و نواح میں مارے گئے بقیہ جو آرام کے حمایتی بن کر لاهور سے بڑھے آرہے تھے سلطان نے انکا بھی قلع قمع کر دیا -

قطبی اور معزی امیروں کی تباهی سے التمش کی بہت سی مشکلیں آسان هوگئیں - اب اس کو پوری آزادی تھی کہ اپنے من مانے امیر بنائے - چنانچہ اس نے کیا بھی ایسا هی - اپنی طاقت کو مضبوط بنانے کی غرض سے و نیز اس خیال سے کہ تاج شاهی کی آبرو امیروں سے هی هوتی هے التمش نے ایک نئے طبقے کی تکمیل کی جس میں کہ اس نے چالیس چیدہ چیدہ غلاموں کو شامل کیا اور ان کو چهلگان کے نام سے موسوم کیا - تاریخ هند میں یہ اولین موقع تھا جبکہ کسی فرمانروا نے محض غلاموں هی کو رکن سلطنت بنایا هو - اس میں کلام نہیں کہ التمش کا وزیر اعلیٰ نظام الملک کمال الدین ابو سعید جنیدی و نیز دیگر حکام بالا مثلاً ملک فیروز شہزادۂ خوارزم و ملک جلال الدین شہزادہ ترک غلام نہ تھے مگر اصل میں سلطان نے اپنی قدرت و مکنت کا دار و مدار غلاموں پر هی رکھا - اس کی وفات کے تیس سال بعد تک یہ هی چهلگان امور سلطنت کو انجام دیتے رهے - جو جو کاروائیاں ان سے ظہور میں آئیں انکا مفصل و مشرح حال طبقات ناصری میں درج هے -

مگر غیاث الدین بلبن کی تخت نشینی کے بعد سے چهلگان کا زور کم هو گیا - اس نے انکے گروہ کو تہ و بالا کر دیا اور اس نے امرا کے متعلق

ایک نئے دستور پر عملدرآمد کیا جس کا کہ صاف منشاء یہ تھا کہ کوئی ایسا شخص امیر نہ بنایا جاوے جس کا حسب و نسب صحیح نہو - یہ اصول اس بات کا شاہد ھے کہ بلبن کی سریر آرائی کے قبل کچھ ایسے لوگ طبقہ امراء میں داخل ہو گئے تھے جن کی بے عنوانیوں سے شاہی وقار معرض زوال میں آ گیا تھا - ریحان نے جو کچھ بلبن کے ساتھ سلوک کیا تھا اس کی یاد اس کو بھولی نہ تھی - مزید براں طائفہ چہلگان میں نقائص پیدا ہو گئے تھے - اُنکے درمیان بغض و حسد کی آگ اتنے زوروں سے بھڑک رہی تھی کہ وہ خود اس سے جلکر خاک سیاہ ہوئے جا رہے تھے - اب یہ سلطنت کا بار سنبھالنے کے قابل نہیں تھے اور اندیشہ تھا کہ کہیں ان کی بے اعتنائیوں کی وجہ سے سیاسی نظام کا شیرازہ بالکل درہم برہم نہو جائے - بلبن میں بھلا اتنی تاب کہاں تھی کہ ایسی زبوں حالت کو چپ چاپ دیکھتا رھتا - چنانچہ اس نے تہیہ کر لیا کہ اس طبقے کو خس و خاشاک سے پاک کردے، اس نے اس کام کو نہایت ھی دلیری سے انجام دیا - اس نے اپنے وزیروں کو تاکید کی کہ کسی حالت میں بھی سرکاری ملازمت کے واسطے وہ کسی مجہول النسب کو اس کے روبرو پیش نہ کریں - ایک دفعہ کا ذکر ھے کہ سلطان نے اپنے وزراء سے کہا کہ وہ ایک ایسا آدمی تلاش کر لائیں جو کہ امروھہ کی متصرفی کے قابل ہو اسوقت ملک علاءالدین کشلیخاں امور حاجب تھا اور ملک نظام‌الدین بزغالہ وکیلدر - ان لوگوں نے کمال مہیار کو منتخب کیا اور امروھہ کی متصرفی کے لئے اوسکو سلطان کے سامنے پیش کیا - جس وقت کمال مہیار خاک بوسی کر رھا تھا بلبن نے ملازمین سے کہا کہ اُس سے لفظ مہیار کے معنی دریافت کرو کریں- نے جواب دیا کہ مہیار میرے والد کا نام ھے وہ اصل میں ایک ھندو غلام تھا - یہ سننا تھا کہ سلطان آگ بگولہ ھو گیا اس نے

فوراً ہی دربار برخاست کر دیا اور اپنے وزیروں کو تنہائی میں بلا بھیجا - انکو لعنت ملامت کرنے کے بعد کہا کہ تم لوگوں کو معلوم نہیں ہے کہ میں افراسیاب کے خاندان سے ہوں - اللہ تعلیٰ نے میرے مزاج میں وہ خاصیت پیدا کی ہے کہ میں کسی بد اصل کو سرکاری عہدے پر نہیں دیکھ سکتا ہوں' جسوقت میری نگاہ کسی ایسے شخص پر پڑ جاتی ہے جس کا حسب و نسب صحیح نہو تو غصہ سے میرا جسم کانپ جاتا ہے ' پھر بھلا مجھکو یہ بات کب گوارا ہوسکتی ہے کہ میں کسی بد اصل اور کم ظرف کو سرکاری عہدہ پر مقرر کروں - یہی اصول اس نے اپنے بیٹے بغرا خاں کے ذہن نشیں کرنا چاہا مگر اس میں اسکو خاطر خواہ کامیابی نصیب نہ ہوئی - تاہم جہاں تک ممکن تھا اپنے دور میں اس نے طبقہ امراء کو ایک نئے سانچے میں ڈھالا - قسمت کو کیا کرتا اس کے پوتے کیقباد نے اپنے باوا کی کی کرائی محنت رائگاں کردی - اسی لئے نہ صرف تخت بلکہ جان سے بھی ہاتھ دھوئے -

بلبن خاندان کے زوال کے بعد ایک نئے خاندان کا عروج ہوا - جس کا بانی جلال الدین فیروز خلجی تھا - تخت نشین ہونے سے قبل عرصہ دراز تک وہ غیاث الدین کی خدمت میں رہ چکا تھا - رفتہ رفتہ اُس نے اپنی ایک پارٹی بنائی - سرحدی صوبوں کی محافظت کا کام بلبن نے اُس کے سپرد کر رکھا تھا - برنی کا قول ہے کہ جلال الدین نے اس عہدہ کے فرائض کو ایسی جوانمردی و دلیری سے انجام دیا کہ مغل اُس کا لوہا مان گئے - چونکہ اس کا ایک پیر ہر وقت عرصہ کار زار میں رہا کرتا اس لئے اس کے پاس ایک عمدہ فوج بھی ہمیشہ موجود رہتی تھی - اغلب ہے کہ اُسکی فوج میں زیادہ تر سپاہی اُسی کے ہمقوم ہوں کیونکہ اُس زمانہ میں فوجی ملازمت فرقہ وارانہ اصول پر ہوا کرتی

تھی - ہر امیر اپنے فرقہ کے لوگوں کو اپنی فوج میں بھرتی کر لیا کرتا تھا - یہ کہنا بعید از راستی نہ ہوگا کہ جلال الدین نے اپنے فرقہ والوں ہی کی امداد سے تخت حاصل کیا - حسب دستور اس کو بھی نئے امراء کی ضرورت پیش آئی - اول تو اس کو اپنی پارٹی مضبوط کرنا تھی دوسرے یہ کہ پرانے امیروں پر اعتبار کرنا خالی از خطر نہ تھا - چنانچہ پہلے تو اُس نے اپنے بیٹوں اور بھتیجوں کو اعلیٰ خطابوں سے سرفراز کیا مثلاً اپنے سب سے بڑے لڑکے کو خانخاناں دوسرے کو ارکلیخاں اور تیسرے کو قدر خاں کا خطاب عطا کیا - اپنے بھائی یغرش خاں اور اپنے دو بھتیجوں میں سے علاءالدین کو تو امیر توزک بنایا اور دوسرے الغ خاں کو اخور بک کے عہدہ پر مامور کیا - جلالی دور کے افسران اعلیٰ کی فہرست کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے کچھ تو پرانے لوگ تھے مثلاً وزیر خواجہ خطیرہ - احمد چپ نائب باربک وغیرہ - اور کچھ نئے بھی تھے - اس کے علاوہ ایک اور بات قابل توجہ ہے وہ یہ کہ اس وقت سے ہندی نژاد امراء کی بھی تعداد بڑھنا شروع ہو گئی - باوجود سعی بلیغ کے بلبن اس تحریک کو نہ روک سکا' کیونکہ ضیاءالدین برنی کا نانا سپہ سالار حسام الدین جو کہ غالباً ہندی تھا بلبن کا وکیلدر اور باربک تھا - جلالی دور کے آغاز میں بھی ملک نصیرالدین کہرامی - ملک قطب الدین کیتھلی - ملک تاج الدین کہرامی - ملک تاجو - ملک ہرنمار جو کہ بتدریج ترقی کر کے ان مناصب تک پہونچے تھے بلا شبہہ ہندی تھے - اس سلطان کے دربار میں ہر طرح کے لوگ موجود تھے ' ترکی ' ہندی اور خلجی - اگرچہ برنی نے خلجی امیروں کی کوئی علیحدہ فہرست نہیں دی مگر جس ڈھنگ سے وہ فقرہ ' امرائے خلج ' کو استعمال کرتا ہے اس سے ظاہر ہے کہ ان کی تعداد کافی تھی " سلطان جلال الدین باکوکبہ

بادشاہی و جمعیت ارکان و اعوان ملک و امرائے خلجی و معارف و حشم قدیم ایام ملکی و مخلصان معتمد دولت درون شہر رفت'' (صفحہ ۱۷۷)-

سن رسیدہ بادشاہ کے کانپتے ہوئے ہاتھوں میں عصائے شاہی کا مدت مدید تک رہنا دشوار تھا - چنانچہ جلد ہی اس کے معتمد و معترف بھتیجے علاءالدین نے در پردہ سازش کر کے اپنے مربی و سرپرست کو دار فانی سے عالم جاودانی کی جانب روانہ کر دیا - اور خود تاج و تخت کا وارث بن بیٹھا - سلطان علاءالدین کی نگاہ قہر پہلے پہل طبقہ امراء پر پڑی - اس نے سرکش و باغی لوگوں کو تہ تیغ کیا - باقی کو اپنا مطیع و تابعدار بنایا - جن جلالی امیروں نے رشوت لے کر اپنے آقا کے ساتھ نمک حرامی کی تھی ان کے سر تن سے جدا کر دیئے گئے - سلطان علاءالدین نے بمصداق - ہر کہ آمد عمارتے نوساخت - امیروں کے ایک بالکل نئے طبقے کی ترتیب دی - اگر تاریخ فیروز شاہی میں دی ہوئی فہرستوں کا باہمی مقابلہ کیا جاوے تو یہ صاف ظاہر ہوگا کہ علاءالدین کے امیروں میں ایسوں کی تعداد بہت کم ہے جو گذشتہ دور میں اس درجہ پر سرفراز تھے - اس کے ساتھ ساتھ اس میں بھی شبہہ نہیں کہ اس کے عہد سلطنت میں ہندی نژاد امیروں نے بہت زور باندھا - علاءالدین والی فہرست میں کم از کم سات ایسے نام ہیں جن کے حسب و نسب کی بابت کوئی دوسری رائے قائم ہو ہی نہیں سکتی مثلاً علاءالملک ' قاضی مغیث الدین' قاضی حمید ملتانی ' عین الملک ملتانی ' ملک کافور ہزار دینار ملک نائب ' ملک کافور مرہٹ نائب وکیلدر ' ملک فخرالدین کہلد - یہ بھی ممکن ہے کہ بقیہ ناموں میں بہت سے ایسے ہوں جو کہ ہندی لوگوں نے اپنی اصلیت کو پوشیدہ رکھنے کے لئے رکھ لئے ہوں - دربار میں ہندی مسلمانوں کی ترقی و تربیت کی ایک اور وجہ بھی تھی؛ وہ یہ کہ اول تو وسطی ایشیا

میں مغل ہنگامے نے پرانی تہذیب کو درہم برہم کر دیا تھا - اور چونکہ مغل خود ہندوستان کے سرحدی صوبوں میں لوٹ مار مچائے ہوئے تھے اس لئے ممالک غیر سے اس طرف رخ کرتے ہوئے قابل لوگ گھبراتے تھے - دوسرے یہ کہ جو لوگ آتے بھی تھے وہ زیادہ تر ترک نژاد ہوتے تھے - اور ترکوں کی خلجی دربار میں بڑی بیقدری تھی - جلال الدین کے زمانہ سے ہی ترکوں اور خلجیوں کے درمیان زبر دست کشیدگی رہنے لگی تھی - ترکوں کا یہ خیال تھا کہ خلجی لوگ غاصب ہیں - ہندوستان کی سلطنت کا حق صرف ترکوں کو حاصل ہے - تیسرے سیاسی اصولوں میں کچھ تغیر و تبدل - اگرچہ بظاہر اس نے کوئی ایسا کام نہیں کیا جس سے کہ شریعت اسلام کو دھکا لگتا - لیکن اس کے گفتار و کردار سے باہر کے لوگوں کو شک پیدا ہو جاتا تھا کہ اس نے مذہب اسلام کو ترک کر دیا ہے - مولانا شمس الدین ترک ایک نہایت ہی بے نظیر عالم اور محدث تھے وہ مصر سے خشکی کے راستہ تشریف لائے - جب ملتان پہنچے تو وہاں ان کو پتہ چلا کہ بادشاہ وقت علاءالدین نہ تو نماز پڑھتا ہے اور نہ نماز جمعہ میں شریک ہوتا ہے - یہ سنکر مولانا شمس الدین نے دہلی جانیکا قصد فسخ کر دیا اور اپنے وطن واپس چلے گئے - وہاں سے فارسی میں ایک رسالہ لکھکر علاءالدین کے پاس بھیجا - جس میں تحریر تھا کہ میں دور دراز سفر کی مشقت برداشت کرکے ملتان تک آیا مگر جب میں نے آپ کی اطوار و عادات کا چرچا سنا تو میں سیدھا واپس چلا گیا - مختصر یہ کہ علاءالدین کے دور کے ختم ہوتے ہوتے تقریباً تمام دربار ہندی الاصل امیروں سے بھر گیا تھا - اس کے لئے کسی حد تک تو سلطان خود ذمہ دار تھا کیونکہ آخری وقت میں اس کو قابل اور جہاندیدہ لوگوں سے نفرت ہوگئی تھی اور جی حضوریوں سے انسیت - ایسے لوگ ہندی الاصل جماعت

ھی میں مل سکتے تھے - اس کے علاوہ ملک کافور کو جو رتبہ حاصل ہو گیا تھا اس کی وجہ سے بھی ھندیوں کی تعداد میں اضافہ ہوا کافور نو مسلم تھا اس کو ضرورت تھی کہ اپنے حوصلوں کی تکمیل کے واسطے اپنے ارد گرد اپنے ھی طرح کے لوگوں کو جمع کرے- جب سلطان نے ریاست کی باگ‌ڈور اُس کے ھاتھ میں سونپ دی تو پھر اس کارروائی کا اس کو خوب ھی موقع ملگیا۔

ملک کافور نے علاءالدین کے ساتھ وھی برتاو کیا جو علاءالدین نے اپنے چچا کے ساتھ کیا تھا - مگر زیادتیوں نے اس کے نخل اُمید کو بارآور نہ ھو نے دیا - چنانچہ وہ اپنی سازشوں کا خود ھی شکار ہوا اور اس کو تخت کے بجائے تابوت نصیب ھوا - قطب‌الدین مبارک خلجی میں بھلا ایسا ہوتا کہاں تھا کہ اتنی بڑی سلطنت کے بار کو سنبھال لیتا - بیکس و بے بس ھوکر اس نے اپنی کشتی کو عیش و عشرت کے بحر نا پیدا کنار میں چھوڑ دیا - جیسے اس کے والد نے ایک بد اصل کے ساتھ رشتہ جوڑا تھا ٹھیک اسی طرح قطب‌الدین نے ایک کم ظرف کو اپنا معتمد و صلاح کار بنایا - خسرو خان کی فوری ترقی کیا اس بات کی دلیل نہیں ھے کہ ھندی اصل امیروں کا شاھی دربار میں بول بالا تھا - موقع ھاتھ آتے ھی خسرو خاں نے اپنے پیر نکالے - اپنے پرانے بھائی بندوں کو دھلی بلالیا اور فوج میں بھرتی کر لیا یہی نہیں بلکہ ان کے واسطے شاھی محل میں آمد و رفت کا دروازہ بھی کھول دیا - قطب‌الدین اپنے وزیر پر اتنا فریفتہ تھا کہ بہی خواھان سلطنت کے پیغام آگاھی کو ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیتا - نتیجہ میں اس نے بھی معزالدین کیقباد کی طرح اپنے جان و مال سے ھاتھ دھوئیے - پانچ ماہ تک دھلی کا تخت نو مسلموں کے ھی ھاتھ میں رھا - سلطان ناصرالدین خسرو خاں نے اسلام کو ذلیل و خوار کرنے میں کوئی دقیقہ باقی نہ رکھا - مسجدوں کے طاقوں

میں بت رکھوا دئے اور بتوں کے پیروں تلے قرآن شریف رکھوائے - شاید یہ تھا عوض اُن ذلتوں اور خواریوں کا جو کہ التمش اور اس کے جانشینوں نے هندو مذهب کو اور هندوؤں کو پہونچائی تھیں - گجرات کے برادو شاید ابھی نہ بھولے تھے کہ شمس الدین التمش نے دھار میں مہا کال کے مندر کو نہ صرف مسمار و بے حرمت کیا تھا بلکہ بت کو لاکر دهلی کی جامع مسجد کے دروازہ پر ٹکڑے ٹکڑے کرکے ڈالدیا تھا تاکہ مسلمین اُس پر پیر رکھ کر نکلیں - برادو کسی رذیل قوم کے نہ تھے یہ بات امیر خسرو کے تغلق نامہ سے ثابت ہے -

بسے هندو کہ گویندش برادو شدہ یار از برائے فتنہ او
برادو وصف هندوئیست سرباز کہ هم سرباز باشد هم سرانداز
بوند این طائفہ دربیھش رایاں کہ جاں بازند بر فرمانروایاں

خسرو شاہ کے بے عنوانیوں سے هر چهار جانب سنسنی پھیل گئی - بڑے بڑے امیر مارے دهشت کے کانپنے لگے - لیکن یہ بات سب پر ظاهر تھی کہ جلد هی کوئی انقلاب ظہور پذیر ہونے والا ہے - چنانچہ غازی ملک نے اُس بات کا بیڑا اٹھایا کہ وہ خاندان علائی کے دشمنوں سے بلا انتقام لئے چین نہ لے گا - دوسرے امیروں سے خط و کتابت کرنے کے بعد جب اس کو اطمینان ہو گیا کہ اس کے هم خیال بہت سے لوگ هیں تو اس نے ایک جرار فوج اکٹھا کی - مار کاٹ کرتا ہوا وہ دهلی کے جانب بڑھا مگر اس بھونچال سے خسرو گھبرایا نہیں - اس نے روپیہ کو پانی کے طرح بہایا وہ اپنی فوج لیکر میدان میں آ ڈٹا - ایک بار تو اس نے غازی ملک کے چھکے چھڑوا دئے مگر تقدیر کا غیتا تہا - جیتی جتائی بازی هار گیا - بھاگ کر ایک باغ میں چھپ رہا - تین فاقوں کے بعد بیچارہ جب نکلا تو شاهی انگشتری نے اس کے راز کو طشت از بام کردیا - گرفتار کر کے

غازی ملک کے سامنے لایا گیا - اس کے گناہوں کی سزا اس کو بھگتنا پڑی -

غازی ملک نے علائی امیروں اور بہی خواہوں کو اکٹھا کر کے ایک نہایت ہی زور دار تقریر کی - اتفاق رائے سے امیروں نے اسی کو تخت کا وارث قرار دیا گیا - غیاث الدین کو طبقہ امراء کی نئی ترتیب میں کئی باتوں کا لحاظ رکھنا پڑا - اول تو علائی خاندان کے حامی و مددگار ہونے کی حیثیت سے اس کو یہ ضروری معلوم ہوا کہ پرانے امیروں میں سے بھی کچھ کو اپنے ساتھ رکھے - خاص کر اس وقت تک جب تک کہ اس کا پایا مضبوط نہ ہوجائے - دوسرے یہ کہ ہندی الاصل امیروں کو وہ یکدم معزول نہ کر سکتا تھا کیونکہ ابھی تک اس کو یہ امید نہ تھی کہ باہر سے قابل لوگ کافی تعداد میں آ کر حکومت کا کام چلالینگے - تیسرے اس کو مذہبی اصول ہر وقت سامنے رکھنا پڑتا تھا کیونکہ اس نے مذہب اسلام کے آوازہ کو بلند کیا تھا اور تخت نشینی سے قبل یہ اعلان کیا تھا کہ وہ اسلام کے بجھتے ہوئے چراغ کو از سر نو روشن کریگا - چنانچہ غازی ملک کے امیروں میں وہی بات ملتی ہے جو کہ جلال الدین خلجی کے گروہ میں تھی - فرق صرف اتنا ہے کہ جلال الدین کو سیدھے اور سرکش - قابل اور نالائق میں تمیز نہ تھی برخلاف اس کے غیاث الدین تغلق کو فرداً فرداً ہر امیر کی لیاقت اور اس کے خیالات کا اندازہ تھا یہ ہی وجہ ہے کہ اس نے اپنے امیروں سے کبھی بھی دھوکا نہیں کھایا اور اسکو حکومت کے کار و بار میں پوری کامیابی حاصل ہوئی -

محمد تغلق کے آتے آتے فضا بدل گئی - خاندان تغلق کا دبدبہ تمام ہندوستان پر قائم ہوگیا تھا اور بظاہر ہر طرف سکون و اطمینان کے آثار نظر آتے تھے - چنانچہ ہندوستان اور ممالک غیر کے درمیان

دوبارہ ربط ضبط قایم ہوگیا - بقول امیر خسرو تغلق خاندان کے مورث بھی مغل تھے - شعر : معظم تغلق غازی ترا نام *مغل ہم نام تغلق داشت ز ایام - اس لئے محمد تغلق کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ اس کو اسی امر کی کوشش کرنا چاہئے کہ اس کا طبقۂ امرا یکسر غیر ملک والے لوگوں سے بھر جائے - اس بات کو مد نظر رکھتے ہوئے وہ پردیسیوں پر اپنا خزانہ لٹانے لگا - ترکی و فارسی الاصل لوگوں کو جو انعامات ملتے تھے ان کا اندازہ لگانا مشکل ہے - ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ ' پادشاہ ہند محمد تغلق شاہ پردیسیوں کی تعظیم و تکریم بدرجۂ غایت کرتا ہے اور ان سے محبت رکھتا ہے - اور بڑے بڑے عہدے ان کو دیتا ہے - اس کے بڑے بڑے خواص اور حاجب اور وزیر اور قضی اور داماد غیر ملک کے باشندے ہیں - اس کا حکم ہے کہ پردیسی کو ہمیشہ عزیز کے نام سے پکارا کریں چنانچہ باشر کے لوگ بجائے غریب کے سب عزیز کہلاتے ہیں - بدایونی اسی کے متعلق رقمطراز ہے - ' درآں چند سال مردم از ولایت خراسان و عراق و سمرقند بامید بخشش سلطان در ہند آمدند کہ دریں دیار بغیر از ایشاں طائفہ دیگر کم بنظر درمے آمدند ' برنی لکھتا ہے - ' و در تمامی قرن بادشاهی خود عظما و کبرا و معتبران - و ماہران و استاذان ہر علمے و ہنرے و بزرگزادہ و ہر واقعہ زدہ کشتی شکستہ کہ بامید عواطف و مراحم محمد شاهی خراسان و عراق و ماوراءالنہر و خوارزم و سیستان - و ہریو و مصر و دمشق در درگاہ آسمان جاہ او می رسیدند با موال و اسباب مالا مال می شدند و نہ در آخر عہد سلطان چندیں مغلان و امیران تمن و امیران ہزارہ معارف مغلان و خاتونان بزرگ و اکابر مغلستان بدرگاہ سلطان محمد شاہ بہ بندگی و چاکری و اخلاص و ہوا خواهی می رسیدند ' (p. 462) ان الفاظ سے صاف ظاہر ہے کہ محمد تغلق

کو پردیسیوں کا کتنا خیال تھا - ان لوگوں کو اعلیٰ اعلیٰ عہدے دینا مصلحت سے خالی نہ تھا - وہ چاہتا تھا کہ لائق لائق آدمی خراسان، ترکستان، عرب، و شام وغیرہ سے آ کر اس کی ملازمت اختیار کریں - اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ محمد تغلق نے اس رویہ کو کیوں جاری کیا - کیا ہندوستان میں قابل لوگ اس کو دستیاب نہیں ہوتے تھے جو اس کو پردیسیوں کو بھرتی کرنے کی ضرورت پیش آئی ؟ معلوم یہ ہوتا ہے کہ سلطان کو ہندی اصل امیروں کا اعتبار جاتا رہا تھا - علاوہ بریں اس کی یہ خواہش تھی کہ وہ ربع مسکون میں بے مثل شہرت حاصل کرلے اور اپنے طرز حکومت کو عدیم المثال بنا لے - ان ارادوں کی تکمیل کا اس کو صرف یہی ذریعہ معلوم ہوا کہ پردیسیوں کے ساتھ رعایت کرے - ممکن ہے کہ پردیسی خون نے بھی اس کی رگوں میں کچھ جوش مارا ہو اور اس کو اسی طرز عمل کے طرف مائل کیا ہو - بلبن کے طرح اگر یہ بھی ہوشیاری اور سمجھ سے کام لیتا تو انجام بہتر ہوتا مگر زور میں آکر محمد تغلق نے پردیسیوں کی ایسی بھرمار کی کہ قابل اور نالائق، عقلمند اور جاہل، کار آمد اور بیکار کے امتیاز کو بالکل بالائے طاق رکھ دیا - دربار تو پردیسیوں سے بھرا ہی تھا -، خیر یہاں تک غنیمت تھا - لیکن محمد تغلق نے فوج اور دیگر شعبہ ہائے حکومت میں بھی پردیسیوں ہی کو جگہ دی - بالآخر جب یہ لوگ نالائق ثابت ہوئے تب محمد تغلق کی آنکھیں کھلیں - سراسیمہ ہوکر اس نے یکدم اپنے طرز عمل کو بدل دیا - کہاں تو پردیسیوں کی اتنی قدر و منزلت تھی کہاں اب وہی باغیوں کی فہرست میں گردانے جانے لگے - مجبوراً ہندی الاصل لوگوں کو سلطان نے گروہ امرا میں داخل کرنا شروع کردیا - لیکن اب اتنا موقع نہ تھا کہ وہ سوچ سمجھ کر کام کرسکتا - وہ تو غصہ کے مارے اندھا ہو رہا

تھا - دوسرے یکدم اتنی تعداد میں قابل آدمیوں کا ملنا امر محال تھا - نا تجربہ کار اور بد اصل لوگوں کا زور بندھا - نئے امیر کس قسم کے تھے اس کا اندازہ برنی کے ان الفاظ سے ہوسکتا ہے - 'سلطان در ولایت سنام و سامانہ لشکر کشید و متمردان و سر تابان آنجاے کہ منزلہا کردہ بودند و خراج نمیدادند و فسادھا می کردند و راہ می زدند سلطان محمد منزلہاے ایشان را نہب و تاراج فرمود و جمعیتہائے ایشان را متفرق گردانید و مقدمان و سران ایشان را در شہر آورد و بعضے از ایشان مسلمان شدند و گروہ گروہ را داخل امرا گردانید' - ممکن ہے کہ برنی کے یہ الفاظ مبالغہ آمیز ہوں لیکن آیندہ واقعات سے یہ صاف پتہ چلتا ہے کہ دیسی تحریک نے اسی زمانہ سے از سر نو زور باندھا تھا -

فیروز تغلق علما و اکابر کی مدد سے تخت پر بیٹھا - اس کے زمانہ میں نو مسلمین کی طاقت انتہائی درجہ تک پہونچ گئی - اس کا وزیر خان جہاں مقبول ہندی نژاد تھا - وہ تلنگ کا باشندہ تھا اور اس کا اصلی نام کٹو تھا - ظاہر ہے کہ اس نے اپنے ہم وطنوں کی سرپرستی کی ہوگی - دوسرے بہت سے علماء باوجود اپنی پردیسی اصل کے ہندی ہی ہوگئے تھے - اُن کی عزت؛ اُن کی شہرت' اُن کی مقبولیت' حتیٰ کہ اُن کی ثروت کا دار و مدار باشندگان ہند پر ہی تھا - پھر بھلا وہ کب تک اپنے پردیسی حسب و نسب کو مایہ ناز بنائے رکھتے - دوسرے فیروز نے جود و سخا کے جوش میں آکر ایک علیحدہ محکمہ قایم کردیا جس کا نام دیوان بندگان رکھا - اگر یہ بندگان التمش کے چہل گان کے مقابلہ کے ہوتے تو ممکن تھا کہ شاید ریاست کو کچھ فیض پہنچتا - مگر ان میں سب کے سب نو مسلم تھے اور وہ بھی ایسے جو کہ بطور غلام کے جنگ و جدال میں گرفتار کر لئے گئے تھے - ایسے لوگ کس قابل ہوسکتے تھے؟ '

اس کے کھلنے کی چنداں ضرورت نہیں - یہ سچ ہے کہ فیروز نے ان غلاموں میں سے چیدہ چیدہ کے واسطے اعلیٰ قسم کی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا لیکن — عاقبت گرگ زادہ گرگ شود -

تیموری حملہ سے جو مغربی ہند کی سیاسیات میں تغیر و تبدل ہوا اس میں اہم ترین واقعہ تھا خاندان سید کا عروج - اس کا بانی مبانی خضر خاں تھا جس کی سیادت کی صحت کے ثبوت میں یحییٰ سہرندی نے متعدد واقعات پیش کئے ہیں - دہلی پر قبضہ کرنے کے بعد سید خضر خاں کو یہ فکر پیدا ہوئی کہ ایک ایسا گروہ بناوے کہ جس میں اُس کے یارو مددگار شامل ہوں - سید ہوتے ہوئے بھی خضر خاں کی یہ ہمت نہ پڑی کہ پردیسیوں کو بلاتا - شاید موقع بھی نہ تھا - کیونکہ خراسان و فارس کے واسطے آل تیمور کی سرپرستی میں رہنا باعث فخر تھا - خضر خاں کوئی خود مختار سلطان نہ تھا - اس نے تو سلطان کا لقب بھی اختیار نہیں کیا وہ اپنے کو محض ایک تیموری حاکم تصور کرتا تھا - پھر بھلا پردیسی کیوں اُس کے پاس آتے - چنانچہ اس کو ہندی نژاد لوگوں سے ہی ربط ضبط بڑھانا پڑا - واقعہ تو یہ ہے کہ اغلباً وہ خود بھی ہندی ہی تھا - دہلی آنے کے بعد جن لوگوں کو اُس نے ممتاز کیا ان میں سے چند نام ایسے ہیں جن کے ہندی ہونے میں کوئی شبہہ ہی نہیں مثلاً ملک سروپ ، ملک کالو ، ملک داؤد ، اختیار خاں وغیرہ - خضر خاں کی وفات کے بعد اس کا بیٹا ابوالفتح مبارک شاہ تخت نشین ہوا - بموجب قول مصنف تاریخ مبارک شاہی ' امرا و ملوک وایمہ و سادات و قضات و ہر چہ کسے در عہد خدائگان مغفور خضر خاں از شغل و اقطاع و پرگنہ ودیہ و وظیفہ مجدود تعین داشت برہمہ مقرر داشتن فرمود ' - مطلب یہ کہ مبارک شاہ نے دابستہ امرا نے

بنانے میں کوئی خاص تغیر نہیں کیا - اس کے بعد اس خاندان میں کوئی ایسا نہ ہوا جو کسی نئے طرز عمل پر کاربند ہونے کی ہمت بھی کرتا -

سیدوں کے مقدر نے جب پلٹا کھایا تب لودیوں کا عروج ہوا - بہلول نے دوران ملازمت میں ہی اپنے ہموطنوں کا ایک گروہ اکٹھا کر لیا تھا - جس کی امداد سے حمید خاں کو اُس نے ایسا دھوکا دیا کہ بایدو شاید - حمید خاں کو خواب میں بھی یہ خیال نہ گذرا کہ جاہل افغان کسی وقت اس کی مشکیں کس لیں گے - قصہ کوتاہ اپنے ولی نعمت کو پیچ و تاب میں ڈال کر بہلول سلطان بن بیٹھا - مسند نشین ہوتے ہی اُس نے اپنے ہموطنوں کو پیارے پیغام بھیجے کہ افغانوں کے واسطے سر زمین ہند میں نان و نمک کی کمی نہیں - اس خبر کا پہنچنا تھا کہ افغانوں کے دل بادل درہ سے اتر کر اس ملک پر چھا گئے ' لودی ' فرمولی ' لوحانی ' عیسیٰ خیل ' کتاخیل ' وغیرہ فرقوں کے لوگ آئے سلطان بہلول نے ان کی سرپرستی کی - ان کو بڑے بڑے عہدے دئے اور تمام سلطنت کا کام انہیں کے سپرد کیا - چنانچہ لودی دور میں طبقہ امراء کی وہی ہیئت نظر آتی ہے جو کہ شمسی یا بلبنی عہد میں تھی - ان میں سے ہر فرد پردیسی تھا - ہر شخص جری اور حوصلہ مند - مرنے کٹنے کو تیار - وقتاً فوقتاً مالک کا وفادار - مگر ہر دم اپنی ذاتی شان و شوکت کا دلدادہ اور اس پر جان نثاری کے واسطے آمادہ -

شمسی خاندان سے لے کر لودی عہد تک طبقۂ امرا کے بنانے اور اس کی ہیئت میں جو تبدیلیاں ہوئیں اُن کے بیان کرنے کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مجملاً اس بات کا بھی اندازہ کر لیا جاوے کہ ان لوگوں کا سیاسی امور پر کیا اثر پڑا - اچھا یا برا - سلطان اور امیروں

کی طاقت میں ضدین کی نسبت تھی - اس کا مطلب یہ ہے کہ جس زمانہ میں بادشاہ طاقتور ہوتا تھا اس زمانہ میں امیر کمزور ہوتے اور جب امیر طاقتور ہوتے تھے تو بادشاہ کمزور ہوتا تھا - امیروں کی طاقت کی پہلی مثال قطب‌الدین ایبک کی وفات کے بعد نظروں کے سامنے آتی ہے لیکن چونکہ وہ لوگ اس وقت کی دو گروہوں میں تقسیم تھے اس لئے سیاسی امور پر ان کا کوئی دبدبہ یا اثر نہ پڑ سکا مگر التمش نے جو طریقہ اپنی سلطنت کو مستحکم کرنے کے لئے نکالا وہ بالاخر بہت مفید ثابت نہوا - وہی لوگ جنکو اس نے پستی سے اٹھا کر امیری کے درجہ تک پہنچایا تھا سلطان کی وفات کے بعد اس بات کے درپے ہوگئے کہ تمام شاہی طاقت خود ہی غصب کر لیں - صاحب طبقات ناصری کے قول کے بموجب التمش نے مرتے وقت اپنے امراء و اکابر سے یہ وعدہ لے لیا تھا کہ وہ اس کی بیٹی رضیہ کو سلطان بنادینگے - مگر مذہب اسلام کے مقلدین کو بھلا یہ کب گوارا تھا کہ ایک عورت کے سامنے اپنا سر جھکائیں قرون وسطی میں سیاسی اغراض کو پورا کرنے کے لئے مذہب کی آڑ لینا کوئی تعجب خیز بات نہ تھی - حقیقت تو یہ ہے کہ امیر لوگ قابل اور سمجھدار فرماں روا سے ڈرتے تھے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ ان کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لیکر ان کی خود مختاری کے راستہ میں سد راہ بن جائے چنانچہ رضیہ کی مخالفت کی اصلی وجہ یہی تہی - لیکن بہ ظاہر امراء نے اپنی مخالفت کو مذہبی رنگ دے دیا - چنانچہ نظام‌الملک جنیدی کی ایما سے جو کہ اس وقت طبقہ امراء کا سردار تھا، سلطان مرحوم کے سب سے بڑے بیٹے رکن‌الدین فیروز کو وارث تاج و نگین قرار دیا گیا - اس کار روائی کی سیاسی نقطۂ نظر سے خاص اہمیت یہ ہے کہ اب سے یہ طے ہوگیا کہ تخت و تاج کے متعلق

حقوق کے فیصلہ کا جزوی و کلی اختیار امیروں کو حاصل ہے ' ایسی فضا میں جب کہ بادشاہ محض ایک کھلونا بن گیا تھا یہ اصول دراصل نہایت ہی کارآمد تھا - لیکن دقت یہ آن پڑی کہ امیروں کے مابین بہت دنوں تک اتفاق رائے قایم رہنا دشوار تھا - ان میں سے ہر ایک کو یہ فکر دامن گیر تھی کہ کس طرح سے اپنے ساتھیوں کو زیر کرکے ساری طاقت اپنے ہاتھ میں کر لے - نتیجہ یہ ہوا کہ طبقہ امرا میں فرقہ بندی ہوئی اور وہ لوگ آپس میں لڑنے جھگڑنے لگے - جو فرقہ زور پکڑ جاتا تھا سلطان اُسی کے قابو میں ہوکر کٹھ پتلی کی طرح ناچا کرتا تھا - لیکن کسی گروہ کا بھی عرصہ تک زور رہنا غیر ممکن تھا - وجہ یہ کہ فرقہ بندی کی بنیاد تھی - خود غرضی ' اور خود پسندی - اس دور میں شاید ہی کوئی ایسا امیر ہو جس میں کہ ایثار کا مادہ موجود ہو - پس چند روز تک تو نظام الملک جنیدی کی دھاک جمی رہی مگر بہت جلد خواجہ مہذب کی سرکردگی میں ایک مخالف پارٹی قایم ہوگئی جس نے کہ رضیہ کا ساتھ دیا - خواجہ مہذب کے بھی وہی حوصلے تھے جو نظام الملک کے ' مگر اس کے بہ نسبت خواجہ شاید کچھ زیادہ ہوشیار تھا - اور اس نے ایسی چال چلی کہ رضیہ کو تخت سے ہاتھ دھونا پڑا - اب امیروں نے بہرام کو سلطان بنایا چونکہ یہ محض ایک ناتجربہ کار نوجوان تھا اس لئے اس کے مشورے کے واسطے ایک مجلس انتظامیہ قایم کی گئی - اس مجلس کا صدر تو وزیر خواجہ مہذب ہی تھا مگر اصلی اختیارات اختیارالدین اتگین کو حاصل تھے - اپنے کرو فر میں اضافہ کرنے کی غرض سے اتگین نے سلطان کی مطلقہ بہن سے نکاح کیا وہ سہ گانہ نوبت بھی بجوانے لگا اور اس نے اپنے مکان کے دروازہ پر ایک ہاتھی باندھ لیا - اس کی اس فرعونیت سے اس کے دوست ناراض ہوگئے - بادشاہ نے ان کی صلاح سے اتگین کو

قتل کروا دیا - اس سانحہ کے بعد خواجہ مہذب کی طاقت دوبارہ بڑھ گئی - اس نے مکر و فریب سے تمام امیروں کو سلطان بہرام کی جانب سے بدظن کر دیا - اور انجام کار اپنے مالک کو تلوار کے گھاٹ اتار دیا - بہرام کے بعد تخت پر کس کو بٹھلانا چاہئے اس بات کا فیصلہ آسان نہ تھا - جب کہ خواجہ مہذب اور اس کے ساتھی اس اہم مسئلہ پر بحث کر رہے تھے ایک باحوصلہ اور دلیر امیر عزالدین بلبن کشلو خان موقع کو غنیمت جان کر محل شاہی میں جاکر سلطان بن بیٹھا تخت پر اس کا حق سلطان التمش کے داماد ہونے کے رشتہ سے تھا - لیکن التمش کی اولاد کے مقابلے میں دوسرے امیر کشلو خاں کے حقوق کو تسلیم کرنے کے واسطے تیار نہ تھے چنانچہ انہوں نے اس مرتبہ مسعود کو سلطان بنایا مگر یہ لوگ اپنی خصلت و عادت سے مجبور تھے - بہت جلد مسعود سے بھی ناراض ہوگئے - انہوں نے اس کے چچا ناصرالدین کو بہرائچ سے بلا بھیجا اور مسعود کو معزول کرکے اس [illegible] بادشاہ بنایا - خوش قسمتی سے ناصرالدین کو بلبن جیسا وفادار اور ہوشیار وزیر مل گیا جس کی مدد سے ۲۰ سال تک وہ سلطنت کرتا رہا - اس کے عہد میں بھی ایک دفعہ امیروں نے سر اٹھایا اور سلطان کو اتنا ورغلایا کہ اس نے بلبن کو برخاست کر دیا اور عماد الدین ریحان کو اپنا معتمد اعلیٰ بنایا - لیکن عمادالدین سے وزارت کا کام چلائے نہ چلا - اس کے دوست اس سے برگشتہ ہوگئے اور ان کے کہنے سے سلطان نے بلبن کو اس کے عہدے پر بحال کر دیا اس کے بعد زندگی بھر اسی کی رائے سے فرائض منصبی کو انجام دیتا رہا - ناصرالدین کے بعد بلبن تخت نشین ہوا، اس نے پہلی اصلاح جس پر سب سے زیادہ زور دیا وہ طبقہ امراء کی روز افزوں طاقت کو کم کرنا تھا - اس کے واسطے اس نے جو سرحلے انتشار کی

وہ قابل ذکر ھے - اول تو اس نے چهلگان کے گروہ کو درهم برهم کر ڈالا -
دوسرے اس نے سن رسیدہ و نیز کمسن امیروں کي جو کہ فوجي خدمت
انجام نہیں دے سکتے تھے پنشن مقرر کر دی - تیسرے اس نے نوجوان
امیروں کی تنخواہ ان کی لیاقت کے بموجب تجویز کی - چوتھے اس نے
چن چن کر کم اصل اور ناکارہ امیروں کو ان کے عہدوں سے معزول کر دیا -
اس طرح سے بلبن نے طبقہ امراء کو پھر سے اس کے اصلی مرتبہ پر پہنچا
دیا - اس نے یہ صاف صاف کہدیا کہ امیر صرف اس لئے ہوتے ہیں کہ
سلطان کو مشورہ دیں اور اس کی اطاعت کریں - اس کے علاوہ ان کا اور
کوئي کام نہیں - جب تک وہ زندہ رہا کسی امیر کی قسمت نہ ہوئی کہ
زبان سے کوئی بات نکلتا - فرقہ بندی کا خیال تو خواب میں بھی آنا محال
تھا - مگر بلبن کے مرتے ہی پھر امیروں نے شاهی طاقت کو غصب کر لیا -
اب ملک الامرا فخرالدین کے داماد نظام الدین کا ایسا زور بندھا کہ
سلطان کو اس نے بالکل قابو میں کر لیا - اس کو دیکھ کر دوسرے امیر
بہت برهم ہوئے - خاص کر وزیر سلطنت خواجہ خطیر کی ناراضگی کی
تو کوئی انتہا ہی نہ تھی ' بیکسي کے عالم میں اس نے سلطنت اور
سلطان دونوں سے قطع تعلق کر لیا - اب ہر طرف نظام الدین هي کی
دھوم تھي - لیکن کچھ ہی عرصہ کے بعد اسے اپنی جگہ سے مستعفی ہونا پڑا -
نظام الدین کے بعد کار و بار سلطنت میں وہ ابتری پڑی کہ جس کا کچھ
حساب نہیں - بگڑی ہوئی فضا کو سنبھالنے کی غرض سے سلطان نے
جلال الدین سر جاندار کو سامانہ سے طلب کیا اور عرض ممالک کا عہدہ
اس کے حوالے کیا - ابھی تک تو ترکی امیر آپس ہی میں بر سر پیکار تھے
مگر جلال الدین کی آمد سے ان کو یہ اندیشہ پیدا ہوا کہ کہیں ایسا
نہ ہو کہ عرض ممالک ان کي هستی کو مٹا دے - چنانچہ آپس میں

اتفاق کرکے ترکی امیروں نے یہ صلاح کی کہ چال بازی سے جلال الدین اور اس کے خلجی حوالی موالی کا قلع قمع کردیا جاوے - لیکن ان کا راز طشت از بام ہو گیا - بہت سے تو اس جماعت سے بھاگ نکلے اور انہوں نے جاکر جلال الدین سے رشتہ جوڑا - بقیہ نے حوصلہ کی خاطر اپنی جان گنوائی -

جلال الدین فیروز خلجی ایک نہایت ہی سیدھا سادہ بادشاہ تھا - تاہم چونکہ اس نے تاج شاہی کو مکر و فریب سے حاصل کیا تھا اس لئے باشندگان دہلی اسے غاصب تصور کرتے تھے' کچھ دنوں تک وہ اس کی اطاعت سے منہ موڑے رہے - مگر ملک الامرا کے کہلے سننے سے انہوں نے اپنے خیالات کو بدل دیا - جب تک کہ دارالخلافت میں سکون قائم نہ ہو گیا سلطان جلال الدین نے شہر نو یعنی کیلوکہری سے قدم باہر نہ نکالا - دہلی پہنچنے پر پہلے دولت خانہ میں گیا اور وہاں دو رکعت نماز پڑھنے کے بعد وہ سلاطین ماضیہ کے تخت پر جلوس فرما ہوا - بعد ازاں وہ کوشک لعل کے طرف روانہ ہوا جب پھاٹک پر پہونچا تو حسب دستور قدیم گھوڑے پر سے اتر پڑا - اس پر احمد چپ نائب باربک نے سوال کیا - خداوند عالم محل تو آپ ہی کا ہے پھر پھاٹک ہی پر آپ کیوں اُتر پڑے ؟ ' جلال الدین نے جواب دیا - ' اے احمد جو محل کہ میرے آبا و اجداد کا بنوایا ہوا ہو وہی میرا ہو سکتا ہے - یہ محل تو بلبن کا بنوایا ہوا ہے - میں نے تو اس پر زبردستی قبضہ کر لیا ہے در اصل اس کی حق دار بلبن کی اولاد ہے ' کیا ایسا بادشاہ جو اپنے کو ہردم غلام و خدمتگار تصور کرتا ہو طبقہ امرا کو قابو میں رکھ سکتا تھا ؟ چنانچہ بہت جلد یہ خبر مشتہر ہوگئی کہ جلال الدین بادشاہی کے قابل نہیں - ملک چھجو نے علم بغاوت بلند کیا - مگر آخر میں اس کو شکست ہوئی - باغی گرفتار کرکے سلطان کے رو برو پیش کئے گئے مگر اس نے ان سب کو رہا کردیا ' اس

طرز عمل کو دیکھ کر امیروں کے دلوں سے اس کی رہی سہی عزت بھی غائب ہوگئی اور وہ علانیہ کہنے لگے کہ جلال الدین نکما آدمی ہے - ایک شب کو بہت سے امیر ملک تاج الدین کوچی کے مکان پر جمع ہوئے - شراب و کباب کے دور کے بعد عالم مستی میں بات چھڑی - ایک بولا کہ اے تاج الدین تاج شاہی کے شایاں تو ہی ہے نہ کہ سلطان جلال الدین - دوسرے نے کہا کہ خلجی لوگ امور سلطنت کے قابل نہیں اگر ان میں کوئی ہوشیار اور لائق ہے تو وہ احمد چپؒ ہے نہ کہ جلال الدین - سب کے سب نشہ میں چور تھے اور ہوا میں قلعے باندھ رہے تھے - اسی حالت میں سب امیروں نے ملکر تاج الدین کوچی کو سلطان منتخب کیا اور اس کے ساتھ بیعت بھی کر لی - اس کے بعد ایک نا عاقبت اندیش نے کہا کہ میں سلطان جلال الدین کو ایک ہی وار میں قتل کر دونگا ' سراغرساں موجود ہی تھے - انہوں نے جاکر سلطان سے تمام داستان مشرح و مفصل کہہ سنائی - جلال الدین نے سب امیروں کو طلب کیا اور اُن پر لعن طعن کرنا شروع کیا ' آخر میں وہ اتنا ناراض ہوا کہ اس نے اپنی کمر سے تلوار کھول کر امیروں کے سامنے پھینک دی اور کہا - ' اے بد مستو آپس میں تو خوب شیخی مارتے تھے اب تم میں سے کون ایسا جوانمرد ہے جو اس تلوار کو اٹھا کر وار کرنے کی ہمت کرے - اور کہاں ہے وہ شخص جو مجھ سے زور آزمائی کرے - میں یہاں بیٹھا ہوں وہ آئے تو میرے سامنے ' بادشاہ کے ان کلمات کو سنکر سب امیر دم بخود رہ گئے - لیکن ملک نصرت صباح نے جرأت کرکے زبان کھولی اور کہا - ' خداوند عالم آپ کو معلوم ہے کہ حالت بیخودی میں لوگ کیسی ڈون کی ہانکتے ہیں - ورنہ ہم لوگ آپ کے واسطے ویسے ہی نہیں جیسے کہ آپ ہم لوگوں کے واسطے - آپنے تو ہماری پرورش اپنے اولاد کی طرح کی ہے - پھر بولا کیا یہ ممکن ہے کہ آپ ہماری

جان لے لیںگے ؟ ہملوگوں کو آپ کی طرح حلیم و کریم بادشاہ کہاں ملیگا اور ہماری طرح آپ کو امیر ملک کہاں ملیںگے ' - اس خوشامدانہ تقریر کو سنتے ہی بادشاہ کا سارا غصہ کافور ہو گیا اس نے شراب منگوائی خود پی اور نصرت صباح کو پلائی - دیگر امراء کو ان کے اقطاعوں پر روانہ کردیا - اور ایک سال ان کو دھلی آنے سے منع کردیا - بھلا اس طرح کے برتاو سے امیر سلطان کے تابع و مطیع رہ سکتے تھے ؟ چنانچہ ان میں سے بہتوں نے علاءالدین کا ساتھ دیا -

مقتضائے وقت کا لحاظ کرکے علاءالدین نے پہلے تو جلالی امیروں کو انعام و اکرام سے مالا مال کیا - لیکن جیسے ھی اس کی پریشانیاں کم ہوئیں اس نے تیغ انتقام سے ان بد بختوں کا کام تمام کیا - بعد ازاں کچھ دنوں تک تو وہ امرائے قدیم کا پاس کرتا رہا - لیکن اکت خاں ' ملک عمر ' منگو خاں اور حاجی مولا کی بغاوتوں کے بعد علاءالدین کو یہ جستجو ہوئی کہ آخر ان سازشوں کی وجہ کیا ہے ' اس مسئلہ پر بحث و مباحثہ کرنے کے واسطے اس نے مجلس خاص میں ملک حمیدالدین ' ملک اعزالدین ' ملک عین الدین ملتانی وغیرہ جہاندیدہ امراء کو طلب کیا - بہت غور و خوض کے بعد رائے یہ قرار پائی کہ فتنہ و فساد کے چار وجوہات ہیں - اول معاملات نیک و بد کے جانب سے ان کی بے اعتنائی دوسرے شراب - تیسرے امراء کے درمیان ربط ضبط اور قرابت داری - چوتھے زر یعنی فارغ البالی - مختصر یہ کہ علاءالدین کے ذہن نشین یہ بات ہوگئی کہ طبقہ امراء کی ترتیب میں اصلاح کی سخت ضرورت ہے - چنانچہ اس نے اس امر کی کوشش بلیغ کی کہ اقطاعداری کے دستور کو یکقلم منسوخ کر کے امراء کی طاقت کی جڑ ہی کاٹ دے ' اس کے علاوہ اس نے متعدد احکام بھی جاری کئے جنکی رو سے نہ تو امیروں کو

ایک دوسرے کے یہاں آمد و رفت کی آزادی تھی اور نہ بلا حکم سلطانی آپس میں ازدواجی رشتہ قائم کرنے کی اجازت ، محکمہ خفیہ کی نگرانی سے وہ اتنے خائف رہتے تھے کہ اپنے گھروں میں بھی بآواز بلند گفتگو کرنے سے گھبراتے تھے - علاءالدین نے اُن پر وہ رعب جمایا کہ بیان سے باہر ھے - کچھ دنوں کے واسطے بلوہ کا نام تک صفحہ سیاست سے مٹ گیا - اور ملک میں ہر چار سو سکون ھی سکون نظر آنے لگا مگر طبقہ امراء کی زبونی سے سلطنت کے کسی پائدار نفع کی امید کرنا لغو تھا - تجربہ‌کار و ھوشیار امیر اپنی عزت بچانے کے خیال سے سلطان کے ارد گرد پھٹکتے بھی نہ تھے وہ رکن سلطنت بنکر رھنا چاھتے تھے نہ کہ غلام سلطانی ، لامحالہ چاپلوس اور بد اصلوں کی بن آئی - علاءالدین کے زمانے میں طبقہ امراء کی ساخت و پرداخت میں جو تدریجی زوال ھوا اس کا صاف اندازہ ضیاءالدین برنی کی تحریر سے ھو جاتا ھے - وہ لکھتا ھے کہ اس دور میں یکے بعد دیگرے امیروں کے تین گروھوں نے سلطنت کا کام سنبھالا - اول گروہ میں تھے الغ خاں ، نصرت خاں ، ظفر خاں ، الپ خاں ، ملک علاءالملک ، ملک فخرالدین جونا ، ملک اصغرے ، ملک تاج‌الدین وغیرہ - یہ ایسے لوگ تھے جو بادشاہ کی عزت تو کرتے تھے مگر صاف بیانی سے گریز نہ کرتے - دوسرے گروہ میں تھے ملک حمیدالدین ، ملک اعزالدین ، ملک عین‌الملک ملتانی ، ملک شرف قائنی ، خواجہ حاجی وغیرہ - یہ لوگ بھی قابل تھے مگر اتنے صاف گو اور خود مختار نہ تھے جیسے کہ اول گروہ والے - تیسرے گروہ میں تھے ملک نائب کافور ، ملک بہاءالدین ، ملک قیران ، ملک قیرا بیگ وغیرہ جن کو نہ تو امور ملکی میں دخل تھا اور نہ ان میں سمجھ اور دانائی ھی تھی - ان کا شیوہ تھا خود پرستی اور سلطان کی ھاں میں ھاں ملانا - علاءالدین کے

بیمار پڑتے ھی اُن لوگوں نے پھر پھیلانا شروع کردیا - نوبت بہ ایلچا رسید کہ کافور نے سلطان کو زھر دے کر ھلاک کر ڈالا -

قطب الدین مبارک کے عہد میں امراء کی طاقت میں از سرنو اضافہ ھوا - لیکن خسرو خاں کی تخت نشینی کے قبل اُن کے درمیان کوئی خاص اتحاد و یگانگت قایم نہو سکی - اس ظالم بادشاہ کے جبر و تشدد سے تنگ آکر غازی ملک نے مغلطی حاکم ملتان ' محمد شاہ لر حاکم سیوستان ' بہرام ابیہ حاکم اچھ ' امیر ھوشنگ حاکم جالور ' اور عین الملک ملتانی ' ملک یک لکھی وغیرہ کو خطوط لکھے جس میں اس نے امیروں کو خسرو خاں کے بادشاہ ھو جانے پر غیرت دلائی اور ان کو جنگ کرنے کے لئے آمادہ کیا - ان امراء پر غازی ملک کے نامہ وپیام کا اثر پڑا اس کا مشرح حال امیر خسرو نے لکھا ھے - بہرام ابیہ نے تو فوراً ھی اس کی تجویز کو منظور کر لیا مگر مغلطی کے پاس جب خط پہونچا تو وہ بہت بگڑا اور اس نے غازی ملک کو بہت کچھ برا بھلا کہا - جب مغلطی کے ان خیالات کی غازی ملک کو اطلاع ھوئی تو اس نے ملتان کے دوسرے سرداروں کو خفیہ طور پر اشارہ کیا کہ وہ امیر پر حملہ کردیں - اس ھنگامے کا سرغنہ بہرام سراج تھا - مغلطی اپنے ماتحت سرداروں کی یورش سے جان چرا کر بھاگا مگر ایک نہر میں گر پڑا اور جان بحق تسلیم ھوا - محمد شاہ لُر کے پاس جب قاصد پہنچا تو اس وقت سیوستان کے مقامی سرداروں نے اس کے خلاف بغاوت کر رکھی تھی اور وہ قلعہ میں محصور تھا - لیکن غازی ملک کے خط کی وجہ سے باغیوں نے امیر سے صلح کر لی - عین الملک ملتانی نے در پردہ اپنی اعانت کا اظہار کیا لیکن بہ ظاھر خسرو خاں کا شریک حال رھا حتیٰ کہ غازی ملک کے پاس سے آئے ھوے خط کو بھی خسرو خاں کو دکھلا دیا مگر سامانہ کے امیر ملک یک لکھی نے

مخالفت پر کمر باندھی - کہنے کا منشاء یہ ہے کہ تغلقی انقلاب کے بانی مبانی امیر تھے اور انہیں کی ذاتی اجتماعی امداد سے غیاث الدین کو کامیابی نصیب ہوئی - عہد خلجی ختم اور دور تغلق شروع ہوا -

محمد تغلق نے جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے پردیسیوں کا ایک نیا گروہ بنایا اور ان نئے امیروں کو سلطنت کا پشت و پناہ بنانے کی کوشش کی - بڑے بڑے اقطاع اور جاگیریں ان لوگوں کو دیں اور وہ اسی امید پر کہ وہ سلطان کے مطیع اور منقاد رہیں گے - لیکن امیروں نے اس کا ساتھ نہ دیا اور ہر چہار جانب علم بغاوت کھڑا کیا ' من می شنوم کہ ہر کہ بلغاک میکند از قوت امیر صدگان میکند و میر صدگان از برائے غصب و غارت یار اومی شوند ' (p. 503) - ان لوگوں کی چیرہ دستی سے عاجز آکر محمد تغلق نے عزم کیا کہ وہ ان کی ہستی ہی کو مٹا دے - چنانچہ بہت سے بد اصل اور کمینہ لڑکوں کو اُس نے امیر بنایا مثلاً ملک سردوانندار ' ملک مخلص الملک ' ملک یوسف بغرا ' عزیز خمار وغیرہ اور ان لوگوں کو حکم دیا کہ امیران صدگان میں سے جو دولت آباد کے علاقہ میں تھے کسی کا بھی وجود روے زمین پر باقی نہ ' ہے - عزیز خمار صوبہ مالوہ کا حاکم مقرر کیا گیا - بادشاہ نے اس کو یہ ہدایت کی کہ دھار کے امیر صدگان کا جس طرح بھی ہو وہ کام تمام کردے - دھار پہنچنے کے کچھ عرصہ بعد ہی عزیز خمار نے ۸۰ امیران صد کو طلب کرکے بلاوجہ قتل کرا دیا - اس کی اس حرکت نے سلگتی ہوئی آگ کو شعلہ زن کردیا - دولت آباد و گجرات دونوں صوبوں میں فتنہ و فساد کی لہریں اُٹھنے لگیں اور محمد تغلق کی آخری زندگی اسی بغاوت کے فرو کرنے میں صرف ہوئی - باغیوں کا پیچھا کرتے کرتے وہ سندھ پہنچا اور وہیں بعارضہ بخار انتقال کر گیا -

فیروز تغلق کے زمانہ میں امیروں کی طاقت میں برابر اضافہ ہی ہوتا رہا لیکن خانجہانی مقبول کی وجہ سے ان کی جانب سے کوئی خاص شر ظہور پذیر نہ ہوا - مگر جب سلطان بڈھا ہوگیا اور خانجہان بھی اس دار فانی سے رحلت کر گیا اسی وقت سے بندگان نے اپنی طاقت کو آزمانا شروع کر دیا - وزیر مرحوم کا لڑکا جس کو کہ فیروز شاہ نے اس کے والد کا شغل و خطاب عطا کیا تھا اتنا مغرور و مطلق العنان ہو گیا کہ امور سلطنت بالکلیہ اسی کے ہاتھ میں آ گئے - تمام امیر و رئوس بھی اس کا دم بھرنے لگے - اگر کوئی اس کی مخالفت کرتا تھا تو وزیر کسی نہ کسی حیلہ سے اس کی جان لے لیتا تھا - اب اس نے اس امر کی کوشش کی کہ سلطان اور اس کے لڑکے محمد خاں کے درمیان ناچاقی پیدا کرادے چنانچہ یہ کہکر کہ شہزادہ چلد امیروں کی اعانت سے بہت جلد فتنہ بپا کرنے والا ہے وزیر نے فیروز تغلق سے اس بات کی اجازت حاصل کر لی کہ وہ محمد خاں اور اُس کے ساتھیوں کو گرفتار کر لے - جب شہزادے پر یہ عقدہ کھلا تو وہ از حد پریشان ہوا اور اس نے خفیہ طریقہ پر اپنے والد کے پاس جاکر وزیر کی زیادتی کا حال کہہ سنایا - فیروز نے اس دفعہ محمد خاں کو حکم دے دیا کہ وہ جاکر وزیر کو گرفتار کرلے - لچھمی سرھندی لکھتا ہے -

' ملک یعقوب آخور بیگ اسپان پائگاہ را بتمام و ملک قطب الدین فرامرز شحنہ پیل ہمہ پیلان را باعماری و برگستوان بر شاہزادہ آوردند - بندگان فیروز شاہی و امرائے دیگر و خلق شہر نیز پیشترے باو یار شدند '

یہ اول موقع تھا جب کہ سیاسی امور میں بندگان فیروزی نے حصہ لیا - اب ان کو اپنی طاقت کا احساس ہو گیا - اور وہ متواتر سیاسی چالوں میں دلچسپی لینے اور بازی لگانے لگے جب محمد شاہ تخت پر بیٹھا تب کہیں جا کر بمشکل تمام بندگان فیروزی کی طاقت کا خاتمہ ہوا -

اس سلطان نے ان لوگوں کے تمام ہاتھی ضبط کر لئے اور ان کو بالکل ہی بیکار کر دیا - مگر غلاموں کے پسپا ہو جانے کے بعد بھی امیروں کا زور کم نہ ہوا - وہ جس کو چاہتے تھے اُسی کو سلطان بناتے تھے صرف خیال اتنا رکھتے تھے کہ ان کی کٹھ پتلی کا تعلق فیروزی خاندان سے ہو - چنانچہ غیاث الدین ثانی بندگان فیروزی کی امداد سے سلطان بنا - لیکن ان کا کیا اعتبار تھا کچھ ہی عرصہ بعد یہ لوگ رکن الدین خندہ نائب وزیر سے جا ملے - انہوں نے غیاث الدین کو قتل کرکے ابوبکر کو تخت پر بٹھلایا - پھر بہت جلد اُس سے بھی برگشتہ ہوگئے - اور اُسے تخت سے اُتار دیا - اس نے بھاگ کر کوتلہ بہادر میں پناہ لی - مسلمانوں کے باہمی نفاق کا نتیجہ یہ ہوا کہ "کفار ہندوستان قوت گرفتند و دست از ادائے جزیہ و خراج باز کشیدند و قصبات مسلمانان را نہب می کردند" - کچھ دنوں تک بہادر ناہر ابوبکر کی طرف سے لڑتا رہا لیکن شکست فاش کھانے کے بعد اس نے محمد شاہ کی اطاعت قبول کر لی - محمد شاہ کی وفات کے بعد اس کا دوسرا لڑکا علاؤالدین سکندر شاہ تخت پر بیٹھا لیکن دو ماہ کے اندر ہی اندر وہ رحلت کر گیا - اس کے مرنے پر ناصرالدین محمود شاہ سریر آرا ہوا - اب تغلقوں کی سلطنت کا دائرہ بہت ہی تنگ ہوگیا تھا مگر محمود شاہ سلطان ہند ہی کہلاتا تھا - اس کی تمام عمر اپنے امیروں سے ہی لڑتے گذری - ہر امیر اپنے اپنے اقطاع میں خود مختار ہو گیا تھا اسی واسطے اس زمانہ کو عہد طوائف الملوکی کہتے ہیں - مقرب خاں ، ملو اقبال خاں وغیرہ ایسے لوگ تھے جنہوں نے ہنگامہ بپا کردیا تھا -

رایات اعلیٰ خضر خاں نے پنجاب اور دہلی دونوں کو اپنے ماتحت کر لیا - مگر دوآب وغیرہ کے لوگوں نے اس سے سرتابی کی - سر ہند میں

بھی بہرم خان مرحوم کے عزیز و اقربا نے فتنہ انگیزی کی - اب انکا سرغنہ
ملک تغان تھا - اس نے ایک عرصہ تک سرکاری افسروں کو تنگ کیا -
بداؤں کے اقطاعدار مہابت خاں نے بھی رایات اعلیٰ کے خلاف سازش کی
اور اس نے اپنے دوسرے ساتھیوں کو بھی ورغلایا - اس طرح وقتاً فوقتاً امیر
و کبیر خضر خاں کو آزار پہنچاتے رہے - جب سید معزالدین مبارک شاہ کی
تخت نشینی کی باری آئی تو اس کو بھی انہیں دقتوں کا سامنا ہوا
جو کہ اس کے والد کو پیش آئی تھیں - سرورالملک کے کہنے سے اُس نے بہت
سے حاکموں کا ایک جگہ سے دوسری جگہ، تبادلہ کیا مثلاً سکندر تحفہ کو
عہدۂ وزات سے معزول کرکے وہ جگہ سرورالملک کو دی اور اس کے بیٹے کو
دہلی کا حاکم بنایا - سکندر تحفہ کو لاہور بھیجا - اور محمود حسن کو
جلندھر - ان تبدیلوں سے امراء کے درمیان ایک شورش پیدا ہوئی -
بالاخر انہوں نے ملکر سلطان کو قتل کرڈالا - اس کام میں سب سے نمایاں
حصہ سرورالملک نے لیا - سلطان مبارک کے قتل کے بعد امیروں نے اس کے
بھتیجے کو تخت پر بٹھلایا - اب انکو یہ فکر ہوئی کہ کسی طرح سے
سرورالملک کی طاقت کو تہ و بالا کردیں چنانچہ ایک عرصہ تک
خانہ جنگی ہوتی رہی - محمد شاہ بظاہر سرورالملک کے ساتھ تھا لیکن
خفیہ طور سے اس کے دشمنوں سے ملا ہوا تھا - جب سرورالملک کو یہ پتہ
چلا تو اس نے سلطان کو تلوار کے گھاٹ اُتارنے کی کوشش کی مگر وہ
ناکامیاب رہا اور خود مقتول ہوا - محمد شاہ نے کمال الدین کو وزیر بنایا -
ملک چمن کو غازی الملک کا خطاب دے کر امروھہ و بداؤں اس کے سپرد کئے -
الہاداد لودی کے بھائی کو دریا خاں کا خطاب دیا اور حصار کا اقطاع ملک
خویراج کو دیا اور حسام خاں کو دارالخلافت کا حاکم مقرر کیا - یہ
انتظام کر کے سلطان عیش و عشرت کا شکار ہوگیا - ادھر تو سر ہند کے

نئے حاکم بہلول لودی نے پنجاب میں اپنا سکہ جمانا شروع کیا دوسری طرف دھلی کے امیروں نے یہ دیکھکر کہ بادشاہ تو امور حکومت میں کوئی دلچسپی ہی نہیں لیتا ہے محمود خلجی والی مالوہ کو دعوت دی کہ وہ آکر تخت دھلی پر رونق افروز ہو۔ محمود کو بھلا کیا عذر ہوسکتا تھا - ایک جرار فوج لے کر دھلی پر چڑہ آیا - سید محمد شاہ نے اس مصیبت سے نجات حاصل کرنے کے لئے بہلول لودی سے امداد طلب کی - بہلول نے اس شرط پر مدد دینا قبول کیا کہ سلطان حسام خاں کو قتل کرادے - محمود خلجی کی واپسی کے بعد محمد شاہ نے بہلول کو بہت کچھ مال انعام و اکرام میں دیا - محمد شاہ کے بعد جب عالم شاہ تخت پر بیٹھا تب امراء تمام ملک پر قابض ہو چکے تھے - لاہور و پنجاب بہلول کے زیر تصرف تھے - سنبھل دریا خاں لودی کے قبضہ میں تھا اور اسی طرح سے اور اضلاع بھی امیروں نے غصب کر لئے تھے - یہاں تک کہ عالم شاہ نے جب دیکھا کہ دھلی میں بھی رھنا دشوار ہے تو وہ بھاگ کر بداؤں میں جا بسا - دھلی میں حسام خاں اور حمید خاں اپنی من مانی کرنے لگے -

بہلول لودی کے عہد میں افغانی امیر سلطان کے مطیع و منقاد رھے وجہ یہ کہ وہ اُن کے ساتھ برادرانہ سلوک کرتا تھا اور کبھی بھی ان پر رعب غالب کرنے کی کوشش نہ کرتا ' اس کو اپنے امیروں کی رضاجوئی اس قدر منظور تھی کہ دعوت کے وقت نہ تو وہ خود تخت پر بیٹھتا اور نہ امیروں کو کھڑا ہی رھنے دیتا - دربار عام کے موقع پر بھی وہ محض ایک قالین پر بیٹھ جاتا تھا - صاحب تاریخ داؤدی رقمطراز ہے کہ فرامین میں وہ امیروں کو مسند اعلیٰ کے لقب سے مخاطب کرتا تھا - اگر کسی وقت کوئی امیر سلطان سے رنجیدہ ہو جاتا تو بہلول ہر طریقہ سے اس کی

دل جوئی کرتا تھا - وہ اس کے گھر جاتا اور کمر سے اپنی تلوار کھول کر اس کے سامنے رکھدیتا - کبھی کبھی ایسا بھی کرتا کہ اپنی پگڑی اتار کر امیر کے سامنے رکھدیتا اور معافی مانگتا اور کہتا کہ "اگر آپ مجھے اس عہدے کے قابل تصور نہیں کرتے تو کسی اور کو منتخب کرلیجئے اور مجھے کوئی اور شغل دے دیجئے" اتنے عجز و انکسار کو دیکھکر بھلا کس امیر کا ایسا کڑا دل ہوسکتا تھا جو نہ پسیجتا - ایسے سیدھے سلطان کے خلاف بغاوت کی کیا ضرورت تھی - لیکن یہ بات خیال رکھنا چاہئے کہ بہلول نے یہ طرز عمل مقتضائے وقت کو مدنظر رکھکر اختیار کیا تھا - بذات خود نہ تو وہ کمزور ہی تھا اور نہ بد عقل - بات یہ تھی کہ اس کو اس وقت اس بات کی ضرورت تھی کہ اپنے ہموطنوں کی امداد سے اپنے پایہ کو مضبوط و مستحکم بنالے لیکن آئندہ چل کر یہ طرز عمل سلطنت کے واسطے ضرر رساں ثابت ہوا - جب بہلول گوالیر سے اٹاوہ ہوتا ہوا دہلی کی جانب واپس ارہا تبا تو سکیت کے مقام پر سخت بیمار ہوگیا - اس کی خراب حالت کو دیکھکر امیروں نے سازش شروع کردی - سلطان نے تو یہ انتظام کیا تھا کہ اس کی وفات کے بعد تخت و تاج کا وارث اس کا دوسرا لڑکا نظام خاں ہو - مگر افغانی امیروں نے یہ اعتراض پیش کیا کہ نظام خاں چونکہ ایک سنارن کے بطن سے پیدا ہے اس لئے وہ تخت شاہی کا حقدار نہیں ہو سکتا - یہاں تک تو امیروں کے درمیان اتفاق تھا مگر اس بات کا فیصلہ کرنا کہ پھر کون وارث ہوگا محال تھا چنانچہ طبقۂ امراء تین گروہوں میں منقسم ہو گیا - اول تو وہ جو نظام خاں کے طرفدار تھے دوسرے وہ جو باربک شاہ والی جونپور کی حمایت کر رہے تھے اور تیسرے وہ جو کہ اعظم ہمایوں کے حقوق پر زور دے رہے تھے، اس بنا پر کہ وہ سلطان کے سب سے

بڑے لڑکے کا لڑکا تھا - کہنے کا منشاء یہ ھے کہ موقع پاتے ھی امیروں نے خود غرضی اور خود پرستی کی روش اختیار کی - خوش قسمتی سے سکندر اتنا ھوشیار اور سمجھدار تھا کہ اس نے نہایت ھی خوش اسلوبی سے امیروں کو اپنے ھاتھ میں رکھا اگر چہ اس میں شک نہیں کہ اس نے انکے حقوق میں بہت کچھ کمی کردی اور یہ بات بھی انکے ذھن نشین کرانے کی کوشش کی کہ سلطان کی اطاعت کرنا انکا فرض ھے - اور اب برادرانہ سلوک کا زمانہ نہیں رھا - تاھم جہاں تک ممکن تھا اس نے بلا وجہ امیروں کو ناراض نہیں کیا - مگر امیر اپنی خصلت جبلی سے باز نہ آئے - سلطان کے خلاف انہوں نے سازش بھی کی اور اس کو تہ تیغ کرنے کا انتظام بھی کیا - لیکن سکندر ھر وقت آنکھ کھول کر کام کرتا تھا یہی وجہ ھے کہ وہ عرصہ دراز تک کامیابی کے ساتھ حکومت کرتا رھا - یہ پتہ چلتا ھے کہ اسی کے عہد سے یہ رسم جاری ھوئی کہ کچھ معتمد امیر باری باری سے محل شاھی پر شب کو پہرا دیا کریں - امیروں کو ھوش میں رکھنے کی یہ نہایت ھی عمدہ تدبیر تھی - اس سے ان کو ھر وقت اس بات کا احساس ھوتا رھتا تھا کہ ان کا اصلی رتبہ کیا ھے -

سکندر کی وفات کے بعد جب ابراھیم تخت نشین ھوا تو ایک بار پھر امیروں نے اس بات کی کوشش کی کہ خاندان شاھی میں خانہ جنگی کے بیج بو دیں - انہوں نے نئے سلطان کو رائے دی کہ وہ جونپور اپنے بھائی جلال خاں کے حوالہ کردے - ابراھیم راضی ھوگیا - اور جلال خاں معہ کچھ امیروں کے جونپور چلا بھی گیا - مگر راپڑی کے حاکم خانجہان نوحانی نے اس کارروائی کے خلاف آواز بلند کی - اس نے درباری امیروں کو بہت کچھ برا بھلا کہا اور ابراھیم کو رائے دی کہ جلال خاں کو واپس بلالے - مگر چڑیا اب پنجرے سے اڑ گئی تھی - جلال خاں

بھلا کیوں واپس آتا - اور شاید آ بھی جاتا تو امیر اسے کب آنے دیتے - چنانچہ ابراہیم کا بہت سا قیمتی وقت اس جونپور والے ہنگامہ کے فرو کرنے میں صرف ہوا۔ وہ امیروں کی جانب سے بد ظن ہوگیا اور اس نے ان کو پسپا کرنے کے لئے ہر جایز و ناجایز طریقہ اختیار کیا - دربار میں وہ انہیں کھڑا رکھتا تھا - اور طرح طرح سے انہیں ذلیل و خوار کرتا تھا - بہتوں کو اس نے قید کر لیا اور انہیں قتل کروا دیا - نتیجہ یہ ہوا کہ امیر سرکش ہو گئے اور انہوں نے ہر طرف شورش بپا کی - اعظم ہمایوں کوری دریا خاں نوحانی ' میاں حسن فرملی ' ناصر خاں نوحانی ' وغیرہ نے بغاوت کی آگ کو بھڑکایا - اُدھر پنجاب میں دولت خاں لودی نے سلطان کی درشت خوئی سے بچنے کے لئے بیرونی امداد حاصل کرنے کا انتظام کیا - دور سلطنت کا یہ آخری سیاسی انقلاب تھا جس کے بانی امیر تھے اور جس کے بعد ہندوستان کی تاریخ کا آغاز ایک نئے عنوان سے ہوتا ہے -

اس مجمل تبصرہ سے طبقہ امراء کی سیاسی اہمیت کا صاف اندازہ ہو جاتا ہے - ظاہر ہے کہ ان کی ہستی امور ملکی کے واسطے کتنی ضروری تھی - کتناہی ہوشیار اور ذی فہم بادشاہ کیوں نہ ہو مگر بلا صلاح و مشورہ کے اس کے واسطے سلطنت کا کام چلانا غیر ممکن تھا - بلبن ' علاءالدین خلجی ' محمد تغلق ایسے مطلق العنان فرمانرواؤں کو بھی مشورے کی ضرورت پڑتی تھی - اس کے علاوہ ایک شخص کے واسطے تن تنہا مشکل تھا کہ نظام حکومت کی ہر ایک بات کو ذہن میں رکھ سکے - دوسرے اتنی بڑی سلطنت کے انتظام کے واسطے حکام و عہدہ داران چاہئے تھے - سلطان انہیں لوگوں کا اعتبار کر سکتا تھا جن کو اس کا قرب حاصل تھا اور جن کو قرب حاصل تھا ' ان کا شمار دائرہ امارت میں کیا جاتا تھا - پس اگر سلطنت کو ایک جنگ انسانی سے تشبیہ دیجائے تو سلطان بمنزلہ

حرارت غریزی ہے اور امیر اس کے اعضاء - جب تک کہ جسم کے ان دونوں حصوں میں ٹھیک تناسب قائم رہتا تھا امور سلطنت بآسانی انجام پاتے رہتے تھے - لیکن ان میں سے اگر کسی میں بھی فرق پڑ جاتا تو سیاسی فضا میں ایک ھنگامہ برپا ہو جاتا تھا - حرارت کے بڑھنے اور گھٹنے دونوں حالتوں میں تمام اعضا بیکار ھوجاتے تھے - یعنی یہ کہ اگر سلطان بالکل ھی امیروں کی پروا نہ کرتا تب بھی سلطنت کو نقصان پہنچ جاتا تھا کیونکہ انتہا درجہ کی مطلق العنانی سے[۵] سوائے ضرر کے نفع کی کم امید ھوتی ہے یا اگر سلطان امیروں پر ھی سلطنت کا سارا بار ڈالدیتا اس حالت میں بھی نفع کے بجائے نقصان ھی ھو جاتا تھا پس حکومت کے ان پرزوں کو کار آمد رکھنے کے لئے سلطان کو نہایت ھی دور اندیشی و دانشمندی سے کام لینا پڑتا تھا - لیکن کوئی خاندان تا بہ ابد قائم نہ رہ سکتا تھا اسلئے ایسے قابل لوگوں کی بھی وقتاً فوقتاً ضرورت پڑتی رھتی تھی جو موجودہ خاندان کی تباھی کے بعد ایک نئے خاندان کی بنیاد ڈال سکیں - عہد سلطنت کے امیروں نے اس کام کو نہایت ھی خوش اسلوبی سے انجام دیا - پس اگر ان کے کئے ہوئے انقلابات کے برے پہلو ھیں تو اچھے بھی ھیں -

طبقہ امراء کی سیاسی حیثیت و قدرت پر بحث کرنے کے بعد یہ بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کچھ روشنی اس کے اقتصادی و معاشرتی حالات پر بھی ڈالی جاوے - اس میں شک نہیں کہ امیروں کے پاس روپیہ کثرت سے ھوتا تھا - ممالک غیر سے لوگ آتے ھی اس لالچ سے تھے کہ ھندوستان میں خوب زر اندوزی کریں گے - دوسرے عہد سلطنت کے آغاز میں فرمانرواؤں نے ملک کو تسخیر کرنے کی ایک عجیب و غریب ترکیب سوچی تھی ' وہ یہ کہ جب کوئی سردار افغانستان وغیرہ سے آتا تھا

تو اس کے حوالہ کوئی غیر مسخر علاقہ کردیا جاتا تھا - اس کو پوری آزادی رہتی تھی کہ کسی طرح سے بھی اس پر قبضہ کرلے ' جو کچھ مال غنیمت اس کے ہاتھ لگے وہ سب اپنے پاس رکھے ' کبھی کبھی اس میں سے تھوڑا بہت بطور تحفہ سلطان الوقت کے پاس بھیجدیا جاتا تھا - اختیارالدین بن بختیار خلجی کے کار نامے اس رویہ کے ثبوت میں پیش کئے جاسکتے ہیں - ایسے سرداروں سے صرف اتنی ہی امید کیجاتی تھی کہ وہ سکہ و خطبہ سلطان کے ہی نام کا ملک مفتوح میں جاری رکھیں - دوسرے ہندوؤں کی سرکشی کو دور کرنیکے واسطے سلاطین کو متواتر جنگ کرنا پڑتی تھی - دوران جنگ میں دشمنوں کے مال و جائداد کو چھین لینا قطعاً جائز تھا - امراء کی آمدنی کا یہ دوسرا ذریعہ تھا - اس کے علاوہ امراء کی اصلی آمدنی اقطاع و شغل سے ہوتی تھی - ہر ایک بڑے امیر کے تعلق سلطنت کے کسی نہ کسی شعبہ کا انتظام کر دیا جاتا تھا - اُس شعبہ کی آمدنی کا کچھہ حصہ تو وہ خزانہ عامرہ کو بھیجدیتا تھا اور بقیہ یا تو اپنی فوج پر صرف کرتا تھا یا اس کو اپنی جیب میں رکھتا تھا - اس عہد میں سرکاری عہدہ داران کی کیا تنخواہ تھی ؟ اس کا مسلسل اندازہ کرنا تو ممکن نہیں لیکن مورخین نے وقتاً فوقتاً جو واقعات قلمبند کئے ہیں اُن سے کچھہ موٹے موٹے نتایج ضرور نکالے جا سکتے ہیں - مثلاً التمش نے ملک سیف الدین ایبک کو سر جامداری کی جگہ پر متعین کرتے وقت اس کی تین لاکھہ جیتل تنخواہ مقرر کی - مگر سیف الدین کو اس سے اطمینان نہ ہوا ' جب التمش کو یہ معلوم ہوا تو اس نے سیف الدین سے دریافت کیا کہ کیا بات ہے - سیف الدین نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا ' جہاں پناہ آپ نے فدوی کو ایسے اعلیٰ عہدہ پر ممتاز کیا ہے کہ جہاں رہکر ہندو و مسلم رعایا کو زر اندوزی کی غرض سے

ستانا غیر ممکن ہے اور اس کے علاوہ کوئی اور تدبیر شان و شوکت قایم رکھنے کی ہے نہیں ' جلال الدین فیروز خلجی نے جوش سخاوت میں آ کر ایک ملدھر کے لڑکے کو وکیلدار مقرر کیا اور اس کی تنخواہ ایک لاکھ جیتل - جب کہ جلال الدین نائب سامانہ اور مقطع کیتھل تھا اس وقت ایک بار اس ملدھر کے والد سے اس کا مقابلہ آن پڑا - ملدھر کی تلوار سے جلال الدین کے چہرہ پر ایسے زخم کاری لگے جن کا کہ نشان تمام عمر رہا - چنانچہ اس ملدھر کی جلادت کا خیال کرکے جلال الدین نے اس کے لڑکے کو مورد عنایات کیا - صاحب مسالک الابصار نے محمد تغلق کے عہد کے عہدہ داران کی تنخواہ کا ذکر کیا ہے مثلاً اس کے چاروں وزیر بیس سے لیکر چالیس ہزار تنکہ سالانہ تنخواہ پاتے تھے - دبیران خاص کی تنخواہ دس ہزار تنکہ سالانہ تھی - اور کچہری کی تنخواہ پچاس ہزار تنکہ تک ہوتی تھی - صدر جہاں اور شیخ الاسلام کو ساٹھ ہزار تنکہ سالانہ ملتے تھے - اور محتسب کو ایک گاؤں ملا ہوا تھا جس کی آمدنی آٹھ سو تنکہ تھی - خان کی تنخواہ ۲ لاکھ تنکہ ہوتی تھی - اس میں سے اُسے کچھ بھی فوج پر صرف نہ کرنا پڑتا تھا - ملک کی تنخواہ پچاس ساٹھ ہزار تنکہ کے درمیان ہوتی تھی اور امیر کی تیس چالیس ہزار کے درمیان - سپہ سالار کی تنخواہ تقریباً بیس ہزار تنکہ - دیگر حکام کی ایک ہزار سے لیکر دس ہزار تک - مملوک پانچسو تنکہ سالانہ پاتے تھے - یہ تنخواہ انکو نقد دی جاتی تھی - اغلب ہے کہ شہاب الدین کے بیان میں مبالغہ ہو - لیکن ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ جب محمد تغلق نے خداوند زادہ ضیاء الدین کو میر داد مقرر کیا تو اس کو پچاس ہزار دینار سالانہ کی جاگیر بھی عطا کی - خود ابن بطوطہ کو پہلے پہل پانچ ہزار کی جاگیر ملی - اس کے بعد اس کی تنخواہ بارہ ہزار دینار سالانہ ہو گئی - سراج عفیف لکھتا

ہے کہ فیروز شاہ نے اپنی وزیر خانجہاں کی تیرہ لاکھ تنکہ تنخواہ مقرر کی اور اس کے امیروں میں سے کسی کی بھی تنخواہ چھہ یا آٹھ لاکھ تنکہ سے کم نہ تھی - چنانہ اس عہد میں جتنے خان اور ملوک تھے سب ہی روپیہ سے مالا مال تھے - جب ملک شاہین شحنہ و نائب امیر مجلس خاص نے انتقال کیا اور اس کے مال متروکہ کی جانچ کی گئی تو پچاس لاکھ تنکہ نقد علاوہ دیگر جواہرات و نفائس کے ملے - اسی طرح سے عمادالملک بشیر سلطانی کے بارے میں عفیف نے لکھا ہے کہ اس کے پاس کروڑوں روپیہ تھا - ایک بار اسکو ٹاٹ کی تھیلیاں بنوانے کی ضرورت پڑی تو ڈھائی ہزار تنکوں کا ٹاٹ خرید کیا گیا - جب عمادالملک کے سامنے روزانہ کا حساب پیش ہوا تو اس نے اس رقم پر اعتراض کیا اور کہا جبکہ خزانہ زیادہ ہوگیا ہے تو اس کو تھیلوں میں رکھنے کی ضرورت نہیں اس کو کوٹھوں میں غلہ کی طرح بھر دینا چاہئے چنانچہ ایسا ہی کیا گیا - عہد لودی میں ایک امیر میاں محمد کالا پہاڑ کے پاس ۳۰۰ من سونا تھا - زمانہ سلطنت میں اس قسم کی کثرت سے مثالیں ملتی ہیں جن سے کہ امیروں کی امیری میں کوئی شک نہیں رہجاتا ہے -

لیکن یہ امیر جتنے روپیہ کے امیر تھے اتنے دل کے بھی تونگر تھے چونکہ ان کی تمام دولت و جائداد ذاتی ہوتی تھی اسواسطے اُن کو کفایت شعاری کا مطلقاً خیال پیدا نہوتا تھا - دوسرے اپنی شان و شوکت قایم رکھنے کیلئے انکو لازم تھا کہ وہ فراخ دلی سے خرچ کریں - بلبلی امیر ملک علاءالدین کشلیخاں کے بارے میں روایت ہے کہ جود و بذل میں یکتائے روزگار تھا - اس وقت خواجہ شمس معین بقید حیات تھا اس نے ایک نظم علاءالدین کی مدح میں لکھی اور دربار بلبلی کے مطربوں کو یاد کرادی -

جب وہ پڑھی گئی تو علاءالدین نے اپنے اصطبل کے تمام گھوڑے شمس معین کو بطور انعام کے دیدئے اور مطربوں کو دس ہزار تنکہ دیئے - اسی زمانہ میں ایک اور ملک تھا جس کا نام تھا عمادالملک راوت عرض - اس کے ساتھ کچہری کے ۵۰ یا ۶۰ اہلکار روز کھانا کھاتے تھے - اس کو پان کھانیکی اتنی عادت تھی کہ پچاس یا ساٹھہ تنبولی ہر وقت پان لگانے میں مصروف رہا کرتے تھے - تیسرے ملک فخرالدین کوتوال دھلی کی یہ کیفیت تھی کہ اس کے یہاں دس بارہ ہزار قرآن خوان ملازم تھے - وہ ہر روز ایک نیا جوڑا پوشاک کا پہنتا تھا اور اترے ھوئے لباس کو انعام میں دیدیتا تھا اتناھی نہیں بلکہ اس کی چارپائی اور بسترے بھی روز نئے ہوتے تھے - ہر سال ہزاروں لڑکیوں کے واسطے جہیز فراہم کرتا تھا - ایسے ھی بلبلی دور میں ایک اور امیر تھا جس کا نام امیرعلی سر جامدار تھا امیر خسرو اسی کے پاس ملازم تھا - یہ امیر سو تنکہ سے کم کبھی کسی کو دیتا ھی نہ تھا - لفظ جیتل تو اس کی زبان سے نکلتا ھی نہ تھا اسکی سخاوت کی خبر سن کر بلبن کو بڑی خوشی ہوتی تھی - ایک بار بادشاہ نے اسکو طلب کیا اور کہا - اے امیرعلی میں نے سنا ھے کہ تو شراب کے نشہ میں ہو کر اتنی دریادلی سے دولت لٹاتا ھے - ماننے کی تو جب بات ھے کہ اگر تو ہوش وحواس کے عالم میں کسی کو کچھہ دے - یہ سنتے ھی امیرعلی نے شراب سے توبہ کرلی لیکن اپنی سخاوت میں ذرا بھی کمی نہ کی بلکہ اسمیں افزائش ھی کی - برنی لکھتا ھے کہ بلبن کے زمانہ میں اسکے امیروں کے درمیان حسد نہ تھا بلکہ اگر ایک کو معلوم ھو جاتا کہ فلاں کے یہاں پانچ سو آدمی کھانا کھاتے ھیں تو وہ اپنے یہاں ایک ہزار کو کھلاتا - اسی طرح سے اگر کسی کو پتہ چلتا کہ فلاں سواری کے وقت دو سو تنکہ صدقہ دیتا ھے تو وہ چار سو دیتا حتی کہ کثرت ایثار کی وجہ سے امراء و ملوک ھمیشہ قرض کی زنجیر سے جکڑے رھتے تھے -

جس وقت کہ جلال الدین فیروز خلجی عرض ممالک تھا اُسی زمانہ سے اس نے امیر خسرو کی سرپرستی شروع کردی اور بارہ ہزار تنکہ جو کہ امیر کے والد کا وظیفہ تھا اس کے لئے مقرر کر دیا - اس کے زمانہ میں ملک قطب الدین علوی تھا جو کہ بیرون اندازہ خیرات کرتا تھا - روایت ہے کہ اپنے بڑے لڑکے کی شادی کے موقع پر اس نے دو لاکھ تنکے صرف کئے اور عقد والے دن سو گھوڑے مع ساز کے اس نے بخشش میں دئے اور ایک ہزار آدمیوں کو جوڑے پہنائے - اُسی کا ساتھی تھا ملک احمد چپ جس نے ایک روز شاہی مطربوں اور ندیموں کو مدعو کیا اور ان کو ایک لاکھ تنکے انعام میں دئے اور دو یا تین سو خلعتیں دیں - ملک نصرت صباح کی ایسی عادت تھی کہ وہ کسی سائل کو اپنے در سے واپس نہ کرتا اور کسی نہ کسی طرح سے اس کی حاجت براری کرتا - اپنی سخاوت کی وجہ سے وہ ہمیشہ مقروض رہتا تھا اور قرض خواہ اس کا پیچھا نہ چھوڑتے تھے - علاءالدین کے عہد میں تو امیر قریب قریب مفلس ہی ہوگئے - اس کی وفات کے بعد امیروں نے پھر سے دولت جوڑنا شروع کی - اس کے بیٹے کے وزیر خسرو خاں کا بہت بڑا عملہ تھا اور جب موقع آیا تو اس نے دونوں ہاتھوں سے روپیہ لٹایا - غیاث الدین کے زمانہ میں کسی ایسے امیر کا ذکر نہیں ملتا جو روپیہ صرف کرنے میں عالی حوصلہ ہو - مگر محمد تغلق کے عہد میں کئی مثالیں اس قسم کی دستیاب ہوتی ہیں - میر قبول ایک ایسا امیر تھا جو صرف اپنے ذاتی عملہ پر ۳۰ ½ لاکھ تنکے سالانہ صرف کیا کرتا تھا - ابن بطوطہ اگرچہ معمولی عہدہ دار تھا تب بھی ہمیشہ قرض خواہوں کے تقاضوں سے عاجز رہتا - چنانچہ اس اذیت سے نجات پانے کے لئے اس نے سلطان کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا جس کے صلہ میں خزانہ عامرہ سے اس کا قرضہ ادا کر دیا گیا - فیروز

تغلق کے عہد میں بشیر سلطانی نے چار ہزار زر خرید غلاموں کو ازاد کر دیا اور ان کو انعامات بھی دئے - وزیر خانجہان نے ایک جوز موزے پر اسی ہزار تلکے صرف کئے - قاضی صدر الملک کے لڑکے نے ایک طوائف سے تعلق کر لیا تھا جس کے واسطے ہر روز پانچ چونہ مرواریدی درکار ہوتا تھا - ارر یہ فراہم کیا جاتا تھا - سید اور لودیوں کے عہد میں امراء کا یہی رویہ جاری رہا -

دولت کی کثرت کی وجہ سے یہ لازم نہ تھا کہ امیر لوگ نالایق ہوتے برخلاف اِس کے چونکہ اس دور کے بادشاہ خود تعلیم یافتہ ہوتے تھے اور علوم و فنون کی سرپرستی کرتے تھے اس لئے امراء کی ہمیشہ یہ کوشش رہتی کہ اپنے ذاتی صفات کو ترقی دیتے رہیں ' یہ لوگ علما و فصحا کی صحبت سے ہمیشہ فیض یاب ہوتے رہتے تھے اور اپنی لیاقت کو بڑھانے کا کوئی موقع چھوڑتے نہ تھے - ان کو اس کی ضرورت بھی تھی کیونکہ بغیر لیاقت کے امور ملکی میں کامیابی و عروج حاصل ہونا غیر ممکن تھا - منہاج سراج نے لکھا ہے کہ التمش کے امیر حاجب نے پڑھنے لکھنے میں اتنا وقت صرف کیا کہ وہ ہر دلعزیز ہوگیا - امیر صرف سپاہی نہ ہوتے تھے بلکہ منشی و دبیر بھی - بلبن کے زمانہ میں تودرس و تدریس ' شعر و شاعری کا اتنا چرچا ہوا کہ سلطنت کے امیر کے پاس شعراء و فضلا کا ایک گروہ رہنے لگا - اور جس طرح امیر لوگ بذل و سخا میں ایک دوسرے سے مقابلہ کرتے تھے ویسے ہی علمی لیاقت میں بھی - دیسی لوگوں کو طبقہ امراء سے الگ کرنے میں شاید بلبن کا ایک مقصد یہ بھی ہو کہ ملک میں علم کی اشاعت بڑھے کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ نو مسلموں کی جو کہ زیادہ تر ادنیٰ فرقوں کے ہوتے تھے اتنی جلدی علمی استعداد بڑھنا غیر ممکن تھا - یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ عموماً امیر تعلیم یافتہ ہوتے

تھے - ان میں سے اکثر کی تصنیفات کا ذکر تاریخوں میں آیا ہے - مثلاً قوام الدین علاقہ جس نے فتح نامہ لکھنوتی تصنیف کیا - کبیرالدین پسر تاج الدین عراقی جس نے تاریخ علائی لکھی - تاتار خاں جس نے تفسیر تاتار خانی اور فتاوائے تاتار خانی تصنیف کئے - ان کے علاوہ اور بھی متعدد مثالیں اسی قسم کی دستیاب ہوسکتی ہیں - اس سے ظاہر ہے کہ عہد سلطنت میں طبقہ امرا نے اپنی محنت و جانفشانی - جود و سخا سے نخل علوم و فنون کو سرسبز و شاداب رکھا -

مگر اعلیٰ تعلیم نے ان کے طرز معاشرت پر کوئی نمایاں اثر نہیں ڈالا - اور ان لوگوں میں وہ تمام نقص قائم رہے جن کا کہ آج تک امیروں سے تعلق ہے - بجز معدودے چند کے سب ہی کو شراب نوشی کی عادت تھی - اس کے ساتھ قمار بازی بھی ہوتی تھی - نصرت صباح کے بارے میں برنی نے تحریر کیا ہے کہ جس مجلس میں وہ جاتا تھا جوا ضرور کھیلتا تھا - اور وہ بھی معمولی نہیں بلکہ اعلیٰ پیمانہ پر - رقص و سرود کی محفل تو روزانہ ہی کسی نہ کسی امیر کے یہاں جمی ہی رہتی تھی - مطربوں اور سازندوں کی حد سے زیادہ مانگ تھی - اگر رقص و سرود کی نفاست ہی کسی زمانہ کی تہذیب کا معیار ہے تو واقعی امرا و سلاطین کی سرپرستی سے یہ فن اس عہد میں کمال کو پہنچ گیا تھا - جس کا شاھد ضیاءالدین برنی ہے - اس کے علاوہ بادشاھوں کی طرح امیر بھی متعدد شادیاں کرتے تھے اور کثیرالاولاد بھی ہوتے تھے - چنانچہ عفیف کا قول ہے - 'خانجہاں را پسراں بسیار بودند زیرا چہ او رغبت بحرم بسیار داشت و برائے جمع کردن حرم کوشش بسیار گماشت - کنیزکان صاحب جمال باکمال در حرم خود جمع کنانید چنانچہ گویند دو ھزار کنیزک از زمین روم و چین در حرم خود داشت' - امیر اپنی عورتوں کو

پردے میں رکھتے تھے - تاتار خاں اپنی کنیزکوں کو گھوڑوں پر سوار نہ ہونے دیتا تھا بلکہ بورکہ میں بٹھلا کر ایک جگہہ سے دوسری جگہہ جانے دیتا تھا اور اُن کے پردے کا معقول انتظام رکھتا تھا - لیکن اس عہد میں بھی بعض امیر ایسے ہوتے تھے جو اپنی عورتوں کو گھوڑوں پر سوار کرکے اپنے ساتھہ سیر و شکار میں لے جاتے تھے - لیکن یہ رواج عام نہ تھا - ابن بطوطہ لکھتا ہے - 'عورتیں اس ملک میں ڈولیوں میں آتی جاتی ہیں........ اور ان ڈولیوں پر ریشم کے پردے پڑے رھتے ھیں' - امیروں کے درمیان دعوت کی ترتیب اور اُس کے آداب کیا تھے اس کا مشرح حال ابن بطوطہ کی مندرجہ ذیل تحریر سے معلوم ہوتا ھے :— 'پہلے روٹیاں لاتے ھیں جو نہایت پتلی چپاتیاں ہوتی ھیں - بکری کو بھون لیتے ھیں اور اس کے چار یا چھہ ٹکڑے کرکے ایک ایک آدمی کے سامنے رکھے جاتے ھیں - - پھر گھی میں تلی ہوئی روٹیاں لاتے ھیں جس کے جوف میں حلوائے صابونیہ بھرا ہوتا ھے اور ہر ایک ٹکیہ کے اوپر ایک میٹھی روٹی رکھتے ھیں جس کو خشتی کہتے ھیں اور اس کو آٹے شکر و گھی سے بناتے ھیں اور پھر ایک چیز لاتے ھیں جس کو سموسہ کہتے ھیں اور وہ قیمہ کیا ہوا گوشت ہوتا ھے - اس میں بادام اور جائفل اور پستہ اور پیاز اور گرم مسالہ ڈالکر پتلی چپاتیوں میں اُس کو لپیٹ دیتے ھیں اور پھر گھی میں تل لیتے ھیں - ہر ایک شخص کے سامنے چار یا پانچ سموسہ رکھتے ھیں اور پھر چاول گھی میں پکے ہوے لاتے ھیں اور اُس کے اوپر مرغ ہوتا ھے - پھر لقیمات القاضی لاتے ھیں اور اس کو ھاشمی بھی کہتے ھیں - پھر قاھریہ لاتے ھیں حاجب کھانا شروع کرنے سے پہلے دسترخوان پر کھڑا ہو جاتا ھے اور وہ اور سب حاضرین بادشاہ کی تعظیم کرتے ھیں........اور جب یہ کر چکتے ھیں تو دسترخوان پر

بیٹھتے ہیں اور کھانا شروع کرنے سے پہلے چاندی اور سونے اور کانچ کی پیالیوں میں مصری اور گلاب کا شربت پیتے ہیں - جب شربت پی چکتے ہیں تو حاجب بسم اللہ کہتا ہے اس وقت سب کھانا شروع کر دیتے ہیں کھانا ختم ہونے پر فقاع کے پیالے آتے ہیں اور جب فقاع پی چکتے ہیں تو پان سپاری آتا ہے - جب پان سپاری لے چکتے ہیں تو حاجب بسم اللہ کہتا ہے سب اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور جس طرح کھانے سے پہلے تعظیم کی تھی اسی طرح پھر کرتے ہیں اور پھر دسترخوان سے اٹھ کر چلے جاتے ہیں......اس بیان سے ظاہر ہے کہ اس دور میں دعوتوں میں کیا کیا تکلفات ہوا کرتے تھے -

اگر یہ مضمون لوگوں کے خیالات کو اس طرف ملتفت کر سکے کہ عہد سلطنت میں بادشاہوں کے حالات کے ماسوا اور بھی بہت سی دلچسپ باتیں ہیں جن کے بارے میں ہنوز ہماری معلومات محدود ہیں تو میں سمجھونگا کہ میری محنت رائگاں نہیں گئی - جس طرح سے مغلیہ دور کے امراء کے مشرح و مفصل حالات مآثرالامراء میں درج ہیں - اسی طرح اگر اتنی بڑی نہیں تو اس کی نصف یا چوتھائی ضخامت میں عہد سلطنت کے امیروں کے حالات بھی قلمبند کئے جا سکتے ہیں اور اس کی اشد ضرورت ہے -

---

بنارسي پرشاد سکسینا

ملک عنبر

(۱)

بہمنی سلطنت کے زوال کے بعد اُسکے باقیات سے پانچ چھوٹی چھوٹی ریاستیں پیدا ہوئیں ' اُن میں سے ایک ریاست احمد نگر تھی - اسکی تاریخ حیات میں ' تلوار کی جھنکار اور جنگ و جدل کی وحشت زائوں کے علاوہ کوئي ایسي بات نہیں ملتی جو مذہبی یا سیاسی نقطۂ نظر سے قابل توجہ ہو ' احمد نظام شاہ سے لیکر حسین سوم تک کوئی بھی بادشاہ ایسا نہیں ہوا جسکو جا و بیجا جانبہ داریوں کے باعث ہزاروں کیا بلکہ لاکھوں بہادروں کا خون نہ بہانا پڑا ہو - اسلئے یہہ کہنا غیر مناسب نہ ہو گا کہ ابتدا ھي سے اس ریاست کي سرشت میں فتنہ و فساد کا مادہ زیادہ تھا ' یا یوں کہیے کہ اُس کے خون ھی میں ایک قسم کا زہر بھرا ہوا تھا - زبردست اور زبردست راجاؤں اور اُنکے حامیوں اور مخالفوں کی سازشیں ' اور مذہبي مظالم کے نفرت انگیز مظاہرے ' بس شروع سے آخیر تک اس سلطنت کی یہی کہانی ھے - تعجب تو یہہ ھے کہ ان حالات کے باوجود اس ریاست کا جھنڈا تقریباً ایک صدي تک لہراتا رہا اور یہاں کے فرمانروا فخر و ناز سے اپنی گردنیں اونچي کئے رہے -

اگر نگاہ تعمق سے دیکھا جائے تو دنیا کے زیادہ تر کیا تقریباً سبھی ریاستوں اور سلطنتوں کے عروج و زوال کی داستان ایک ہی طرح کی ہے - لیکن احمد نگر کی تاریخ میں خاص بات یہہ ہے کہ ایک بار اُس کا زوال ہو کر پھر اُسکا عروج ہوا ' یہہ کہا جا سکتا ہے کہ یہہ بجھتے ہوئے چراغ کا آخری سنبھالا تھا مگر اُسکے شعلے سے جو آگ بھڑکی اُسنے بڑے بڑوں کے دلوں کو لرزا دیا - جو خوشحالی ' جو کامیابی ' اور جو شہرت ایک صدی کے اندر وہاں کے کسی راجہ کو حاصل نہ ہوئی تھی وہ پچیس سال کے اندر ایک اجنبی ' غیر ملکی حبشی نے اپنی قوت بازو اور دانشمندی سے حاصل کر لی - کیسا عجیب واقعہ ہے کہ جس سیاسی نظام کا بیج ملک عنبر نے بویا اُسکے پھلوں کا مزہ نہ تو خود اسکو اور نہ اُسکے بعد میں آنیوالوں کو ملا بلکہ اسکی لذتوں سے ہندو بہرہ‌یاب ہوئے - عنبر کا نام تو اُس زمانے کی تمام تاریخی کتابوں میں ملتا ہے لیکن اُسکا علحدیدہ مستقل طور پر کہیں ذکر نہیں ملتا - افسوس کی بات تو یہ ہے کہ سنہ ۱۵۹۰ع کے بعد ریاست احمد نگر کی مفصل تاریخ ' فرشتہ کے سوا کسی دوسرے ہمعصر مورّخ نے نہیں لکھی - برہان دوم کی اجازت سے علی بن عزیزللہ طبا طبائی نے برہان ماثر نامی ایک کتاب لکھی لیکن سر اوزلے ہیگ انجہانی کی رائے ہے کہ تاریخی نقطۂ نظر سے یہہ کتاب کوئی اہمیت نہیں رکھتی اور بات بھی یہی ہے - اِسلئے اس کا سہارا لینا فضول ہے - اگر اسکی خیال آرائیوں کا خاتمہ کر کے صداقت کا عنصر دریافت بھی کیا جائے جب بھی عنبر کی زندگی پر زیادہ روشنی نہیں پڑتی -

مذکورہ سلہ عیسوي سے لیکر دس برس تک احمد نگر حوادث کا شکار رہا ، اسی لئے اس ریاست میں نہ کسي مستقل نظام حکومت کي اشاعت کیجاسکي اور نہ کسي طرز تعلیم کی بنیاد قائم ہو سکی - مرتضیٰ نظام شاہ دوم اور حسین نظام شاہ کے دربار میں کسي بڑے ذیعلم شخص کی موجودگی کا ذکر نہیں آتا ، یہي وجہہ ہے کہ اُنکے دربار کی کوئي ایسی تاریخي کتاب نہیں ملتي جس میں اس ریاست کو نئي زندگی دینے والے شخص (ملک عنبر) کے محاسن بیان کئے گئے ہوں -

جس زمانے میں عنبر نے عملي دنیا میں قدم رکھا اس زمانے میں احمدنگر کا نام ہي نام باقي رہ گیا تھا ، اُسکا خاکہ بگڑ چکا تھا اور اُسکي شہرت فنا ہو چکي تھی - اقبالمند اکبر نے احمد نگر کے قلعہ پر قبضہ کر ہی لیا تھا اور اپنے بڑے بڑے سرداروں کو جنوبي سر حد کی نگرانی کے لئے مقرر کر دیا تھا ، اُدھر عادل شاہ اور قطب شاہ اس ریاست کے ٹکڑوں کو ہڑپ کر لینے کے لئے منھہ کھولے بیٹھے تھے - یعني یہہ کہ اپنے مقاصد کي تکمیل کے لئے عنبر کو اپنے ہمعصر تمام فرمانرواؤں کی دشمني مول لینا پڑي - یہی وجہ ہے کہ مغل عادل شاہي اور قطب شاہي کتابوں میں عنبر کا ذکر تو ضرور ملتا ہے لیکن مفصل حال نہیں ملتا - بھلا اپنے دشمن کا خصوصیت سے کوئي کیوں ذکر کرتا - مغلوں نے تو اُسکو بہت ہي تلخ اور نفرت انگیز الفاظ میں مخاطب کیا ہے - خود جہانگیر نے جو اپني تہذیب اور مروت کے لئے مشہور ہے ، عنبر کو " کلمونہا " (سیاہ رو) بدبخت اور بدذات کہہ کر اُسکي اہانت کي ہے -

معتمد خان نے اُسے بد بخت کہہ کر اپنی نفرت ظاہر کی ہے ' خافی خان اپنی جنوبی ہند کی تاریخ میں لکھتا ہے کہ برہان‌پور کے امرا نے شہنشاہ جہانگیر کے پاس عرضداشت بھیجی جس میں یہ جملے لکھے تھے کہ " اگر اس کالے رنگ والے اور داغدار نسل کے غلام کی تنبیہ کا مناسب انتظام نہ کیا جائیگا تو ہم راجپوت بہادروں کیطرح اپنی جانوں کو فدا کردینگے - بیجا پور اور گولکنڈا والوں نے بھی اِسی قسم کے الفاظ کا استعمال کیا ہے - مرہٹوں سے یہ امید تھی کہ وہ عنبر کے حالات زندگی پر کچھ زیادہ روشنی ڈالینگے ' کیونکہ ایک طرح سے وہی اُن کو سیاسی زندگی بخشنے والا تھا لیکن ایک مسلمان کے احسان کا اُن کو کیونکر اعتراف ہو سکتا تھا -

مواد کی اتنی کمی ہونے کے باوجود اُس زمانے کی کتابوں کے متفرق بیانات کی بنیاد پر ' عنبر کے حالات زندگی پر تھوڑی بہت روشنی تو ضرور ہی ڈالی جا سکتی ہے - اس میں شک نہیں کہ وہ حبشیوں کی نسل کا تھا ' اُسکی ایک تصویر سے جو مسٹر ان ' سی ' مہتا کے پاس ہے پتہ چلتا ہے کہ وہ سیاہ رنگ کا لمبا تڑنگا آدمی تھا ' اُس کی باہیں لمبی اور گاودم ' اُس کا سینہ چوڑا ' کمر شیر کی کمر کی طرح پتلی اور گردن موٹی اور مضبوط تھی - اُس کے جسم کے ایک ایک عضو سے پھرتی ٹپکتی تھی ' اس کے چہرہ سے بہادری ' ہونٹھوں سے ثبات عزم اور آنکھوں سے دور اندیشی نمایاں تھی - سچ تو یہ ہے کہ وہ سرداری کے بہت سے صفات کی اپنے میں اہلیت رکھتا تھا -

بخارا اور بغداد کے بازاروں میں خریدے ہوئے غلاموں نے

ہندوستان کے سیاسی اسٹیج پر قابل قدر کارنامے دکھلائے ہیں - قطب الدین ایبک ، شمس الدین التمش ، غیاث الدین بلبن کے نام تو اس ملک کے قرون وسطی کی تاریخ میں غیر فانی طور پر ثبت ہیں ، عنبر بھی اسی مالے کا ایک قیمتی رتن تھا جوانی میں ابھرنے کے لئے بچپن ہی میں اس کی قسمت پھوٹ گئی تھی - کار کنان قضا و قدر نے اس کو ماں باپ کی محبت اور ان کے سائے سے محروم کر دیا تھا - سوداگروں کے ہاتھ پڑ کر بغداد کے بازار میں بکنے آیا - یہاں میر قاسم یا خواجہ بغدادی نامی سوداگر نے اسے خرید لیا - قاسم اپنا مال بیچنے جنوبی ہند میں آیا - یہاں احمدنگر میں میرک دبیر یعنی چنگیز خاں سے اس کا سودا پٹ گیا - اور اس نے اس گاہک کے ہاتھ عنبر کو بیچ ڈال - قسمت کے کھیل تو دیکھئے کہ آدمی کو کیا کیا ناچ نچاتی ہے - کہاں حبش اور کہاں ہندوستان - کون جانتا تھا کہ جب عنبر گھر سے نکل کر پردیس میں پہونچے گا تو عزت و شہرت کے بام فلک تک پہونچ جائیگا - چنگیز خاں خود حبشی تھا - بات کی بات میں اپنے ہموطن کے صفات کو پہچان گیا - سمجھ گیا کہ غلام ہے تو کیا ہوا ، یہہ نوجوان ہونہار ہے - اپنی حیثیت و عزت کے قیام کے لئے اس نے ایک ہزار غلاموں کی ایک پلٹن بنائی تھی - اسی فوج میں اس نے عنبر کو بھی داخل کر لیا -

اس زمانے میں احمد نگر کا حکمران مرتضی اول تھا ، تخت حکومت پر بیٹھنے کے وقت وہ صرف ایک لڑکا تھا ، اسی وجہہ سے بعد کے چھہ سال تک عنان حکومت کی ماں خوانجہ همایوں

کے ہاتھ میں رہی ' مرتضیٰ کو سیاسی امور کی طرف نہ دلچسپی تھی اور نہ اُس کو اُس کی ضرورت محسوس ہوتی تھی ' وہ اپنا وقت کھیل کود یا پڑھنے لکھنے میں صرف کیا کرتا تھا - ماں نے بیٹے کی بے توجہی کو دیکھ کر ہاتھ پاؤں پھیلانا شروع کیا - بڑے بڑے عہدوں پر اپنے رشتہ داروں کو مقرر کیا اور جن لوگوں سے اُس کو خطرہ تھا اُن کو سرکاری نوکری سے بر طرف کر دیا - بہت ہی جلد سلطنت کے خاص خاص عمال خوانجہ کے اس طرز عمل سے بد دل ہو گئے - اور اُنہوں نے ملکہ کے خلاف سازشیں شروع کردیں - اِس تحریک کے سربرآوردہ لوگ زیادہ تر یہی غیر ملکی حبشی تھے - اُنہوں نے مرتضیٰ کو اُس کی ماں کے خلاف اوبھارا اور اُس کو تخت سے علحدہ کر دینے کی صلاح دی - ایک بار جب مرتضیٰ کو صاف طور پر یہہ معلوم ہو گیا کہ وہ کتنی سخت بیڑیوں میں جکڑ ہوا ہے تو اِن بندشوں سے آزادی پانے کے لئے اُس نے کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا ؛ چنانچہ جلد ہی اُس کی تدبیریں کارگر ہو گئیں - خوانجہ کو شاہی محل کے عیش و آرام کے بدلے قید خانہ کی تکلیف اُٹھانی پڑی ' اور سلطنت کو اپنے ہاتھ میں لیتے ہی مرتضیٰ نے اپنی ماں کے طرفداروں کو نکال باہر کیا اور اُن کی جگہوں پر اپنے نئے حلقۂ احباب میں سے لوگوں کو مقرر کیا اور اس موقع پر میرک دبیر یعنی چنگیز خاں کی قسمت چمکی ' کیونکہ اُس کو سپہ‌سالار کا رتبہ عطا ہوا -

چنگیز نے اپنے مالک کی جی جان سے خدمت کی ' سنہ ۱۵۶۹ع میں عادل شاہی فوج کو اُس نے حدود سلطنت سے نکال باہر

کیا اور علی عادل شاہ کو مجبور کیا کہ وہ بدر اور برار پر نظام شاہی تسلط تسلیم کرے ، اس بہادر سپاہی کی شہرت و ناموری کو دیکھکر ، دوسرے نظام شاہی سردار جلنے لگے - بدر کے حملے کے زمانے میں موقع پاکر انہون نے مرتضیٰ کے کان بھرے کہ چلگیزخان کا دل ، حسد اور برائی سے آلودہ ہے ، لیکن اس کا یہ خیال ہے کہ بدر پر قبضہ کرکے ، اپنی علحدہ خود مختار حکومت قائم کرے - چلگیز کو اپنے دشمنوں کی فریب کاریوں کا ذرا بھی پتہ نہ چلا ، سیدھے سپاہی کے طرح وہ اپنے مقصد کی تکمیل میں لگا رہا ، اسی لیے وہ اپنے مالک کے اندیشوں کا تدارک نہ کر سکا - چنانچہ جب ایک دن مرتضیٰ نے کہا کہ میں تھک گیا ہوں اور ہم لوگوں کو گھر واپس چلنا چاہیے تو چلگیز نے سادہ دلی سے یہ جواب دیا کہ بدر پر بغیر پوری طرح قبضہ کیے ہوئے واپس ہونا مناسب نہیں معلوم ہوتا - یہ سن کر مرتضیٰ کا اندیشہ اور بھی بڑھ گیا اور اس نے شاہی طبیب کے مدد سے چلگیز کو شربت میں زہر ملوا کر پلا دیا - مرتے وقت چلگیز نے مرتضیٰ کو ایک خط لکھا جس میں اس نے بہت سی قیمتی نصیحتیں کیں - رفیع الدین اپنی کتاب تذکرۃالملوک میں لکھتا ہے کہ اگر چلگیز کچھ دنوں اور زندہ رہتا تو سارے دکھنی خطے میں ایک تہلکا مچ جاتا - اس کا خود بھی یہی قول تھا کہ یہ میری زندگی کی تمنا ہے کہ ایک بار شہنشاہ اکبر سے جنگ کروں ، اگر کام آیا تو لوگ یہی نہ کہیں گے کہ میرک دبیر مرگیا اور اگر فتح حاصل ہوئی تو ابدالآباد تک صفحۂ عالم پر میرا نام ثبت رہےگا - یہ تھا ایک بہادر جنگجو کا خیال! -

اپنے سپہ سالار چنگیز کی موت کے بعد (سنہ ۱۵۷۵ء) عنبر سرکاری فوج میں بھرتی ہو گیا، لیکن اب تو نظام شاہی سلطنت کا زوال شروع ہو گیا تھا - اپنی زندگی کے آخری حصہ میں مرتضیٰ پاگل ہو گیا، جنون کے عالم میں اس نے ایک دن اپنے بیٹے حسین کے بستر میں آگ لگادی مگر حسین قسمت کا دھنی تھا، کہ صاف بچ گیا، اُس کا دل مجنون باپ سے بدلا لینے کے لیے بیقرار ہو گیا، چنانچہ جب موقع ملا تو اُس نے مرتضیٰ کو ایک حمام میں بند کرکے نیچے سے آگ جلوا دی - بیچارہ بُھن کر کباب ہو گیا، باپ کے خون سے اپنے ہاتھ آلودہ کرکے حسین گدی پر بیٹھا، آیندہ سازشوں کے خوف سے اپنے پیشوا مرزا خان کے کہنے سے اُس نے نظام شاہی خاندان کے پندرہ شاہزادوں کو قتل کرا دیا مگر تین سال کے اندر ہی مرزا خان نے دغا کی اور اپنے مالک کو قتل کرا دیا - اس قتل و خون کے بعد اس نے برہان دوم کے چھوٹے بیٹے اسمعیل کو لوہ‌گڑھ کے قلعہ سے لاکر احمدنگر کی گدی پر بٹھایا - لیکن مرزا خان بہت دنوں تک آرام سے نہ رہ سکا، اس کے مظالم سے پائہ تخت میں بڑی ہلچل مچ گئی - اپنے خلاف تحریکوں کی اُمڈتی ہوئی گھٹاؤں کو دیکھکر وہ جان کے خوف سے، احمدنگر سے بھاگ نکلا - ریاست کے انتظام کا بار اب جمال خان کے کندھوں پر پڑا، یہ دکھنی مسلمان تھا اور اس کی طاقتوں کی بنیاد میں دکھنیوں کی جماعت تھی جس کا وہ سرغنہ تھا -

جمال خاں نے پیشوا کا عہدہ اختیار کرتے ہی ایک نئے عقیدے کی تبلیغ شروع کی، سولہویں صدی کے آخری نصف حصے

میں مسلمانوں کے ایک انقلابی جماعت نے عوام میں یہ یقین پیدا کرنے کی کوشش کی کہ بارھویں امام یعنی امام مہدی کی پیدایش ھو چکی ھے اور اب اسلام میں ایک نئی بیداری پیدا ھوگی - اس جماعت کے پیرو مہدویہ کہلاتے تھے - جمال خاں بھی مہدوی فرقے میں تھا اور اس نے اِس بات کی کوشش کی کہ احمدنگر اس مہدوی تحریک کا مرکز بن جائے - چنانچہ شیعہ مذھب کو نیست و نابود کرکے مہدویہ عقیدے کو سلطنت کا مذھب قرار دیا - تمام ھندوستان کے مہدویہ عقیدے کے لوگ احمدنگر میں آکر جمع ھو گئے ' انھوں نے جمال خاں کو اپنا خلیفہ تسلیم کیا اور اس کے لیے اپنے تن من دھن کو نثار کر دینے کے لیے آمادہ ھو گئے - جمال خان کے مذھبی خیالات اور اُس کی حکمت عملی برار کے امرا کے لیے ناقابل برداشت ھو گئی ' اور انھوں نے صلابت خان کی سرکردگی میں اُس سے جنگ شروع کردی ' اُدھر بیجاپور کی طرف سے بھی حملہ کر دیا گیا - جمال خان نے بڑی ھمت سے کام لیا ' پہلے صلابت خان کو شکست دی پھر بیجاپوری فوج کی طرف بڑھا ' پندرہ روز تک دونوں طرف کی فوجیں ایک دوسرے کے مقابلے میں رھیں ' آخر میں صلح ھوگئی - جمال خان میدان جنگ سے دارالسلطنت میں واپس آیا اور اس نے اپنا غصہ غیر ملکی لوگوں پر اُتارا ' یعنی تقریباً تین سو آدمیوں کو ملک چھوڑ دینے کی سزا دی گئی - یہ واقعہ سنہ ۱۵۹۰ع کا ھے -

عنبر کو اب سرکاری نوکری کرتے ھوئے پندرہ سال ھو چکے تھے ' احمدنگر کی حالت میں جو انقلابات ھوئے وہ اُنھیں

خاموشي سے دیکھتا رھا ' اس کے سوا وہ اور کرھی کیا سکتا تھا ' کوئی بھي تو غیر ملکي شخص باقي نھیں رہ گیا تھا جس کا وہ سھارا لیتا - جب جمال خان نے تمام غیر مُلکیوں کے خلاف اپنی کارروائي شروع کی اور ان کو احمدنگر سے نکال باھر کیا تو پھر عنبر کي کیا ھستی تي کہ وھاں رُکا رھتا اور اپنی جان کو خطرے میں ڈالتا ' کچھ دنوں ادھر اودھر بھٹکتا پھرا اور جس طرح ھوسکا مصیبت کے دن بسر کرتا رھا - فرشتہ بھی اسي مصیبت میں مبتلا ھوا اور اس نے احمدنگر سے بھاگ کر بیجاپور میں پناہ لي اور وھیں اپني مشھور تاریخ کي کتاب تیار کي -

احمدنگر کي یہ بگڑي ھوئي حالت دیکھکر شھنشاہ اکبر کے منھ میں پاني بھر آیا - اگر ممکن ھوتا تو وہ اسي وقت اس ریاست کو ھڑپ کر لیتا ' لیکن اس کي طاقت اور توجہ تو دوسری طرف تھی - عبداللہ خان اُزبک کي بڑھتي ھوئي ریاست اور اثر کو دیکھکر وہ خائف ھو رھا تھا اور اُس نے اپنی پوری طاقت سلطنت کے شمالی مغربی حدود کو محفوظ رکھنے میں لگا رکھي تھی - تاھم چال سے باز نہ آیا اور اُس نے برھان دوم کو جو بھت دنوں سے اس کي پناہ میں تھا اوبھارا کہ وہ جاکر احمدنگر کے تخت پر قبضہ جمانے کي کوشش کرے - اکبر نے یہ بھی تجویز کی کہ وہ اس کي مدد کے لیے مغل سپاھیوں کی ایک پلٹن ساتھ کر دے ' لیکن برھان نے اسے قبول نھیں کیا ' وہ اپني کوششوں میں کامیاب ھوا ' جمال خان لڑائي میں مارا گیا اور اسمعیل گرفتار کیا گیا اس کے بعد برھان تخت پر متمکن ھوا ' اپنے آبا و اجداد کی طرح اس نے شیعہ مذھب کو از سرنو رائج کیا اور ملک سے نکالے ھوئے بدیسیوں کو پھر سے بلا لیا -

اکبر کو امید تھی کہ برہان اس کا احسان مانے گا، اور تخت پر بیٹھنے کے بعد اس کا اقتدار تسلیم کریگا - لیکن برہان نے ایسا کرنے سے صاف انکار کر دیا - اس پر اکبر بہت خفا ہوا اور بدلا لینے کا موقع ڈھونڈھنے لگا - بیچارا برہان ایک دن بھی سُکھ کی نیند نہ سو سکا، برابر اندرونی اور بیرونی جھگڑوں میں مبتلا رہا - مسلسل محنت، بیماری اور افکار سے وہ تھک گیا اور سنہ ۱۵۹۵ع میں انتقال کر گیا - اس کا مرنا تھا کہ احمدنگر میں خانہ جنگی شروع ہو گئی - اس زمانے میں ریاست میں امیروں کے چار گروہ تھے -

(۱) میاں منجھو اور اُس کے دکھنی متبعین - یہہ لوگ احمد دوم کے طرفدار تھے اور بیجاپور کی سر حد پر اس اُمید پر پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے کہ ابراھیم دوم ان کی مدد کریگا -

(۲) افریقہ کے باشندے - اُبھنگ خاں اور حبش خاں جو شاھزادہ علی کے طرفداروں میں تھے، یہہ لوگ بھی جنوبی سرحد پر اُسی مقصد سے پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے جو پہلے گروہ والوں کا مقصد تھا -

(۳) اخلاص خاں جو ایک دوسری افریقی گروہ کا سردار تھا، دولت‌آباد کے قریب ڈیرا ڈالے ہوئے تھا اور ایک غیر معروف لڑکے موتی شاہ کا طرف‌دار بنا ہوا تھا -

(۴) چاند بی‌بی جو احمد نگر میں ایک بچے بہادر نامی کی حفاظت اپنے ذمہ لئے تھی -

شروع میں اخلاص خاں اور میاں منجھو ھمخیال تھے لیکن بعد میں دونوں میں اختلاف پیدا ہو گیا اور اخلاص خاں نے موتی شاہ کو اپنا سردار تسلیم کر لیا، اِس پر میاں منجھو نے

شہزادۂ سلطان مراد سے جو اس وقت گجرات کا گورنر تھا مدد کی درخواست کی - اکبر تو اس موقع کا منتظر ھی تھا اس نے فوراً ھی مراد اور خانخاناں کو اجازت دیدی کہ اپنی اپنی باقاعدہ فوج لیکر منجھو کی مدد کو پہونچیں - خاندیش کے حکمران علی خاں کو بھی اسی غرض سے ایک خط لکھا - مراد اور خانخاناں نے بڑی تیزی سے کام لیا اور احمد نگر پہونچکر قلعہ کا محاصرہ کر لیا - علی خاں بھی آ تو پہونچا لیکن اُس کی ہمدردی دکھنی بھائیوں کے ساتھ تھی - اخلاص خاں اور ابھنگ خاں نے محاصرہ توڑنے کی کوشش ضرور کی لیکن مغل سرداروں نے اُن دونوں کو پسپا کر دیا - مراد اور خانخاناں کے درمیان رشک و حسد ہونے کے باعث اس فتح سے پوری طرح فائدہ نہیں اُٹھایا جا سکا - آخر میں گولکنڈہ اور بیجا پور سے امدادی فوج کے آنے کا حال سنکر مراد نے چاند بی بی سے صلح کر لی اور ' مغلوں کو اپنی محنت کے بدلے میں ' برار کا صوبہ ملا -

آئی ہوئی مصیبت کو اس طرح ٹال کے چاند بی بی نے بہادر شاہ کی بادشاہی تسلیم کرائی - میاں منجھو نے خانہ جنگی شروع کرنے کی ایک بار اور کوشش کی لیکن ابراہیم دوم نے اُس کو اور اُس کے سردار احمد کو بیجا پور بلا لیا - احمد نگر میں محمد خاں ' پیشوا کے عہدہ پر فائز ہوا لیکن اُس نے اپنے غرور اور مظالم سے وہاں کے امرا کو اسقدر تنگ کیا کہ چاند بی بی کو بیجا پور سے مدد مانگنی پڑی - ابراہیم نے سہیل خاں کے ساتھ ایک فوج بھیجی جو چار مہینے تک احمد نگر کا محاصرہ کئے رہی - محمد خاں نے خانخاناں سے مدد کی درخواست کی

لیکن اُس کی چال معلوم ہو گئی اور وہ قید کر لیا گیا - چاند بی بی نے ابہنگ خاں کو پیشوا کے عہدہ پر مقرر کیا -

ابہنگ خاں کے نیا عہدہ اختیار کرتے ہی غیر ملکیوں کا ستارہ چمکا ' اُس نے حبشیوں کی ایک فوج جمع کی اور اُن کی مناسب تکریم و عزت کی ' اس کی فراخ دلی کا حال سنکر حبشیوں کی ٹولیوں کی ٹولیاں جو ابتک منتشر تھیں احمد نگر آئیں ' عنبر سے بھی نہ رہا گیا ' وہ بھی اُسی طرف روانہ ہو گیا ' سطوربالا میں یہہ کہا گیا ہے کہ جمال خاں کے مظالم سے تنگ آکر عنبر احمد نگر فرار ہو گیا یا ملک بدر کر دیا گیا تھا ' کچھہ دنوں ایدھر اودھر بھٹکنے کے بعد جب روزی کا کہیں سہارا نہ رہا تو وہ بیجاپور پہونچا اور اُس نے وہاں سرکاری نوکری کر لی ' وہیں سے بیٹھے بیٹھے احمد نگر کی خراب حالت کا تماشا دیکھتا رہا - سچ تو یہہ ہے کہ بیجا پور میں اِس کا جی نہیں لگتا تھا ' لیکن احمد نگر آنے کی بھی آسانیاں نہ تھیں - اب جب موقع ملا تو وہ چوکا نہیں ' جیسے ہی وہ اپنے پرانے شہر میں آیا ویسے ہی اُسے ٹھکانے کی نوکری مل گئی - ابہنگ خاں نے اُسے اپنی فوج میں داخل کر لیا -

مغلوں کی زیادتیوں سے مجبور ہو کر ' ابہنگ خاں کو فوراً ہی لڑائی کرنے کی تیاری کرنی پڑی ' اپنی پہلی حکمت عملی کے مطابق اُس نے بیجا پور سے مدد چاہی - لیکن خانخاناں کی قوت اور ہوشیاری کے سامنے گولکنڈہ اور بیجا پور کی متحدہ فوجیں بھی مقابلے پر نہ لڑ سکیں - سنہ ۱۵۹۷ع کے فروری کے مہینے میں دریاے گوداوری کے کنارے سون پت کے مقام پر دکھنیوں کو

شکست فاش ہوئی - احمد نگر پر بدبختی کے کالے بادل گھرنے لگے، اُس کے زوال میں تو کوئی کسر رہ نہ گئی لیکن اگر تھی بھی تو وہ جلد ہی پوری ہو گئی - ابھنگ خاں نے اپنے ہاتھ پاؤں پھیلانے شروع کئے اور اس بات کی کوشش کی کہ عنان حکومت پوری طرح اسی کے ہاتھ میں آ جائے - چاند بی‌بی اس تعقتائی کو کیونکر برداشت کر سکتی تھی نتیجہ یہہ ہوا کہ دونوں کے آپس کے تعلقات میں گنڈیاں پڑ گئیں یہاں تک کہ ابھنگ خاں، چاند بی‌بی کو قید کرنے کا موقع تلاش کرنے لگا - چاند بی‌بی بڑی ہوشیار عورت تھی، اُس نے قلعہ کے پھاٹک بند کر لئے اور محفوظ ہو کر بیٹھ رہی مگر ابھنگ خاں نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا - جب اکبر کو اس خانہ جنگی کا پتہ چلا تو اُس نے دانیال اور خانخاناں کو دکن کی طرف روانہ کیا اور خود بھی اُسی طرف مراجعت کی، خانخاناں اور دانیال نے احمد نگر پر حملہ کیا، ابھنگ خاں نے اُن کو راستے ہی میں روک لینے کی کوشش کی لیکن شاہی فوج کو دیکھتے ہی گھبرا گیا، اور چاند بی‌بی کی مدد تو در کنار، میدان سے نکل بھاگا - اور جُنیر پہونچکر دم لیا - مصیبت کے زمانے میں خود داری کو چھوڑ کر چاند بی‌بی نے اپنے محل کے خواجہ سرا چیتا خاں سے مشورہ کیا اور قلعہ کو مغلوں کے سپرد کر دینے کی رائے قائم کی - چیتا خاں نے دغابازی کی، فوج کو جمع کر کے اُس نے یہہ اعلان کیا کہ چاند بی‌بی تو مغلوں سے ملی ہوئی ہے - سپاہی غصے کے مارے اندھے ہو گئے اور طیش میں آ کر انھوں نے بڑا ہی غضب کر ڈالا یعنی بے گناہ چاند بی‌بی کی

جان لے لی - ادھر مغلوں نے قلعہ کی دیواروں میں سرنگیں پوری کر لی تھیں اور اُن میں بارود بھر دی تھی - جیسے ہی اُن کو چاند بی بی کے قتل کا پتہ چلا ویسے ہی اُنہوں نے بارود میں آگ لگا دی، دھائیں دھائیں کر کے دیواریں جا بجا سے گر گئیں، مغلوں کی فوجیں قلعہ میں گھس پڑیں، اور اُنہوں نے بہادر نظام شاہ کو قید کر لیا اور قلعہ پر اپنا جھنڈا گاڑ دیا -

(۲)

اس طرح سنہ ۱۵۹۹ع میں احمد نگر کی آزادی و خود مختاری کا خاتمہ ہو گیا، لیکن کئی وجوہ سے مغلوں کا اُس پر پوری طرح اقتدار نہ قائم ہو سکا - اصل وجہ تو یہہ تھی کہ سلیم کی بغاوت نے اکبر کو دکھن سے واپسی کے لئے مجبور کیا، دوسرے یہہ کہ بہت سے سردار جو نظام شاہی ملازمت سے برطرف ہو چکے تھے وہ اس امر کی کوشش کرنے لگے کہ اپنے لئے چھوٹی چھوٹی خود مختار ریاستیں قائم کر لیں، ان سرداروں میں سے دو شخص نمایاں طور پر پیش پیش تھے، ایک تو عنبر اور دوسرا راجو پولاد - جس وقت ابھنگ خاں، احمد نگر کے قلعہ کا محاصرہ کئے ہوئے تھا اُس وقت عنبر نے اپنی مستعدی اور کار گذاری سے اپنے مالک کو ایسا خوش کیا کہ اُس نے اس کو ڈیڑھ سو سواروں کا نائک بنا دیا، لیکن جب مغلوں کے آنے سے خوف زدہ ہو کر ابھنگ خاں بھاگ گیا تو عنبر بھی ریاست کے سرحدی صوبے کی طرف روانہ ہو گیا، نہاوندی اور فرشتہ دونوں کا قول ہے کہ تلنگانا کی سرحد سے بیدر کے ایک کوس

تک ، احمد نگر کے دکھن چار کوس تک اور دولت‌آباد سے بیس کوس چیول کے بندرگاہ تک عنبر ہی کا دور دورہ تھا ، یہاں اُس نے چوری اور ڈکیتی کا انسداد کر کے امن قائم کیا ، تھوڑے ہی دنوں میں اُس کے پاس قریب تین ہزار سواروں کی ایک باقاعدہ فوج تیار ہو گئی - اسی فوج کو لیکر اُس نے بدر پر چھاپا مارا ، قلعہ والوں نے اُس کا سامنا کیا لیکن عنبر نے دم کے دم میں اُن‌کو شکست دیدی ، یہہ پہلی آزاد فتح تھی جو عنبر نے اپنی ذاتی قوت بازو سے حاصل کی ، اُس کے بعد اُس کا حوصلہ روز بروز بڑھتا گیا -

جس طرح عنبر بیجاں ریاست کے ایک صوبے میں اپنی خاطر خواہ کارروائی انجام دے رہا تھا ٹھیک اسی طرح راجو پولاد نے بھی دوسرے صوبے میں اپنا اقتدار قائم کر لیا تھا ، اس نے دولت‌آباد کی شمالی سرحد سے لیکر گجرات تک اور دکھن کی طرف احمد نگر کے چھہ کوس کے گرد و نواح کا حصۂ ملک اپنے قابو میں کر لیا تھا - پولاد در اصل امیر سعادت خاں کا غلام تھا لیکن ابھنگ خاں کے کہنے میں آ کر اس نے دغابازی کی اور اپنے مالک کی جائداد پر قبضہ کر لیا - مغلوں کی فتح کے بعد اُس نے ایک نظام شاہی شہزادے ، مرتضی کو جو تخت پر بٹھلایا جا چکا تھا اپنا فرمانروا تسلیم کر لیا اور ضرورت کے مطابق اُسے کچھہ گاؤں اور اوسا کا قلعہ بھی دے دیا - تھوڑے ہی دنوں میں اُس نے آٹھہ یا نو ہزار سوار جمع کر لئے اور مغلوں کی چوکیوں پر چھاپا مارنے لگا ، جو کوئی ملتا اُسے لوٹتا اور کبھی کبھی تو ہاتھی ، گھوڑے اور باردانہ تک اُڑا لیجاتا ،

مگر جب اُس نے عنبر کے عروج کو دیکھا تو اُس کے دل میں حسد کی اگ بھڑکنے لگی، نتیجہ یہہ ہوا کہ دونوں کے درمیان نزاع پیدا ہو گئی اور ایک دوسرے کی جان کا گاہک بن گیا -

ہوشیار خانخاناں ابھی دکھن ہی میں تھا، جب اُسے عنبر اور پولاد کے باہمی جھگڑوں کا پتہ چلا تو اُسکی سمجھ میں آیا کہ موقع اچھا ہے، ایک ایک کر کے دونوں کو شکست دیکر اُنکی طاقت اور ترقی کی جڑ ہی کاٹ دینا چاہیے، اس خیال کے ماتحت سنہ ۱۰۰۹ع میں خانخاناں نے ایک فوج اس مقصد سے بیجھی کہ تلنگانا کی سرحد پر جو عنبر کے مقبوضات ہیں قبضہ کر لے، مغلوں کو شروع میں اپنے مقاصد میں کامیابی تو ہوئی لیکن عنبر نے جلد ہی اُن کو پسپا کر دیا - اب خانخاناں نے اپنے بڑے بیٹے ایرج کو پانچ ہزار سواروں کے ساتھ عنبر کی تنبیہ کے لئے روانہ کیا - ناندیر کے قریب دونوں فوجوں میں سخت جنگ ہوئی، عنبر زخمی ہو کر گھوڑے پر سے گرپڑا ممکن تھا کہ وہ قید بھی ہو جاتا لیکن اس کے حبشی اور دکھنی غلام اُس کو میدان جنگ سے اُٹھا لیگئے - تندرست ہو جانے پر اُس نے پھر فوج بھرتی کرنا شروع کر دی، یہہ دیکھ کر خانخاناں نے اُس سے مصالحت کی سلسلہ جُنبانی شروع کی، عنبر کو راجو کی طرف سے تو کھٹکا تھا ہی، اس لئے اس موقع کو غنیمت سمجھ کر وہ خانخاناں سے ملنے گیا، مغلوں نے اس کی مناسب طور پر خاطر و مدارات کی، دونوں نے آپس میں صلح کر کے اپنے اپنے ملک کی سرحدیں طے کر لیں -

اس واقعہ کے تھوڑے ہی دنوں بعد کچھ دکھنی سرداروں نے

عنبر کا ساتھ چھوڑ دیا اور مرتضیٰ نظام شاہ سے مل کر اُسے اس امر کے لئے تیار کیا کہ وہ عنبر کو شکست دیے، ان لوگوں نے اوسا کے قریب ایک فوج بھی جمع کی لیکن لڑائی میں عنبر ھی کی فتح رھی، اور مرتضیٰ کو صلح کرلینا پڑی، اب تو نظام شاہ کٹھ پتلی کیطرح عنبر کے قابو میں آگیا، یہہ ۱۶۰۳ع میں اسکو لیکر پرندا کے قلعہ کیجانب بڑھا، وھاں کے قلعہ کے محافظ منجھن خاں نے پھاٹک بند کرلیا اور یہہ پیام بھیجا کہ وہ مرتضیٰ کو تو قلعہ میں آنے دیگا لیکن عنبر کو نہیں آنے دیگا، کیونکہ وہ مغلوں سے ملا ھوا ھے، ایک مہینہ تک یہہ کشاکش رھی، آخر کار منجھن خاں قلعہ سے بھاگ گیا، عنبر اس میں داخل ھوا اور وھیں مرتضیٰ کو تخت پر بیٹھا دیا، اسکے بعد نظام شاہ اسی قلعہ میں رھنے لگا -

عنبر کا مخالف راجو برابر مغلوں سے لڑتا ھی رھا، اسکے حملوں سے تنگ آکر ایک بار دانیال نے (جو اسوقت دکھنی مغل صوبے میں شہنشاہ اکبر کا نمایندہ تھا)، راجو کو کہلا بھیجا کہ اگر مرد ھو تو میدان میں آکر لڑو، اس دھوکے دھڑی سے کیا فائدہ - راجو نے جواب دیا کہ اگر میں میدان جنگ میں آکر تم سے لڑوں اور تمھاری فوج کو کچھہ نقصان پہونچ جائے تو تمھاری مدد کے لئے شہنشاہ اکبر دس گنی فوج اور بھیجدیگا لیکن اگر مجھے نقصان پہونچا تو پھر میری مدد کو کون آئیگا، میں تو مفت ھی میں مر مٹونگا، لیکن میں اپنے طرز عمل سے باز نہ آؤنگا، چاھے مجھے آگرے ھی تک کیوں نہ جانا پڑے - فرشتہ نے لکھا ھے کہ جب ۱۶۰۴ع میں شاھزادۂ دانیال، ناسک

اور دولت آباد کے راستے احمد نگر کو عادل شاہ کی لڑکی سے بیاہ کرنے جارہا تھا اس وقت اس نے راجو سے صلح کا ارادہ کیا ، اسکے انکار کرنے پر ، اسے سزا دینے کے لئے ایک مغل فوج بھیجدی گئی ، جس سے ڈرکر راجو اپنے ملک کو فرار ہوگیا ، لیکن رفیع الدین شیرازی کا قول اس سے مختلف ہے ، اسکی رائے کے مطابق راجو اور دانیال کے درمیان صلح ہوگئی اور یہہ طے ہوا کہ کچھہ مقامات کی مالگذاری دونوں نصف نصف تقسیم کرلیا کریں ، اس معاہدے کی تکمیل کے لئے ہر مقام پر مغل اور راجو دونوں کے نمایندے کام کرتے تھے - کہنے کا مطلب یہہ ہے کہ راجو کی قوت اور شہرت روز بروز بڑھتی جارہی تھی -

یہہ دیکھکر مرتضیٰ کے بھی جی میں آیا کہ اسکی مدد سے وہ عنبر کی سرکردگی سے کسی طرح چھٹکارا پاجائے ، چنانچہ راجو کے پاس اُس نے عنبر کی شکایتیں لکھ بھیجی ، اور اسکو اپنے پاس بلایا - راجو تو اس موقع کا منتظر ہی تھا فوراً پرندا جاپہونچا اور عنبر کو نیست و نابود کرنے کی اجازت حاصل کر لی ، اُن دونوں کے درمیان کئی لڑائیاں ہوئیں لیکن عنبر ہی کی ہر بار شکست ہوئی - مجبور ہو کر خانخاناں سے اسنے مدد کی التجا کی اور مغل فوج کی مدد سے راجو کو دولت آباد بھیجنے کے لئے مجبور کر دیا - اسی اثناء میں شہزادہ دانیال کا برہان پور میں انتقال ہو گیا جسکی وجہہ سے خانخاناں کو جالنا پور سے برہان پور آنا پڑا - اب انتقام کے خیال سے عنبر نے ایک بڑی فوج جمع کی مگر خانخاناں کے کہنے سے اسنے راجو سے صلح کرلی -

پرندا پہونچکر عنبر کو معلوم ہوا کہ راجو کی کارروائی میں بہت کچھ مرتضیٰ کا ہاتھہ تھا ' یہہ معلوم کرکے اُسے بہت غصہ آیا اور اسنے اُس جگہہ سے اسے علحدہ کر دینے کا ارادہ کر لیا ' مگر عادل شاہ کے کہنے سے اسکو عملی صورت نہیں دی - اب عنبر کی زندگی میں ایک نئے باب کی ابتدا ہوئی' عادل شاہ اور خانخاناں دونوں نے یہہ سمجھہ لیا کہ وہ ہونہار سپاہی ہے - خصوصاً عادل شاہ تو اسکی بہادری اور کار گذاری کو دیکھہ کر بہت ہی معترف ہو گیا تھا - روز بروز اس سے تعلقات بڑھانے لگا - ایک دور اندیش سیاست داں کیطرح اُسے اس بات کا پورا یقین ہو گیا کہ اسکی سلطنت کی مستقبل میں حفاظت کی ایک ہی تدبیر ہے وہ یہہ کہ وہ احمد نگر کے بیجان جسم میں ازسرنو روح پہونکنے کا انتظام کرے ؛ اس مقصد کی تکمیل کیلئے اُس کو عنبر ہی ایک موزوں شخص معلوم ہوا اسی لئے عادل شاہ نے اُس کو یہہ صلاح دی کہ وہ مرتضیٰ سے بجائے مخالفت کے دوستی بنائے رکھے ' کیونکہ اگر احمد نگر کی شہرت و ناموری کے احیاء کا اگر کوئی انتظام تھا تو مرتضیٰ ہی کے نام کے بل پر تھا ' اسلیے عنبر مرتضیٰ کو لیکر جُنّیر پہونچا اور وہاں نظام شاہی جھنڈا ازسرنو بلند کردیا ' اپنے مالک کو زیادہ یقین دلانے کے لئے اُسنے اپنی لڑکی کا اسکے ساتھہ عقد بھی کر دیا - اس میں ایک خفیہ چال یہہ بھی تھی کہ ابھی تک تو اسکی حیثیت ایک غلام کی تھی ' لیکن اب اسکا رشتہ شاہی خاندان سے ہو گیا اور وہ امیرووزیر کا خطاب بے تکلف اختیار کرسکتا ہے - یہہ بات اس صدی میں غیر اہم معلوم ہوتی ہے لیکن ہندوستان کے قرون وسطیٰ میں اسکی جو

اهمیت تھي اسکی پوري تشریح کرنا یہاں غیر ضروری ہوگا ' عنبر اب چنگیز خانی یا ابھنگ خاني عنبر نہیں رھا -

عادل شاہ نے عنبر کو صرف اچھي رائے ھي نہیں دي بلکہ اُسکی حیثیت کو زیادہ مضبوط کرنے کے لئے قندھار کا قلعہ بھي اُسے سپرد کر دیا ' اس نظر عنایت کے لئے شکرے کے ساتھ عنبر نے عادل شاہ کو لکھا کہ " جب تک میرے جسم میں جان ھے ' میں مغلوں کی مخالفت کروں گا ' ممکن ہے کہ اُنھیں دکھن سے نکال بھي دوں " - یہہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ عنبر نے اس عہد کو جي جان سے نباھا - قندھار کے ملتے ھی ' عنبر کو اب اس بات کي عجلت ھوئي کہ کسی طرح راجو کا کام تمام کردے ' اُس نے فوراً ھی ایک فوج راجو کو شکست دینے کے لئے بھیجي ' بڑي کوششوں کے بعد دشمن گرفتار کیا گیا اور اُس کو قتل کر ڈالا گیا - اب تمام احمد نگر میں عنبر کا طوطی بولنے لگا ' اور اب اُسی کا بول بالا تھا -

اسی زمانے میں شہنشاہ اکبر کا آگرہ میں انتقال ھو گیا ' اس سانحہ کے ٹھیک ایک ھفتہ کے بعد یعنی ۲۴ اکتوبر سنہ ۱۶۰۵ع کو سلطان سلیم تخت سلطنت پر بیٹھا اور اُس نے نورالدین جہانگیر کا لقب اختیار کیا ' انتظام سلطنت میں کوئی تبدیلی نہیں ھوئي ' اکبر کے جو حوصلے تھے وھي اب جہانگیر کے مقاصد قرار پائے ' صرف فرق اتنا تھا کہ نہ تو مرحوم شہنشاہ کا سا حوصلہ کسی میں تھا اور نہ ویسی صلاحیت کار - تھوڑے ھي دنوں کے بعد جہانگیر نے خانخاناں کو دکھن سے بلا لیا ' خانخاناں کا جانا تھا کہ عنبر اور بھی آزاد ھو گیا ' اب وہ بے خوفي سے

اپنا کام کر سکتا تھا ' پہلے تو اُس نے اس امر کا انتظام کیا کہ دولت‌آباد کو پھر سے آباد کرے ' مغلوں کے لگاتار حملوں اور مرہٹہ سرداروں کی غارتگری کے باعث یہہ خوشحال شہر بالکل ویران ہو گیا تھا ' عنبر نے یہاں کے نظام حکومت اور تحفظ کا ٹھیک ٹھیک بندوبست کیا اور یہاں کی رعایا کو ہر طرح کی آسانیاں بہم پہونچائیں ' اُن کو اس بات کا یقین دلانے کی بڑی کوشش کی کہ وہ بے کھٹکے اس شہر میں رہ سکتے ہیں ' چنانچہ بہت جلد دولت‌آباد میں پہلے کی سی رونق آگئی ' صرف یہی نہیں بلکہ چاروں طرف کا ملک بھی عنبر کے ہاتھ لگ گیا اور لوگوں کو صاف صاف معلوم ہونے لگا کہ احمد نگر کی سوئی ہوئی قسمت دوبارہ جاگ اُٹھی ہے - دو برس کے اندر اُس نے مغلوں کے ہاتھ سے احمد نگر کی پوری ریاست واپس لے لی -

مجبوراً جہانگیر نے دوبارہ خانخاناں کو دکھن کی طرف روانہ کیا اور اُس کو تاکید کر دی کہ فوراً ہی عنبر کی بڑھتی ہوئی طاقت کو دبا دے ' عنبر نے اپنی کارروائیوں سے مغلوں کو ناراض کر ھی دیا تھا اِس لئے اُس کو اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ عادل شاہ سے اپنی دوستی اور مضبوط کرے ' چنانچہ اس نے یہہ تجویز عادل شاہ کے پاس بیجاپور میں پیش کی کہ اگر بادشاہ مناسب سمجھے تو اپنے کسی امیر کی لڑکی کے ساتھ اُس کے بیٹے کا عقد کرا دے - عادل شاہ نے اس کو قبول کر لیا اور یاقوت خاں حبشی کی لڑکی کا عقد عنبر کے بیٹے عزیزالملک کے ساتھ کردیا ' برات بیجاپور گئی ' چالیس روز تک ہاں خوب جشن رہا ' دولھا ' دولہن کا خیر مقدم احمد نگر کے

نئے دارلسلطنت جُنّیر میں فروری سنہ ۱۶۰۹ء میں کھا گیا - یہہ عنبر اور عادل شاہ کی جانب سے خانخاناں اور جہانگیر کو ایک طرح کا اعلان جنگ تھا - خانخاناں نے کوشش تو بہت کی لیکن اپنے ماتحت افسروں کو قابو میں نہ رکھہ سکا اس لئے عنبر کے خلاف کچھہ کرتے دھرتے نہ بن پڑا -

جہانگیر نے اس مقصد کے لئے کہ سرکاری عمال میں زیادہ اتفاق ہو جائے کا سنہ ۱۶۱۰ء میں امیرالامرا، مرزا شریف، آصف خاں، جعفر بیگ اور شاھزادہٌ پرویز کو دکھن کے صوبے میں بھیجا - ان لوگوں کے آنے کے بعد اپنی آزاد رائے کے مطابق خانخاناں نے برسات کے زمانے میں دشمن پر حملہ کر دیا، لیکن اپنے ساتھہ کھانے پینے کا کافی سامان نہیں لیا، بھلا عنبر اس موقع سے فائدہ اُٹھانے میں کب چوک سکتا تھا - مغلوں کو دھوکا دیکر گھاٹیوں میں بھگا لے گیا اور وہاں اُن کو، گرسنگی کا شکار بنا دیا - تمام افسران فوج خانخاناں سے ناخوش ہوگئے اور اس پر دغابازی اور ناقابلیت کا الزام لگانے لگے - در اصل مغلوں کو اس ناعاقبت اندیشی سے نقصان بھی بہت پہونچا - احمد نگر کا قلعہ اُن کے ساتھہ سے نکل گیا؛ آصف خاں شہنشاہ کو لکھہ ھی چکا تھا کہ بغیر آپ کی موجودگی کے کچھہ کام میں نہیں کر سکتا جب جہانگیر نے یہہ تجویز اپنی مجلس عاملہ کے سامنے پیش کی تو خاں جہاں لودی نے کہا کہ آپ کے جانے کی ضرورت نہیں، میں بیڑا اُٹھاتا ھوں کہ اس کام کو پورا کئے بغیر میں منھہ نہ دکھاؤں گا -

جہانگیر اسکی باتوں میں آگیا اور اُسے دکھن روانہ کر دیا -

خان جہاں نے دکھن پہونچتے ہی جہانگیر کو لکھ بھیجا کہ جب تک خانخاناں یہاں رہے گا کوئی کام نہیں بن سکتا۔ شہنشاہ نے فوراً ہی خانخاناں کو واپس بلا لیا اور خانجہاں کی کار گذاری کی تعریف کرنے لگا۔

خانجہاں نے ایک بڑی اہم تدبیر سونچی یا یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ سلطنت کیطرف سے اسکی تحریک ہوئی کہ عبداللہ خاں گجرات سے چل کر ناسک اور ترمبک کی طرف سے اور خانجہاں اور مان سنگھہ وغیرہ' برار اور خاندیش کی جانب سے احمد نگر میں داخل ہوں اور چاروں طرف سے دشمن کو گھیر کے اسکو بالکل نیست و نابود کردیں۔ تدبیر تو بہت عقلمندی کی تھی لیکن عبداللہ خاں کی سُستی کے باعث ناکامیاب رہی' شکست کا حال سنکر جہانگیر بہت ناخوش ہوا' اُسنے ایک مرتبہ ارادہ کیا کہ خود جاکر کام پورا کرے لیکن پھر یہہ ارادہ فسخ کر دیا خانخاناں کی قابلیت اور اُسکی قدر و قیمت؛ اب لوگوں کو معلوم ہوئی اور وہ دوبارہ دکھن روانہ کیا گیا۔ جب وہ ۱۶۱۲ع میں دکھن پہونچا تو اسکے لئے میدان صاف تھا' جعفر بیگ' آصف خاں' اور شریف دونوں' مرچکے تھے۔

عنبر اس زمانے میں بڑی آفت میں تھا' حبشی امرا ایک ایک کر کے سب اسکے خلاف ہوتے جارہے تھے۔ خانخاناں بڑی چالاکی سے اس باہمی رنجش کی آگ کو مشتعل کر رہا تھا یہاں تک کہ امیروں نے سپہ سالار اخلاص‌خاں تک کو قید کر لیا اور مرتضیٰ سے کہا کہ عنبر کو اسکے عہدے سے گرا کے کسی دوسرے قابل آدمی کو پیشوا و کیل مقرر کرے۔ ان لوگوں نے

ایدھر شاھزادۂ پرویز اور خانخاناں کے پاس بھی عرضداشتیں بھیجیں - اُن میں سے کچھ کو خانخاناں نے اچھی جاگیریں دیں اور کچھ کو اچھے منصب دئے ' اپنی طاقت کو کمزور ھوتے دیکھ کر عنبر نے عادل شاہ سے درخواست کی کہ وہ ملا محمدؐ لاری کو بھیجدے کہ وہ آکر آپس کے نفاق کو مٹائے - ملاجی تشریف تو لائے لیکن جس غرض سے بلائے گئے تھے وہ پوری نہیں ھوئی ' بلکہ عنبر کی فوج پر انکی موجودگی کا اُلٹا ھی اثر پڑا ' حبشی امرا تو لالچ میں پڑے تھے وہ بھلا کیونکر کہنا مان سکتے تھے ' دوسرے جب انہوں نے دیکھا کہ ملاؐ جی اور مغل سپہ سالار میں دوستی ھے تو وہ اور بھی بے خوف ھوگئے ' یہہ بات دیکھکر عنبر کو بھی شبہہ ھونے لگا اور اسنے عادل شاہ کو لکھہ بھیجا کہ ملا جی کو بلا لیں ' کہتے ھیں کہ جب ملاجی واپس جارہے تھے تو راہ میں ' مغل سپہ سالار شاہ نواز خاں اور اسکے بھائی داراب خاں نے پالکی کے قریب آکر اُن کو سلام کیا ' اس تعظیم و تکریم کا معاوضہ ملاّ جی کو بیجا پور پہونچکر ادا کرنا پڑا ' وہاں اُنکی سب جاگیریں ضبط کرلی گئیں اور وہ دو برس تک بیکار بیٹھے رھے ' یہہ سب عنبر کو خوش کرنے کے لئے کیا گیا تھا -

باغی حبشی امرا ' روزانہ مغل نائب سپہ سالار سے یہی تجویز کرتے تھے کہ وہ عنبر سے جنگ شروع کردے - بہت غور و فکر کے بعد شاہ نواز خاں نے یہہ بات مان لی اور احمد نگر میں داخل ھوا ' لڑتا جھگڑتا پٹن تک تو پہونچ ھی گیا یہاں اُسنے پڑاؤ ڈال دیا - جلد ھی جاسوسوں نے آکر خبر دی کہ عنبر بھی چالیس ھزارو

کا ایک جم غفیر لئے ہوئے اُسی طرف بڑھا چلا آرہا ہے۔ شاہنواز کا پڑاؤ بہت ہی محفوظ جگہہ پر تھا کیونکہ اس کے اور غنیم کے فوج کے درمیان دریا حائل تھا اس لئے وہ ذرا بھی خوف زدہ نہیں ہوا - دوسرے دن عنبر اھی پہونچا - بہت ھی گھمسان لڑائی ہوئی عنبر کی فوج تتر بتر ہوگئی اور خود اُسے بھی میدان سے بھاگنا پڑا - غنیم نے کھرکی پر جو اب نظام شاہی دارالسلطنت تھا حملہ کر دیا - اور وہاں کے تمام شاہی عمارات کو مسمار کر ڈالا - غریب عنبر یہہ سب دیکھتا رہا - ایسی حالت میں کرھی کیا سکتا تھا - اِس موقع پر مصنف تذکرۃالملک بھی احمد نگر میں عنبر کی فوج میں موجود تھا اس نے یہہ تمام تفصیلات بیان کئے ہیں - مغلی حملہ اور امرا کے بغاوت کا نتیجہہ یہہ ہوا کہ نو اصلاح شدہ ریاست کے ھاتھہ سے ملک کا بہت سا حصہ نکل گیا - اور مغلوں کا جھنڈا لہرانے لگا - خانخاناں بھی اب اپنا سر بلند کرسکتا تھا -

احمد نگر کی وقتی بربادی ہو ھی رہی تھی کہ شاہزادۂ خُرم بھی اپنی فوج لیکر دکھن آپہونچا - بیجا پور اور گول کنڈہ نے ڈرکر صلح کرلی - مجبور ہو کر عنبر نے بھی اپنا سر جھکا دیا - چڑھتی ہوئی آندھی کے سامنے کون اپنی جان دیتا لیکن شاہزادے کے واپس جانے کے بعد عنبر نے پھر اپنی چالیں شروع کر دیں سنہ ۱۶۲۰ع میں اُس عہد کو جو چار برس پہلے مغلوں کے ساتھہ ہوا تھا عنبر نے توڑ ڈالا - احمد نگر اور برار کا زیادہ حصہ ازسر نو اس کے ھاتھہ آگیا اور مغلوں کو منہہ کی کھانی پڑی - خانخاناں تو بہت

ھی شرمندہ ھوا یہاں تک کہ رو پڑا - جہانگیر کو لکھ بھیجا کہ اگر جلد مدد نہ آئی تو میں جان دیدوں گا - لاچار ھوکر شہنشاہ نے شاہ جہاں کو دوبارہ دکھن بھیجا - آتے ھي اُس نے میدان مارا - بیجاپور اور گول کنڈہ کو توڑ کر اپنی طرف ملا لیا اور عنبر کو اکیلا کر دیا - آخر کار ۱۶۲۱ع میں تینوں ریاستوں نے صلح کر لی اور بیجا پور نے اٹھارہ لاکھ گول کنڈہ نے بیس لاکھ اور احمد نگر نے بارہ لاکھ روپیہ خراج دینا منظور کیا - اس کے کچھ عرصہ بعد شاہ جہاں نے اپنے باپ کے حکم کے خلاف ورزي کي اور باغي ھو گیا - اس موقع پر عنبر نے جو پالیسي برتي اس کا تفصیلی حال ڈاکٹر بینی پرشاد کی کتاب '' جہانگیر '' میں موجود ھے یہہ تحریک احمد نگر کے لئے مفید ھي ھوئي کیونکہ جب سلطنت کي ساري طاقت شاہ جہاں کو شکست دینے میں لگي ھوئی تھی اس وقت عنبر کو اپنے زائل شدہ اقتدار کے دوبارہ حاصل کرنے کا اچھا موقع مل گیا - احمد نگر کي آزادی کا جھنڈا پھر سے لہرانے لگا اِسي لئے وہ عنبر کا مرہون ملت تھا - اس نے ایک طرف تو بیجا پور کو نیچا دکھایا اور دوسری طرف مفرور شاھزادہ شاہ جہاں کو پناہ دے کر اپنی فراخ دلي کا ثبوت دیا - اس طرح اُس نے ساري زندگي احمد نگر ھي کی خدمت میں صرف کي اور اُس کو دوبارہ زندہ کرکے ۱۶۲۱ع میں انتقال کیا - سچ تو یہہ ھے کہ دکھن کي تاریخ میں اُس کا نام سنہرے حروف میں لکھے جانے کے قابل ھے -

(ترجمہ)

سید مقبول احمد صمدنی

شاہ بیگم

[جے پور کي راج کماري - جہانگیر کي پہلی بی‌بي - خسرو کي ماں۔]

غوغاے عشق و شور جنوں ، ماجراے عقل

افسانۂ تو ، قصۂ تو ، داستان تست

عصر جہانگیري کے تمام مورخ اِس بارے میں متنق هیں کہ جہانگیر کی پہلی شادی پندرہ سولہ سال کي عمر میں هوئي ، اور بڑے اهتمام اور تُزک و احتشام کے ساتھہ رچائي گئي تھي - حقیقتًہ تنصیلات کے بیان میں بھي کچھہ فرق نہیں کرتے - جو کچھہ فرق هے ، وہ طرز ادا ، سخن طرازي اور انشا پردازی کا پایا جاتا هے - هر اهل قلم اپنے معاصر یا متتدم سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتا اور ایک نتش رنگین آراستہ و پیراستہ کرنا چاهتا هے -

شریف‌الملک معتمد خاں تزک کے دیباچے میں لکھتے هیں کہ اُنتیسویں سال جلوس اکبري میں شاهزادہ کي عمر جب پندرہ سال کي هوئي تو ۹۹۳ هجري (۱۵۸۵ع) میں راجہ بھگوان داس کي بیٹي (مان سنگھہ کی بہن) سے اس کی خواستگاری و نسبت کي گئی - راجہ نے بھي اس موقع پر نیاز و پیشکش کے تمام لوازم ختم کر ڈالے اور اس قرابت و شادي کو اپنے اسلاف و اخلاف کے اعزاز و افتخار کا وسیلہ سمجھا - تمام شاهزادوں اور بیگمات اور امرا و سرداران شاهي اور ملازمان خدمت کو ان کے شایان شان سامان ضیافت بھیجا - شاگرد پیشہ اور احدیوں (باڈي گارڈ) کو نام بنام سراپا

(خلعت) بھیجے - اس تقریب کي عظمت و جلالت اور مورخ کي تحریر کا انداز شوکت خود اُسي کا مختصر نویس قلم ظاهر کرسکتا هے -

''صبیهٔ قدسیه راجه بهگوانداس را که از اعاظم امراے این دولت ابد مقرون بود و در زمرهٔ راجهاے نامدار به مزید شوکت و اعتبار اختصاص داشت؟ بجهت آن حضرت خواستگاری نمودند و دولت خانهٔ خاص و عام را آئین بسته جشن بادشاهانه ترتیب دادند...... حضرت عرش آشیانی بورود مقدم اقبال توام منزل راجه را پایهٔ آسماني بخشیدند و آن بانوے حجلهٔ عصمت و عفت را بگوهر یکتائے خلافت و سلطنت عقد ازدواج خجسته امتیاز (امتزاج ؟) بسته بدولت سراے جاوید آوردند -''

خلاصه - ''راجه بهگوانداس سلطنت کے بڑے امیروں میں سے تها- نامور راجاؤں میں شمار هوتا بلکه اُس کي خصوصیت اور اُس کا اعتبار اوروں سے زیادہ تها - راجا کي بیٹي جهانگیر کے لیے مانگي گئي - دولت خانه خاص و عام کي آئینه بندي کي گئي - بادشاهانه جشن منایا گیا - خود اکبر نے راجه کے گهر جا کر اُس کي عزت بڑهائي اور لڑکي کا بیاه شاهزاده سے کر کے اپنے یہاں لے آیا -''

اسي شادي کا تذکره خافي خان' نظام الملکي' ان الفاظ میں کرتے هیں -

''بعده که پانزده سال از نشو و نماے نهال عمر شریف در گلشن جاه و جلال گذشت' صبیهٔ راجه بهگوانداس را که از راجهاے نامدار دیار سلند گفته مي شد' براے شاهزادهٔ جوان بخت خواستگاری نمودند - و خود بدولت و اقبال در جشن طوے بخانهٔ راجه تشریف ارزاني فرموده آن

بانوے حجلۂ عصمت را بعقد در آوردہ بدولت خانۂ ابد پیوند در آوردند ''
خلاصہ ۔'' شاہزادہ کی عمر جب پندرہ سال کی ہوئی تو راجہ بھگوانداس

جو ہندستان کے نامی گرامی راجاؤں میں مانا جاتا تھا '
اُس کی لڑکی کے ساتھہ شاہزادہ کی ملگنی کی گئی ۔ خود
بادشاہ سلامت اس شادی کے جشن میں راجہ کے گھر تشریف
لے گئے اور عقد کر کے لڑکی کو اپنے دولت خانہ پر لے آئے ۔''

خافی خان ایک مستند و محتاط مورخ ہیں مگر سال عقد کے بارے میں یا تو اُن کے قلم نے لغزش کی ہے یا شیخ عبدالقادر بدایونی کے خامۂ معجز نگار نے ۔ خافی خان کے بیان سے پایا جاتا ہے کہ اسی سال جلوس اکبری یعنی ۹۹۴ ھ میں شاہزادہ محمد سلیم کا جشن طوے راجہ بھگوانداس کی بیتی سے (بسلسلۂ جشن نوروز عالم افروز) ہوا تھا کہ کابل سے مرزا محمد حکیم کے مرنے کی خبر پہونچی اور کنور مان سنگھہ پسر راجہ بھگوانداس حکومت کابل پر ممتاز کیا گیا ۔ ملائے بدایونی اس جشن کا ۹۹۳ ھ میں ہونا (یعنی سال مذکور کے ذیل میں) بتاتے ہیں ۔ مسٹر بیل نے بھی یہی لکھا ہے ۔

سنہ ۹۹۳ ھ کے حالات میں مُلا قاسم ' ہندو شاہ ' فرشتہ کا بیان ہے ۔
''وهم درین سال صبیۂ راجہ بھگوانداس را طوئے وجشن عظیم کردہ بعقد شاہزادہ محمد سلیم در آوردند ۔''

شاہ نواز خان کہتے ہیں کہ سال بست و نہم دختر عزت سرشت راجہ را با شاہزادہ سلیم پیوند پیوندنی بستند ۔

یہ راجہ بھگوانداس کچھواہہ ' والی جے پور ' اکبر کا امیرالامرا ' بڑا مقرب و معتمد ' آزمودہ کار سپہ سالار ' اور مدبر و منتظم صوبہ دار تھا ۔ بہت سے کارہائے نمایاں کیے اور بارہا شجاعت و بسالت کے جوہر دکھائے

تھے - اُس کی تعریف اِسی قدر کافی ہے کہ راجہ بھارامل کا بڑا بیٹا، اور مرزا راجہ مان سنگھہ فاتح میواڑ و گورنر کابل و بہار کا نامور باپ تھا - [لالہ سجان رائے ان دونوں ناموں کو بالترتیب بھگونت داس اور بہاری مل لکھتے ھیں -]

شیخ عبدالقادر بدایونی نے اس تقریب شاھانہ کی دھوم دھام اور آرایشوں کے حالات کسی قدر زیادہ تفصیل کے ساتھہ لکھے ھیں - بدایونی نیز بہادر شاھی کا بیان ہے کہ اکبر نے مصالح ملکی اور مہام سلطنت کے لحاظ سے سنہ ۹۹۳ ھجری میں تجویز کیا کہ شاھزادۂ ولیعہد (جہانگیر) کا عقد قرابت نامور خاندان کچھواھہ سے کیا جائے - یا جیسا کہ (بقول علامۂ شبلی) بعض اھل راز کی روایت ہے، راجہ بھگوانداس نے اپنی بیٹی دینا، از خود، اپنی مرضی و خوشی سے منظور کیا تھا -

محابا کیوں ہے! میں ضامن - اِدھر دیکھہ

شہیدانِ نگہ کا خون بہا کیا !!

جوان دولت، جوان بخت، جوان سال شاھزادہ (سلیم) سولہ برس کا تھا - بادشاہ مع تمام امرا اور درباریوں اور خدم و حشم کے راجہ کے گھر گیا - مجلس عقد میں ایک طرف شرفائے اسلام، مفتی و قاضی رونق افزا تھے، دوسری طرف ھندو عمائد، پروھت، برھمن اور پنڈت جلوہ افروز - پہلے مسلمانوں کے طریقہ پر نکاح ہوا - خطبہ پڑھا گیا - دو کرور تنکے (یا حسب تحریر مآثرالامرا، دو کرور روپیہ) کا مہر باندھا گیا - پھر ھندوؤں کی ساری رسمیں انجام دی گئیں - پھیرے پڑے - ھَوَن ہوا - حجلۂ عروسی یعنی دلہن کے گھر سے دلہا کے عشرت‌کدہ تک خود بادشاہ سلامت (اکبر) عروسی محافہ (چوڈولہ یا پالکی، نالکی) پر اشرفیاں نچھاور

کرتا لایا - پالکی کو ایک طرف بادشاہ کندھا دئے تھا ؛ دوسری جانب شہزادہ - راستہ بھر قیمتی اور پُر تکلف ریشمی کپڑوں کا فرش بچھا تھا - راجہ نے جہیز بھی دل کھول کر دیا - اصطبل کے اصطبل خالی کردئے - ان میں عراقی بھی تھے ؛ عربی بھی ؛ ترکی بھی ؛ کچھی بھی ؛ کہ اُس زمانہ میں گھوڑوں کی اچھی سی اچھی نسلیں یہی سمجھی جاتی تھیں - سو ہاتھی تھے - اور سیکڑوں لونڈی غلام - ہندوستانی بھی ؛ حبشی بھی ' ختنی و چرکس بھی - مرصع و مکلل آلات و زیورات ' سونے چاندی کے ظروف ' طرح طرح کے برتن اور اسباب - غرضکہ سب کچھہ دیا اور بہت کچھہ دیا - امراے شاہی اور سرداران ہمراہی کو بھی حسب مرتبہ و حیثیت خلعت اور گھوڑے مع بیش قیمت زین اور جڑاؤ ساز و سامان کے عطا کیے -

شعراے دولت نے مبارکبادیں پیش کیں - ابوالفیض فیضی نے قطعۂ تاریخ نذر دیا -

زہے عقد دُر پاش سلطان سلیم
کہ پرتو دہد سال امید را
ز پروردنِ آفتابِ دول
قرانے شدہ ماہ و ناہید را (سنہ ۹۹۳ ھ)

ابوالفضل نے عرض کیا -

دین و دنیا را مبارکباد ' کین فرخندہ عقد
از براے انتظام دنیاہ و دیں بستہ اند
در نگارستانِ دولت نور چشمِ شاہ را
حجلۂ چوں پردہاے دیدہ رنگیں بستہ اند

شیریں زبان و شیوا بیان شبلی نے بھی اس تقریب کو تین سو برس بعد یاد کیا ھے - اُن کے دلاویز قطعہ کے بہت سے شعر زبانوں پر رھتے ھیں - (اول و آخر چھوڑ کر)

قرابت راجگان ہند سے اکبر نے جب چاہی

کہ یہ رشتہ عروسِ کشور آرائی کا زیور تھا

تو خود فرماندہِ جے پور نے نسبت کی خواہش کی

اگر چہ آپ بھی وہ صاحبِ دیہیم و افسر تھا

ولی عہدِ حکومت اور خود شاہنشہ اکبر

گئے انبیر تک جو تخت گاہ ملک و کشور تھا

اُدھر راجہ کی نورِ دیدہ گھر میں حجلہ آرا تھی

اِدھر شہزادے پر چترِ عروسی سایہ گستر تھا

دلہن کو گھر سے منزل گاہ تک اس شان سے لائے

کہ کوسوں تک زمین پر فرش دیبائے مشجر تھا

دلہن کی پالکی خود اپنے کندھے پر جولائے تھے

وہ شاہنشاہ اکبر اور جہانگیر ابن اکبر تھا

شاہ نواز خان نے مآثرالامرا میں اس تقریب کو تقریباً پوری تفصیل (مندرجہ بالا) کے ساتھہ درج کیا ہے مگر جیسا کہ اُن کی اور بعض اور مسلمان مورخین کی روش ہے، اس وادی میں پھونک پھونک کر قدم رکھا ہے ـ لکھتے ہیں کہ

عرش آشیانی بفروغ قدوم، منزل راجہ را روشنی افزود ـ و جشن خسروانہ ترتیب دادہ جہاز عروس باپیشکش از نظر گزرانید ـ کہ تفصیل آن محمول بر مبالغہ می‌شود ـ

آجکل کی دنیا شاید اس کو حکمت عملی یا مصلحت کوشی سے تعبیر کرے یا اکبر کی ہمہ گیر و صلاح اندیش پالسی سے ـ مگر واقعہ یہ ہے کہ اکبر کا یا کسی اور بادشاہ کا بیٹے کے سگائی کے لیے، یا شادی بیاہ کے موقع پر، سمدھی کے یہاں جانا آئینِ شرافت اور دستور قرابت کا پہلا باب تھا، اور اب بھی ایشیائی ممالک کی رسوم و آداب میں اُسی قدر

ضروری و اہم سمجھا جاتا ہے - چنانچہ اسی تقریب کے سال بھر بعد یعنی جب جہانگیر سترہ برس کا ہوا' تو سنہ ۹۹۳ھ میں اس سے بھی زیادہ رفق و التیام' کوکبۂ و احتشام' جماعت و انبوہ' فرو شکوہ' شوکت و شان اور آن بان کے ساتھ اس کا نقش ثانی تیار کیا گیا - اور نہ تنہا اکبر بلکہ تمام بیگمات و مخدرات حرم سرائے سلطانی' دلہن کے لینے کے لیے' اُس کے گھر گئیں - خافی خان لکھتے ہیں :—

دختر فرخندہ اختر راجہ اودے سنگھ پسر راجہ مال دیو (مرزبان مارواڑ) کہ در حسب و نسب و دولت موروثی بر ہمہ راج ہائے عالی تبار افتخار داشت' بعقد آن گوہر بحر سلطنت و جہانبانی نیز در آوردہ خود بذات شریف و ہمہ حجلہ نشینان سراچۂ عصمت' رونق افزائے خانہ و کاشانۂ راجہ گردیدند - و بطور رتبہ و دستور سریر آرایان ہند لوازم شادی بتقدیم رسانیدند -

"راجہ مال دیو کا بیٹا راجہ اودے سنگھ (والی مارواڑ) حسب و نسب اور موروثی دولت میں تمام بلند مرتبہ راجاؤں سے ممتاز و منتخر تھا - اُس کی لڑکی کے ساتھ شاہزادہ کا عقد ہوا - بذات خود بادشاہ اور تمام بیبیاں اور بیگمیں' راجہ کے یہاں گئیں اور ہندستان کے بادشاہوں کے رتبہ اور دستور کے مناسب لوازم شادی انجام پائے -"

شبلی کی تربت منور رہے' سچ فرمایا ہے :—

یہی ہیں وہ شمیم انگیزیاں عطر محبت کی
کہ جن سے بوستان ہند برسوں تک معطر تھا

گذشتہ صحبت میں گذارش کر چکا ہوں کہ ان مخلوط و مختلط قرابتوں کے متعلق دوست و دشمن سب یکساں رائے رکھتے ہیں -

رہا باہمی طریق عمل اور سلوک و مودت - اوراق تاریخ شاہد ہیں کہ حق پسند و منصف مزاج دوست بھی اعتراض و حرف گیری سے معاف نہیں رکھتے - برملا سب کچھ کہہ ڈالتے ہیں - مگر اس کا کیا علاج کہ ہر حال میں اپنے ' اپنے سمجھے جاتے ہیں - ان کے اقوال کی ' آپ کے یہاں وقعت نہیں - میرے نزدیک ضرورت نہیں - اس لیے صرف بعض مصلحت شناس و باخبر انگریز مورخین کی تحریرات نقل کر دینا کافی ہوگا - مسٹر ایچ - جی - کین ؟ " مغل ایمپایر " میں لکھتے ہیں کہ " اکبر نے وسط ایشیا سے تعلقات قرابت و ازدواج قطع کر دئے اور امبیر کے کچھواہہ خاندان سے شادی بیاہ کرکے اتحاد و یگانگی کی بنیاد قائم کی - اس نے ہندؤں سے رسم و راہ پیدا کر کے اپنی رعایا کے لیے عمل و موافقت کی ایک شاہ راہ دکھا دی - " دوسرے موقع پر کہتے ہیں کہ " نہ تو اکبر نے ؟ نہ جہانگیر نے اپنی ہندو رانیوں یا بیبیوں کو تبدیل مذہب کرایا - نہ اسلام اختیار کرنے کی ترغیب دی - " انجینئیر ڈنکن صاحب ان بادشاہوں کی مذہبی رواداری ' رانیوں کی ہندوانہ پرستش اور آزادانہ عبادت گزاری کی تحسین کرتے اور محلات سلطانی میں ان کی ضروریات اور پوجا پاٹ کے مناسب حال تعمیرات کا ذکر فرماتے ہیں - نامور میکس مولر نے اپنی نفیس تصنیف " سائینس آف ریلیجن " کے حصہ اول میں اس بارہ میں سیر حاصل بحث کی اور مشہور کتاب " فرینڈس اینڈ فوز " (دوست و دشمن) سے اقتباسات و انتخابات دیے ہیں - کاریٹ صاحب تو اس درجہ تک بڑھ کر کہہ گئے ہیں کہ " جہانگیر اُن لوگوں کو پسند ہی نہیں کرتا ہے جو اپنا مذہب بدل دیتے ہیں - وہ اپنے خود ساختہ مذہب کے سوا کسی دوسرے دین کا پابند ہی نہیں ہے - یہی وجہ ہے کہ اُس کی سلطنت

میں تمام مذاہب کا یکساں احترام ہے۔" کین صاحب کہتے ہیں کہ "جہانگیر جب ولی عہد سلطنت تھا تو اکبر نے اُس کی ہندو رانیوں کے لیے فتحپور سیکری میں مکانات بنوا دیے تھے اور بقول فرگسن صاحب ان محلات پر ہندوانہ، خصوصاً جین وضع کی آرایش و تزئین کرائی تھی۔" مسٹر استینلے لین پول اپنی تاریخ "قرون وسطیٰ کے ہندستان" میں راوی ہیں کہ اکبر کی جے پوری دلہن آزادی کے ساتھ اپنے مذہب و ملت کے تمام رسوم و ارکان ادا کرتی تھی اور ہندؤں کی معینہ قربانیاں بھی کرتی تھی۔ ونسنٹ اسمتھ صاحب کا قول ہے کہ مذہبی معاملات میں جہانگیر اپنے باپ ہی کی طرح رواداری برتتا تھا۔ مسٹر وھلیر بحوالہ منوکی لکھتے ہیں کہ عالمگیر کی ملکہ ایک راجپوتانی شاہزادی، اُس کی پہلی اور جوانی کی بی بی تھی۔ حرم سرائے شاہی میں بڑا رسوخ اور اثر رکھتی تھی۔ محل کے اندر اپنے بتوں پر خوشبوئیں جلاتی تھی۔ اس کا شوہر اگرچہ سخت پابند مذہب تھا لیکن اُس کے دینی معاملات میں دست انداز نہ ہوتا؟ دخل نہ دیتا تھا۔ مولف اُمرائے ہنود کا بیان ہے کہ آگرہ کے قلعہ کے محل میں ایک طرف پرکرما اور دوسری طرف مندر کے آثار اس وقت تک موجود ہیں۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ محلات شاہی میں راجاؤں کی بیٹیوں کو اپنے مذہب کی رسوم اور عبادت کرنے کی پوری آزادی حاصل تھی۔ یا بالفاظ میر بدایونی یہ راج کماریاں تیموری قلعہ میں آنے کے بعد اپنے دھرم کے مطابق پوجا پات کرتی تھیں۔ ٹھاکرجی کو جل پھول چڑھاتی تھیں۔ تلک لگاتی تھیں۔ پرکرما کرتی تھیں۔ ہون کرتی تھیں۔ مسٹر کین شاہجہاں کے بارے میں بہت سی باتیں الفنسٹن صاحب سے اور کچھ اپنے مشاہدہ و مطالعہ سے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں "یہ امر قابل تحریر ہے کہ شاہجہاں نے ہندو خواتین کے ساتھ شادی بیاہ کا رواج اُٹھا دیا جو اُس کے پیشروؤں نے قائم کیا تھا"

رفع دخل — میں نہیں سمجھتا کہ ان دونوں صاحبوں کی تحریر کس تحقیق یا اطلاع پر مبنی ہے - ہندستان کی تاریخیں اس کے خلاف شہادت دیتی ہیں - یہ سلسلہ جو ان جے پوری' جودھپوری اور اور رانیوں کے دم قدم سے چلا تھا' فرخ سیر تک ختم نہیں ہوا - سب سے اخیر راجپوتنی مہاراجہ جسونت سنگھ کی بیٹی تھی جو دلی کے لال قلعہ میں آ کر دلھن بنی - اس سیہ طالع' سیہ قدم راجکماری کی شاندار آمد' شوہر کی معزولی و ہلاکت اور اس کی ناشاد زندگی کے بارے میں "حیات جلیل" کے بہت سے ورق سیاہ کر چکا ہوں - یہ صحیح ہے کہ اکبر کے محل میں پانچ ہندو رانیاں تھیں اور جہانگیر کے یہاں سات - شاہجہانی چمن دیسی پھولوں کی بہار اور خوشبو سے ضرور خالی رہا - لیکن اس کے بھائی پرویز' اس کے دونوں بیٹوں' مراد اور شجاع' کی محلسراؤں میں راج دلاریاں راج کماریاں رونق افزا تھیں - خود عالمگیر اورنگزیب کی دو بیگمیں راجپوت تھیں - ایک راجہ کشتوار (کشمیر) کی بیٹی یا (حسب روایت منتخب اللباب) نواسی' جس کے بطن سے بہادر شاہ تھا - دوسری' اودے پوری' جس نے مرتے دم تک اپنے تاجدار سرتاج کا ساتھ دیا اور حق وفا ادا کیا - اسی طرح اور تیموری شاہزادوں کو لیجئے - دارا شکوہ کا فرزند سلیمان شکوہ' عالمگیر کے چاروں بیٹے' پوتے اور پر پوتے' سب اسی شاہانہ سوغات سے مستفید و فیضیاب تھے - گورگانی یا صاحب قرانی شجرۂ نسب میں ایسی سات رانیوں کے نام روشن نظر آتے ہیں' جنکے "پتی" بھی مُکمت دھاری تھے اور "پُتر" بھی مکمت دھاری ہوئے -

بازآمد — جہانگیر کی اس پہلی شادی کے پہلے ہی سال ۹۹۴ ہجری میں شاہزادی سلطان النساء پیدا ہوئی جو سلطان بیگم بھی کہلاتی ہے - دوسری برس' ۲۴ امرداد کو (بماہ رمضان سنہ ۹۹۵ ہجری = اگست

سنه ۱۵۸۷ ع) بیٹے کی (لاهور میں) ولادت هوئی - دادا جان (اکبر' عرش آشیان) نے سلطان خسرو نام رکھا - یه بڑے لڑکے کا بڑا بیٹا تھا' اپنا پہلا پوتا - بڑے جشن منائے - خوب خوشیاں کیں - فرشته کہتا ھے :-

و درین سال سنه ۹۹۶ هجری ولادت سلطان خسرو ولد شاهزادهٔ عالمیان شاهزادهٔ محمد سلیم از دختر راجه بهگوانداس روے نمود - عرش آشیانی از طلوع اولین کوکب؛ نبیرهٔ خوشحال شده در آرایش جشن با قصی الغایة کوشید -

اس مبارک موقع پر شاهزادہ سلیم نے اس رانی یا بیگم کو "شاہ بیگم" کا خطاب دیا تھا - شاہ بیگم بڑی عقیل؛ دانش مند؛ زیرک و دور اندیش' وفاکیش اور غیور تھی - اِس کو اپنے شوھر سے اُلفت نہیں' عشق تھا- شوھر کی محبت بھی جنون محبت تک پہونچی ھوئی تھی- جس کو دوسری بی بی (جودہ بائی؛ دختر راجه اودے سنگھه) بھی کم نہ کر سکی - اور اُس کے حسن و جمال؛ ناز و نیاز؛ کرشمه و انداز کے تمام حربے بیکار ثابت ھوئے - ع - هم بھی دیکھیں که مچلتی ھیں نگاهیں کیونکر - حالانکه دونوں کے سوانح' لطیفے اور بذله سنجیاں دیکھه کر خشک مزاج و خشک دماغ "مقبول" کو بھی ماننا پڑتا ھے که جودہ بائی (جگت گوسائیں) وہ خوش سلیقه و خوش مذاق ملکه' وہ نگار آتشیں' وہ محشر در آستیں تھی' جس کی چشمکوں اور حاضر جوابیوں نے فتله ادا' ناوک افگن' نور جہاں' بیگم کی جودت فہم و رسائی طبع؛ بلکه تابش حسن کو بھی ماند کر دیا تھا- جہانگیر کی ایک تیسری بیگم "صاحب جمال" اسم با مسمی تھی - بڑے نامور اور کار گزار باپ کی بیٹی تھی - اکبر نے سلیم کی شادی اس سے کر دی تھی' یا جیسا که دربار اکبری * میں تحریر

---

* مقبول — یه واقعه ھے یا فسون جادو - دو جملوں میں پورا افسانه - ؟ آزاد — تمہاری تلاش' مضمون آفرینی اور سحر کاری آج بھی روح کو تڑپا دیتی اور دل کو گرما دیتی ھے -- تاریخ والو — کہاں ھو؟ - تم ھی بتاؤ - — "هم رهاں هیں جہاں سے هم کو بھی کچھه هماری خبر نہیں آتی" -

ہے '' مینا بازار کی آمد و رفت میں سلیم (جہانگیر) کا دل زین خان کوکہ کی بیٹی پر آیا اور ایسا آیا کہ قابو ہی میں نہ رہا ۔ غنیمت ہوا کہ اس کی ابھی شادی نہ ہوئی تھی ۔ اکبر نے خود شادی کر دی ''۔ بہر کیف شوہر کی بڑی محبوب رفیق اور چہیتی بی بی تھی ۔ لیکن سیرت نگاروں سے پوچھیئے ۔ شاہ بیگم کے سامنے صاحب جمال کی کیا حقیقت تھی ؟ ع
برق جمال ' مرحبا ! پیکر ناز ' آفریں ۔

[عذر ۔۔ پردگیان عصمت و عفاف کے بارے میں میں خیال کی ادنی سی جولانی یا قلم کی شوخی روا نہیں رکھتا لیکن یہ اظہار حقیقت حال تھا جو زبان قلم سے بے اختیار نکل گیا ۔ تہذیب جدید کی غیا پاشی یا دور حاضر کے اثر پر محمول نہ کیا جائے ۔ ابھی آپ سنیں گے کہ خود جہانگیر شاہ بیگم سے (مومن کی زبان میں) کیا کہہ رہا ہے

افسوس ! کوئی پردہ نشیں پردہ در نہیں '

وہ حسن جس سے عشق ہو رسوا ' نہیں رہا ۔]

شاہ بیگم کا اندوہناک انجام ' یا اس تصویر کا دوسرا رخ بھی ' ملاحظہ طلب ہے ۔ وہ شاہزادہ (خسرو) ' جس کے ساتھ ساری چغتائی قوم کی امیدیں اور توقعات وابستہ تھیں جس کی آمد ' نشو و نما اور ترقی سے تیموری خاندان کو مسرت تھی ' جو ماں (شاہ بیگم) کی آنکھ کا نور اور دل کا سرور تھا ' باپ سے بگڑ جاتا اور تیوری سی سمجھ پا کر سرکشی اختیار کرتا ہے ۔ دعوائے سلطنت ' اور اکبر کی جانشینی کے خیال خام میں مبتلا ہو جاتا ہے ۔ در گزر کرنے والے شفیق باپ پر جو کچھ گزری ' اسی کا دل جانتا ہے ۔ یہاں اسی قدر کہدینا کافی ہے کہ ماں عزیز بیٹے کی شوخیوں اور سیاسی غلط کاریوں سے تنگ آگئی

تھي - خسرو کو بغاوت و سرکشی سے روکتي اور حتي الوسع باز رکھنا چاھتي تھي ' مگر برگشتہ نصیب خسرو کب ماننے والا تھا - وہ جہانگیر کي بجاۓ تخت و تاج کا وارث اور حقیقۃً اھل اپنے ھي کو سمجھتا تھا - ماں کی کوفت اور سوزش دل بڑھتي رھی - اُس نے عاجز آکر افیون کھالي اور جان دیدي -

جہانگیر لکھتا ھے :-

والدۂ اُوھم در ایام شاھزادگی از ناخوشی اطوار و اوضاع او ' و سلوک برادر خوردش مادھو سنگھہ تریاک خوردہ خود را کشت - از خوبی ھاے و نیک ذاتي او چہ نویسم - عقلے بہ کمال داشت - و اخلاص او بہ من در درجۂ بود کہ ھزار پسر و برادر را قربان یک موئے من مي کرد - مکرر بہ خسرو مقدمات نوشت و او را دلالت بہ اخلاص و محبت من مي کرد - چون دید کہ ھیچ فائدہ نہ دارد ' عاقبت نا معلوم است کہ بکجا منجر خواھد شد ' از غیرتے کہ لازمۂ طبیعت راجپوتاني است خاطر بر مرگ خود قرار دادہ - و چندین مرتبہ گاہ گاھے مزاج او در شورش می آمد - چنانچہ این حدیث میراثي بود کہ پدران و برادران او ھمہ یکبار در دیوانگي خود ھا را ظاھر می کردند و بعد از مدتے علاج پذیر مي شدند - در ایامے کہ من بشکار متوجہ گشتہ بودم ' روز بیست و ششم ذیحجہ سنہ ۱۰۱۳ ھجري افیون بسیار در عین شورش دماغ خوردہ در اندک زمانے در گذشت - گویا کہ این احوال پسر بیدولت خود را پیشتر می دیدہ است - اول کدخدائي کہ در آغاز جواني و خورد سالي مرا دست داد نسبت او بود - بعد از تولد خسرو او را شاہ بیگم خطاب دادہ بودم - چوں بد سلوکي ھائے فرزند و برادر را نسبت بہ من نتوانست دید ' از سرجاں در وقت دماغ پریشان شدن در گزشتہ ' خرد را ازیں کلفت و اندوہ باز رھانید -

" میري شہزادگي کے زمانے میں خسرو کي ماں بھی خسرو کے نا پسندیدہ اطوار و وضع اور اپنے چھوٹے بھائی مادھو سنگھ کے برتاؤ کے سبب سے افیون کھا کر مر گئی تھی - اس کي خوبیاں اور نیکیاں کیا لکھوں - انتہا کي عقلمند تھي - میرے ساتھ اُس کا خلوص اس درجہ بڑھا ہوا تھا کہ میرے ایک ایک رونگٹے پر ہزاروں بیٹے اور بھائي قربان کر دیتی - اس نے خسرو کو بارہا لکھا اور محبت و اخلاص کي راہ دکھاني رہي - جب دیکھا کہ کچھہ فائدہ نہیں نکلتا - انجام معلوم نہیں - کہاں تک پہونچے - تو غیرت کے باعث' جو راجپوتوں کي طبیعت کا خاصہ' ہے اپني جان دینے کي ٹھان لی - کبھی کبھي پہلے بھي اس کے مزاج میں کئي مرتبہ شورش نمودار ہو چکي تھی - یہ تو موروثی بات تھي - اس کے باپ دادا اور بھائی سب نے ایک نہ ایک بار پاگل پن ظاہر کیا تھا اور مدت کے بعد نفع ہوا تھا - جن دنوں میں شکار کے لیے گیا ہوا تھا ۲۶ ذیحجہ سنہ ۱۰۱۳ ھ * کو عین شورش دماغ میں اس نے بہت سی افیون کھا لي اور تھوڑي دیر میں چل بسی - گویا کہ وہ اپنے نالائق بیٹے کي حالت پہلے ہي سے دیکھہ رہي تھي - میري پہلي شادی جو شروع جواني یا لڑکپن میں مجھے نصیب ہوئي' اسي کے ساتھہ ہوئي تھي -

---

* ۶ مئی سنہ ۱۶۰۵ ع - لیکن اگر سال وفات ۱۰۱۲ ھجري ہے تو انگریزی سنہ ۱۶۰۴ ع

[یاد ھیں اب تک وہ ایام فراغت کے مزے
دل ابھی بھولا نہیں آغاز الفت کے مزے]

خسرو کے پیدا ھونے پر میں نے اُس کو "شاہ بیگم" خطاب
دیا تھا - جب وہ اپنے بیٹے اور بھائی کی بد سلوکی
میرے ساتھہ دیکھہ نہ سکی تو دماغ کی پریشانی
کی حالت میں ' اپنی جان کھو دی اور اپنے کو اس
رنج و تکلیف سے چُھڑا لیا - "

مادھو سنگھہ اور اُس کے خاندان والوں کے ذکر کی ضرورت نہیں اس سچی وفا شعار و غمگسار بیوی کی جدائی کا جو ماتم جہانگیر کے سادہ نگار قلم نے کیا ھے اُس کو نقل کر دینا کافی سمجھتا ھوں کہ اس درد دل کے ظاھر کرنے کی قوت اور کون سا انشاپرداز رکھتا ھے -

از فوت او بنابر تعلقے کہ داشتم ' ایامے بر من گذشت کہ از حیات و زندگانی خود ھیچ گونہ لذتے نہ داشتم - چہار شبانہ روز کہ سی و دوپہر باشد از غایت کلفت و اندوہ چیزے از ماکول و مشروب وارد طبیعت نہ گشت - چوں ایں قصہ بہ والد بزرگوارم رسید - دلاسا نامہ در غایت شفقت و مرحمت بدیں مُرید فدوی صادر گشت و خلعت و دستار مبارک کہ از سربر داشتہ بودند ھماں طور بستہ بہ جہت من فرستادند - ایں عنایت آبے بر آتش سوز و گداز من زدہ اضطراب و اضطرار مرا فی الجملہ قرارے و آرامے بخشید -

"اُس کے مر جانے پر' میرے دل کے لگاؤ کی وجہ سے مجھہ
پر زمانہ گذر گیا - زندگی و حیات کی' کسی قسم کی'
کوئی لذت میرے لیے باقی نہ تھی - چار رات دن جس
کے بتیس پہر ھوتے ھیں' انتہا درجہ کا رنج اور تکلیف

رهي - کهانے پینے کی کوئي چیز منهه تک نه گئي - میرے بزرگ باپ نے جب یه قصه سنا تو بڑي شفقت و مهرباني کے ساتهه اس فدوي ارادتمند کو دلاسے کا خط لکها - خلعت اور اپني برکت والي پگڑي سر سے جس طرح أتاري تهي' أسي طرح بندهي هوئي میرے لئے بهیجي - میرے سوز وگداز کي آگ پر اس مهر باني سے پاني پڑ گیا اور اضطراب وبےچیني میں کم یا زیاده قرار و آرام پهونچا - ''

یه خون کے آنسو جهانگیر کا قلم نهیں' آنکهه نهیں' دل بها رها هے - ایک ایسي عورت کے رنج میں' جس کي جواني ڈهل چکی تهي - دماغ کے پیچ و تاب نے اور بهي نڈهال کر دیا تها - گل چین جمال' هوس پیما جهانگیر بهي وهي هے' جس کي بیس بیگموں کي فهرست مسٹر بلاک مین نے آئین اکبري کے ترجمه میں پیش کی هے - جو شاه بیگم کي دائمی جدائي کے بعد بهي بهت سی بی‌بیوں کا خاوند هے - جس کي نسبت کین صاحب کا قلم شوخی سے کام لے کر لکهتا هے که '' خود جهانگیر کو بهي همیشه یه خبر نه رهتی تهی که اُس کے کون سے بیٹے کي ماں کون هے ''جس کو فرنگستان کے اعلیٰ قلم مست آلست بتاتے هیں اور رند هزار شیوه - جس کو طاعت حق میں سجده کے لیے سر جهکانا بهي گراں تها آج اپني صنم پرستي کی بدولت گم صم هو رها هے اور نیم دیوانه - الله ري' محبت کي قربانیاں ! -

جهانگیر کے ایسے عیش پسند و عشرت کوش کا برابر چار شبانه روز بهوکا پیاسا رهنا' اُس کے انتہائي رنج و قلق' دل کي بیقراري اور بے چینی کي کیفیت کو اُسی کی زبان سے ادا کر دیا هے - لیکن شهنشاه اکبر بهي اس سانحه غم سے متاثر هوئے بغیر نه ره سکا - دلبند فرزند کي تسلي

اور دلاسے کے لیے خط لکھا ۔ سر سے پگڑی اُتار کر جیسی بندھی ہوئی تھی ویسی ہی بھیجدی کہ زخم دل کے اندمال کے لیے یہی ایک مرہم تھا ۔

ایسی سلیقہ مند، وفا سرشت، نیک نہاد بیگم کی نیکیوں اور خوبیوں کا اعتراف، جو اُنیس (۱۹) بیس (۲۰) سال کی رفاقت ویکجائی کا نتیجہ تھا، اور شوہر کا اُس کو اور اُس کی محبت و اخلاص کو اسطرح یاد کرنا صنف نازک کے ہر فرد کے لیے قابل فخر اور موجب شرف ہے ۔ شاہ بیگم کا خیال جہانگیر کے دل سے کبھی محو نہیں ہوا ۔ تزک کے اوراق پر وہ بارہا اُس کا ماتم کرتا نظر آتا ہے ۔ آخر یہ کہہ کر چپ ہو جاتا ہے ۔

اک ٹیس جگر میں اُٹھتی ہے، اک درد سا دل میں ہوتا ہے
میں راتوں کو رویا کرتا ہوں، جب سارا عالم سوتا ہے

تنہا جہانگیر ہی نہیں بلکہ اور معاصر مورخ بھی اس کے اخلاق حسنہ، خصائل حمیدہ، پاکدامنی اور پاکیزہ وشی کو مد نظر رکھہ کر ادب و احترام کے ساتھہ یاد کرتے ہیں ۔ مرزا ہادی تزک کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ ایک خلفشار کے بعد، جب جہانگیر اِلہ آباد واپس پہونچا تو اکبر نے اُس کے لیے خلعت و انعامات بھیجے ۔ ہر طرح کا سامان تسلی و دلداری کیا، تب وہ کچھہ روز یہاں مطمئن و فارغ البال رہ کر بسر کر سکا تھا ۔

قضاارالدۂ سلطان خسرو نقاب آرائے نہاں خانۂ عدم گشت ۔ تفصیل این اجمال آنکہ دریئولا پیوستہ در دماغ آن عفت سرشت بہم رسید و سودائے بر مزاج استیلا یافت و چون خسرو از بیراہ روی در ملازمت حضرت عرش آشیانی ہموارہ بہ شکوۂ شاہنشاہی می پرداخت - این غم سر بار آن گشت ۔ در روزے آنحضرت بشکار تشریف بردہ بودند پوشیدہ از پرستاران افیون خوردہ سر بہ بالین فنا نہاد ۔ و چون سر آمد پردگیان حرم سرائے سلطنت بودہ اُنس و الفت تمام باو داشتند ۔ خاطر قدسی مظاہر ازین

سانحه به نهایت ملول و بغایت اندوهگین شد و بر دل مهر منزل این مصیبت سخت گرانی کرد، و حضرت عرش آشیانی از استماع این حادثهٔ ناگزیر و آشفتگی ضمیر فیض پذیر فرمان از روئے کمال مهربانی و غمگساری فرستاده تسلی بخش خاطر عاطر شدند -

"اتفاقاً، قضائے الٰہی سے خسرو کی ماں نے دنیا سے پردہ کیا - اندنوں، اُس نیک بی‌بی کے دماغ میں خشکی پیدا ہو گئی تھی - سودا مزاج پر غالب تھا - اُدھر خسرو کی بے راہی اور ناهنجاری کی حالت یہ ہو رہی تھی کہ اکبر کے حضور میں برابر جہانگیر کی شکایتیں کیا کرتا تھا - بیگم کو اس کا غم اور بڑھ گیا تھا - ایک روز جہانگیر شکار کو گیا ہوا تھا، بیگم نے لونڈی باندیوں سے چھپا کر افیون کھالی اور اپنے کو ختم کر دیا - حرم سرائے شاهنشاهی کی بی‌بیوں میں یہ سب سے بلند مرتبہ والی تھی - جہانگیر کو اس سے نہایت الفت و محبت تھی - شاهزادہ کے دل پر اس سانحہ سے بڑا رنج و اندوہ ہوا - یہ مصیبت بڑی بھاری تھی - اکبر کو اس حادثے اور جہانگیر کے قلق و تاسف کی اطلاع ہوئی تو کمال مہربانی و غم خواری فرمائی - فرمان بھیجا اور جہانگیر کی دلداری کی - دلاسا دیا -"

اسی واقعہ کی نسبت منتخب اللباب میں تحریر ہے -

درهمین آوان چوں والدهٔ خسرو که همشیرهٔ راجه مان سنگهه می شد سودائے مزاج بهم رسانیده بود از اداهائے خارج و اطوار ناهموار خسرو نا خلف که سه سال از شاهزادهٔ عالی نژاد بلند اقبال محمد خرم کلاں بود و نظر بر عنایات وتوجهات جد بزرگوار و پدر نامدار که نسبت به

خسرو در حق آن غرۂ جاہ و جلال زیادہ مبذول می گردید از راہ حسد برخود هموار نمي توانست بود و در خدمت پدر گستاخانہ و بے ادبانہ سلوک مي نمود۔ و عندالفرصت بخدمت جد بزرگوار طریقۂ غمازي از طرف شاهنشاهي بکار بردہ شعلہ افروزي عناد مي نمود - و مادر او در منع آن مي کوشید و فائدہ نمی بخشید ۔ علاوہ مرض سودا گردیدہ بود ۔ درین آوان روزے خود را از غصۂ اطوار آن فرزند بد عاقبت از افیون مسموم ساخت - و برخاستہ رفتن عبداللہ خان و واقعۂ والدۂ خسرو معاً بعرض شاهزادۂ نامدار رسید و باعث الم خاطر گردید ۔

"اسي زمانے میں خسرو کي ماں کا مزاج سودائي هو گیا تها جو راجہ مان سنگهہ کي بهن هوتي تهي ۔ نالائق خسرو شاهزادہ خورم سے تین سال بڑا تها ۔ مگر اس کے طور طریق کي کیفیت یہ تهی کہ اکبر، جب خسرو کے مقابلہ میں، شاهزادہ (جهانگیر) پر عنایت و توجہ زیادہ کرتا، تو اُس کو بڑا رنج و حسد هوتا تها ۔ باپ سے گستاخانہ اور بے ادبانہ برتاؤ کرتا ۔ موقع پانا تو دادا جان کے سامنے جهانگیر کی شکایتیں کیا کرتا اور دشمنی و عناد پهیلاتا ۔ اُس کي ماں هرچند باز رکهنے کي کوشش کرتي، فائدہ نہ هوتا ۔ اس کے سوا مرض سودا تو هو هي گیا تها ۔ انهیں دنوں کمبخت بیٹے کے اطوار سے غصہ هوکر زهر (افیون) کها لیا ۔ عبداللہ خاں کا اُٹهہ کر چلا جانا اور خسرو کي ماں کا واقعہ، خسرو نے ایک ساتهہ سنا تو بڑا رنج هوا" ۔

جیسا کہ جهانگیر کہتا ہے یہ سودا اور آشفتہ سري شاہ بیگم کا

خانداني مرض تھا - خود اُس کے نامور اور بہادر باپ امیرالامرا راجہ بھگوان داس میں، جب وہ صوبہ داري کابل پر ۹۹۴ ھ (۱۵۸۶ ع) میں متعین و سرفراز ھوا تو دیوانگي کے آثار ظاھر ھونے لگے تھے - حکیم نے نبض پر ھاتھہ رکھا - راجہ نے جمدھر کھینچ کر اپنے مار لیا - زندگي باقي تھي - بادشاھي طبیبوں کے علاج و پرداخت سے کچھہ دن بعد بمشکل شفایاب ھوا -

جب تک در و دیوار کي دنیا میں بِنا ھے

افسانہ رھے گا مري شوریدہ سري کا

ھار--افیون کھا لینے ' یعني اسطرح خود کشي کا خراب اور ناپاک عمل ھمارے ملک میں اگرچہ کم ھو چلا ھے ' مگر اب بھي باقي ھے - بعض وقت طبقۂ ادنی کي کوتاہ اندیش ' نادان عورتیں جب کسي صدمہ یا رنج کو برداشت نہیں کرسکتیں تو افیون کھا کر جان دے دیني میں - اسي کو آسان سمجھتي ھیں - قدیم زمانے میں اس کا رواج اونچے اونچے حلقوں میں بھي تھا - تین چار سو برس پیشتر کي متعدد مثالیں ، عہد جہانگیري کی تاریخوں میں ملتي ھیں - سال سوم جلوس ' یعني بسلہ ۱۰۱۷ ھ (سنہ ۱۶۰۸ع) کے واقعات میں لکھا ھے کہ جلال الدین مسعود پسر میر گیسو دراز نے جب انتقال کیا تو اُس کي ماں نے کمال دلبستگي و تعلق سے اُس کي حالت احتضار میں اُسي کے ھاتھہ سے افیون کھالي اور بیٹے کے مرنے کے ایک دو گھڑي بعد خود بھي اس جہان سے چل بسي - قریب ھي زمانہ میں لعل خاں شاھي کلاونت بھي دنیا سے رخصت ھوگیا - اکبر اُس کي بڑي قدر کرتا تھا - لعل نے بچپن سے اُس کے زیر نظر تربیت پائي تھي - ملازم خدمت خاص تھا - فن موسیقي خصوصاً ھندي گانے میں نظیر نہیں رکھتا تھا - وہ بیدلستیہ بلکہ ستر برس کے سن

میں فوت ہوا - کلانونت کی ایک کنیز تھی ، جس کی دلفریب صورت کا وہ عاشق ، اور فسون ساز چشم کا مسحور تھا - معمولاً اُسی کے ہاتھہ سے افیون کھاتا تھا - لعل خاں کے مرنے پر اُس نے بھی افیون کھالی ، اور عدم کی راہ میں مالک کی رفاقت اختیار کی - جہانگیر کہتا ہے کہ مسلمانوں میں کسی عورت نے اس درجہ وفاداری کا حق کم ادا کیا ہوگا - میر جلال کے سلسلہ میں بخشی معتمد خاں (مؤلف اقبالنامہ جہانگیری) کا بیان ہے کہ ہندستان کی یہ رسم تو بہت پرانی ہو چکی کہ شوہر کے مر جانے پر ہندؤں کی عورتیں خود کو آگ میں زندہ جلا دیتی اور اپنی جانِ عزیز اپنی محبت و وفاکیشی پر فدا کر دیتی ہیں - بارہا ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ دس بیس عورتیں خواہ بی بی رہی ہوں خواہ باندی ، آگ میں خود گھس گئی ہیں اور پورے استقلال کے ساتھہ اپنے کو جلا دیا ہے - مگر بیٹے کی جدائی میں ماں کی یہ کیفیت اس سے پہلے نہیں سنی گئی - جہانگیر بھی تزک میں لکھتا ہے کہ ماؤں سے خواہ مسلمان ہوں خواہ ہندو ، ایسا واقعہ ظہور میں نہیں آیا -

شاہ بیگم کے مرنے کے بارے میں ، یہ تو وہ مسلمہ اور متفقہ بیان تھا ، جو بلا اختلاف الفاظ تمام ہندو اور مسلمان مورخوں اور اُن کے ریزہ چین انگریزوں نے کیا ہے - مگر با ایں ہمہ ایک اور روایت بھی ہے جو بداهةً لغو اور نا قابل التفات ، یا کسی افسانہ کی ٹوٹی ہوئی لڑی معلوم ہوتی ہے - لیکن ایک ذمہ دار و نامور اہل قلم کے قلم سے نکلی ہے اس لیے یہاں اُس کا نقل کرنا ناگزیر ہے - سر ولیم سلی مین اپنی دلچسپ کتاب "سیاحت و تذکار" میں ایک موقع پر لکھتے ہیں :-

"جہانگیر کے بڑے بیٹے خسرو کی آنکھیں باپ کے حکم سے

نکلوالی گئی تھیں' کیونکہ وہ بغاوت پر بغاوت کیا کرتا تھا - بغاوت کی ترغیب دینے والے دو سبب تھے - ایک خود اُس کی خواہش کہ ماں کے قتل کا انتقام لوں - دوسرے' اُس (ماں) کے بھائی' ہندو شاہزادہ مان سنگھہ اور خسرو کے خسر خان اعظم' اکبر کے وزیر اعظم' کی یہ آرزو کہ اپنے عزیز کو تخت پر دیکھیں - نور جہاں نے خسرو کی ماں یعنی راجہ مان سنگھہ کی بہن کو بلایا تھا کہ ہمارے یہاں آ کر ایک کنوئیں میں جو ہماری محلسرا کے صحن میں ہے' چاندنی رات میں میرے ساتھہ جھانکو - جب وہ جھانکنے لگی تو اُس کو کنوئیں کے اندر ڈھکیل دیا - نورجہاں نے جب دیکھا کہ اس نے ہاتھہ پانوں مارنا چھوڑ دئے ہیں تو شور و غل کیا - اور بات بنائی کہ رانی اتفاقیہ گر پڑی ہے -''

ڈاکٹر ونسنٹ اسمتھہ سازرف بین و محتاط تاریخ نویس اس پر حاشیہ لکھہ کر اپنا خیال ظاہر کرتا ہے :-

''ممکن ہے کہ یہ حکایت صحیح ہو - مگر اس قسم کا الزام قطعاً نا ممکن‌الاثبات ہے اور محلات کی فضا میں نشو و نما پا جانے والا -''

حقیقت یہ ہے کہ تاریخی واقعات کے رد و قبول میں بعض یوروپین مورخ ایک روش خاص' یا اُن کی اصطلاح میں ایک ''اُصول'' رکھتے ہیں - اُن کا دستور ہے کہ مسلمان بادشاہوں اور بیگموں کی نسبت کیسی ہی بے بنیاد و بیہودہ بات بنائی یا سنائی جائے تو اُس کو باور یا بیان کرنے میں تامل نہیں کرتے - ممکن ہے کہ یہ آپ ہی کی طبع زاد ہو - مخالف و موافق تمام روایتوں کے مطابق والدۂ خسرو نے آخر سنہ ۱۰۱۲ ھ یعنی مئی سنہ ۱۶۰۴ ع میں افیون کھا کر جان دی تھی - سر ٹامس ہربرٹ' بیال' اور الاک‌مین اس بارے میں متفق‌اللسان ہیں کہ شمسی حساب سے نور جہاں چونتیس (۳۴) سال کی تھی جب سنہ ۱۶۱۰ ع میں شبستان شاہی یعنی جہانگیر کے عقد میں آئی تھی - ظاہر ہے کہ

اُس کے بعد مہرالنساء کو نور محل اور نورجہاں بننے میں بھی کچھہ زمانہ لگا ہوگا - وہ سنہ ۱۶۰۴ع میں شیر افگن کی بی‌بی تھی - بنگالہ میں رہی ہوگی - تو نورجہاں اور شاہ بیگم کی یکجائی اور جوش رقابت و عناد کو کون ہوش‌مند باور کرے گا !!!

جو تمہاری طرح، تم سے، کوئی جھوٹھہ بات کہتا

تمہیں منصفی سے کہدو، تمہیں اعتبار ہوتا

خلوص و وفا کی پیکر، بے چین اور درد مند دل والی بیگم آج اِلٰہ‌آباد کے خسرو باغ میں ایک وسیع و سہ منزلہ مقبرہ میں راحت و سکون کی نیند سو رہی ہے - [یہ خسرو باغ کا تیسرا مقبرہ ہے] - اصل تربت نیچے والے درجہ میں زمین پر مع اپنی سقف اور صحنچیوں کے اینٹ چونے کی بے تکلف تعمیر ہے - کبھی چاروں طرف سے بند تھی اور مسدود، جیسا کہ مسٹر بیل نے مفتاح‌التواریخ میں لکھا ہے - منافذ اور جھلجھریوں سے روشنی کا بقدر قلیل انتظام رہا ہوگا - مگر اب یہ کیفیت باقی نہیں - غالباً اصلی حالت میں تبدیل کردی گئی ہے - ممکن ہے کہ کبھی اس پر نقش و نگار یا رنگینیاں رہی ہوں مگر اس وقت تو سوا سفیدی اور چونے کی تھُوں کے کچھہ نظر نہیں آتا - بگڑی ہوئی سی حالت ہے - مقبرہ کا دوسرا درجہ خالی، پست اور سادہ ہے - تیسری منزل یعنی بالائی حصہ نسبتاً مختصر ہے، جس پر ایک خوش وضع و خوش نما قبہ سایہ افگن ہے - اسی جگہ (چھت کی بلندی پر) سنگ مرمر کی نقلی یا مصنوعی قبر مع محجر (کٹہرہ) اور لوح مزار کے بنی ہے - یہ پورا حصہ نفیس اور نازک گُل‌کاری اور بیل بوٹوں سے مزّین ہے - تعویذ کے دائیں بائیں پہلو میں یہ رباعی جلی حروف میں پاکیزہ نستعلیق میں منقوش ہے :—

بیگم کہ ز عصمت رخ رحمت آراست

اقلیم عدم ز نور عزت آراست

سبحان اللہ' زہے کمال عفت

کز حسن عمل چہرۂ جنت آراست

تعویذ پر حسب معمول قلمدان بنا ہے -

لوح مزار' شاہزادی کے شایان شان' خوب بلند ہے - اس پر یہ کتبہ ہے :—

اَللہُ اَکبَر

چوں چرخِ فلک ز گردشِ خود آشفت

ہر زیر زمیں آئنۂ مہ بنہفت

تاریخِ وفاتِ شاہ بیگم جُستم

از غیب مَلَک بخلد شد بیگم گفت

[سنہ ۱۰۱۲ھ]

کاتبہ عبداللہ' مشکیں قلم' جہانگیر شاہی -

'' بخلد شد بیگم '' سے ۱۰۱۲ عدد نکلتے ہیں جو سنگ بالین پر مرقوم ہے - مسٹر بیل اپنی اوریئنٹل بیاگرفیکل ڈکشنری میں ۱۰۱۲ھ = ۱۶۰۳ع لکھتے ہیں - تزک میں سال وفات ۱۰۱۳ چھپا ہے - ممکن ہے کہ کاتب کی غلطی ہو -

بیگم کی گود جس طرح جیتے جی بھری پُری رہی' اُسی طرح آج بھی ہے - اُس کی آغوش میں پانچ بچے کھیل رہے اور قبر کے پہلوؤں اور پائنی حصوں کو آباد کیے ہوئے ہیں -

شاہ بیگم کا اصلي نام مجھے تحقیق نہ ہو سکا - مقامي و زباني روایات '' پري‌با '' اور '' جودھا بائي '' بتاتي ہیں - جیسا کہ تمام مورخین کو تسلیم ہے ' جودھابائی ' یا ' جودہ بائي ' اُس کي چھوتي سَوت یعنی جہانگیر کي دوسری بی‌بی ' ملکۂ جہاں جگت گوشائیں عرف بال‌متي کا نام تھا - شاہ بیگم نہ جودہ بائي تھي نہ جودہ‌پور کی - اس لیے یہ ممکن ہے کہ اُس کا نام '' پریبا '' رہا ہو' مگر کسی پراني تاریخ میں میري نظر سے نہیں گزرا - تاریخ جہانگیر میں پروفیسر بیني پرشاد نے '' مان باي '' لکھا ہے - اُن کا ماخذ یا سند معلوم نہیں - مگر ' مسلّم ہے کہ ان کي دور رس نظر راجستان کي ہندي تاریخوں اور نسب ناموں سے بہت سے نادر جواہرپارے نکال کر لائي ہے جن کي چمک دمک ہماري آنکھوں کو خیرہ کر رہي ہے ' اور جن سے ہم ایسے بے مایہ اب تک محروم تھے - مزید بر آں ' مان سنگھ (بھائي) اور مان بائي و (بہن) کے ناموں کي یکساني اس کو قرین قیاس و قابل قبول پاتي ہے ' نیز آسان -

صمصام‌الدولہ شاہ نوازخاں کا مآثرالامرا (جلد دوم ' صفحہ ۱۸۱) میں یہ لکھنا کہ '' سلطان خسرو اودے سنگھ عرف موتہ راجہ کي تن ستی نامی لڑکي کے بطن سے متولد ہوا تھا '' ایک فاش بلکہ فاحش غلطي ہے - ' مان ستي ' یقیناً ' بال متي ' کي کتابت کي عالم آشکار خرابي ہے - وهي اُودے‌سنگھہ فرمانرواے مارواڑ کي بیٹي تھي - جس سے خسرو نہیں ' خورم پیدا ہوا تھا - معاف رکھیے سوانح نویسوں ' اور اُس مقہور و بے بس بندے ' سلیم کو جو کہنے کو اُس وقت بھی ولي عہد اور کشور ہند کا آیندہ شہنشاہ تھا جس پر عہد شباب میں معصیت کوشي ' ہوس رانی اور ہوا پرستي کا الزام یار وا غیار ناحق لگاتے ہیں - جو حقیقتہً بیچارہ و مجبور ' مفلس

معذور تھا - جس کی عافیت اور اُٹھتی جوانی بلکہ زندگی ہر سال مصالح ملکی، تعدیلات سیاسی و انتظامی، تدابیر مملکت و جہانداری کی قربان گاہوں پر نذر چڑھائی جاتی تھی - جس کو اپنے بے ترس و ناخدا شناس باپ کی حکمت عملی، مرضی و خواہش پر روز روز تصدق ہونا پڑتا تھا - جس کے لیے کم عمری و حداثت سن میں بھی خود کام امرائے دولت کے عجز و نیاز، اعاظم سلطنت کی جاہ طلبی اور نمایشی ایثار پر ہی بھبوں کی بھرتی جاری رہتی تھی - جو تخت و تاج اور کامل اقتدار و اختیار پا کر ایک، اور صرف ایک، نور جہاں کا ہو کر رہا - لیکن ایام شاہزادگی میں اُسی کی شبستان عشرت میں سات (تو صرف) رانیاں داخل کی گئی تھیں - ان کا پتہ چلانا، نام و نشان بتانا کیا آسان بات ہے ؟ - تنہا صمصام الدولہ اور مسٹر بیل ہی نہیں بلکہ بہت سے لکھنے والے ایسی ہی غلط فہمی و غلط اندازی کا شکار ہوئے ہیں - کاش ! تاریخ کے کسی ہوشیار مطالعہ کرنے والے کو توفیق رفیق ہو اور دودمان گورگان کی حریم عشوۂ و ناز، سرا پردۂ خلوت و ناموس میں باریابی - تاکہ اِن دُرون پردہ ، محرمان راز سلطنت، راج رانیوں کا تذکرہ لکھے اور معمولی معمولی غلطیوں کا ازالہ کر دے -

مرنے کے وقت بیگم کی عمر تینتیس (۳۳) سال کے قریب تھی - اونیس سال دلدار و دلنواز خاوند کی خدمت گزاری، اطاعت و رفاقت میں گزارے - آج وہ اپنے شوہر کے قرب ظاہری سے محروم اور اُس کی آخری آرامگاہ سے منزلوں دور ہے - مگر اُس کی بے چین روح کو تسکین و تسلی ہے کہ خسرو باغ کی یہ ذرا سی گز زمین اس کی ابدی خواب و راحت کے لیے اُسی کے غمگسار سرتاج نے پسند کی تھی - اُسی کے ناز بردار ہاتھوں سے وہ سپرد خاک ہوئی -

نگارندۂ سطور، عبرت و وفا کا سبق حاصل کرنے شاہ بیگم کے حسین و دلکش مرقد پر بارہا گیا، اور زبان حال سے کسی کی غفلت و بے خبری کا شکوہ سنج پایا ہے۔

بر مزار ما غریباں، نے چراغے نے گلے،

نے پرِ پروانہ سوزد نے صدائے بلبلے

محمد اجمل خاں

وقائع ثنا

یا

رزمنامۂ پانی پت

وقائع ثنا ایک رزمنامہ ہے جو سید زاہد صاحب المتخلص بہ ثنا نے پانی پت کی تیسری لڑائی کے متعلق سنہ ۱۱۷۴ ہجری میں لکھا تھا - اس کتاب کا سر ورق غائب ہے - لیکن پرانے زمانے میں یہ قاعدہ تھا کہ پہلے صفحہ کو سادہ رکھتے تھے اور دوسرے صفحہ سے تحریر شروع کرتے تھے - لہذا ایک صفحہ کتاب کا کم ہے - دوسرا ورق بوسیدہ ہوگیا ہے اور اکثر مقامات پر مشکل سے پڑھا جاتا ہے - کل ۱۰۹ ورق ہیں - اور ہر صفحہ پر نو شعر خط خام میں لکھے ہوئے ہیں - کل اشعار ۲۱۱۹ ہیں - اور تقطیع چھوٹی ہے -

دسمبر سنہ ۱۹۳۳ع میں کاتب الحروف اپنے وطن قصبہ گونڈی ضلع پرتاب گڈھ (اودھ) گیا ہوا تھا - یہ قصبہ دریائے گنگا کے کنارے کڑے اور

مانک پور کے درمیان آباد ہے - اور پٹھانوں کی پرانی بستی ہے - وہاں یہ کتاب دستیاب ہوئی جسے کسی پٹھان نے محض رزمیہ شاعری کی دلچسپی کی وجہ سے محفوظ رکھا تھا - کتاب کے آخر میں درج ہے کہ بعون اللہ تعالیٰ بتاریخ دوازدھم ربیع الثانی سنہ ۱۲۰۴ ھجری بخاطر داشت محمد تقی خان ساکن گوتنی از خط خام میر عدل جائسی در پرگنہ حسن پور مقام بہاری پور متصل سرسا برائے خاطر برخوردار ذوالفقار خان تحریر یافت - بساعت نیک باتمام رسید -

ہر کہ خواند دعا طمع دارم * ز آنکہ من بندۂ گنہگارم

اس کے بعد جنگ نامہ منصور علیخان ہے ' جو دوسرے خط میں بالکل لکھنؤ کی زبان میں لکھا ہوا ہے ' اور یا تو کسی نے بعد میں اضافہ کیا ' یا مالک کتاب نے خود لکھا ہے - وقائع ثنا کی تصنیف سنہ ۱۱۷۴ھ میں شروع کی گئی سنہ ۱۱۷۶ھ ۱۲ شعبان کو ختم ہوئی - یعنی آج سے ۱۷۸ برس پہلے کی تصنیف ہے -

زبان

صاحب تصنیف کی زبان نہایت قدیم ہے - یہ زبان تقریباً وہی ہے جو ولی کی تھی اس لئے ثنا کا شمار دور اول کے شعرا میں کیا جاسکتا ہے - ثنا علوم عربیہ و فارسیہ کے زیادہ ماہر معلوم ہوتے ہیں - جا بجا ایسی فارسی اور عربی بندشیں استعمال کی ہیں جو صرف ایسا شخص استعمال کر سکتا ہے ' جو السنۂ مذکورہ پر کما حقہ حاوی ہو - بعض بعض جگہ تو پورے مصرعے فارسی کے ہیں - مثلاً ذیل کے اشعار ملاحظہ فرمائیے :—

باعزاز آن شاہزادہ حسن
کہ اُن پر فدا ہو جدہ جان و تن

بحق حسین آن که در کربلا
نواسہ نبی سید باصفا

بحق تقاوت محمد تقی
بحق صداقت علی نقی

بحق ہادی راہ مہدی زمان
کہ ہے قاتل الکفر روشن روان

خدایا بحق نبی تا ابد
نگہ رکھہ تو از حاسد و چشم بد

ہے سر سبز او تازہ از آدانت
بسر ما و گر ما ہمیشہ بسانت

سنا جب خبر تو گئے برزکین
شکنبا پڑے غصہ سون بر جبین

کروں وہ طرح جنگ کی درمیان
چون داؤد باقوم جالوتیان

مثل ہے یہ مشہور دانائے سوں
کرے بازی از ریش با بائے سوں

بشرطیکہ سلطان عالی محل
کرین آپ بھی ڈیرہ باہر نکل

یکے روز فرخ مبارک سعید
سب احکام انجم سوں آیا پدید

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ زبان ریختہ میں رزمیہ شاعری کی
بنیادیں کتاب وقائع نذا ہی ہے - تذکرہ نویسوں نے غالباً ایسے بلند پایہ

شاعر کے متعلق جو خاموشی اختیار کی ہے وہ اسوجہ سے ہے کہ شاید ثنا نے زمانہ گردی اور عام ملکی انتشار سے پریشان ہوکر خانہ نشیلی اختیار کرلی ہوگی - یا ایسی خود دار طبیعت پائی تھی کہ بادشاہوں اور امرا کی دربار داری نہ پسند کی ہو ' تذکروں میں عموماً ایسے ہی شاعروں کے نام ہیں جو کسی رئیس یا بادشاہ سے توسط رکھتے تھے یا کم از کم ایسے شہر میں رہتے تھے جہاں امرا و شعرا کی کافی تعداد تھی یہ بھی ہوسکتا ہے کہ چونکہ ثنا کی تصنیف اُس زمانے کی ہے جبکہ زبان ریختہ عوام کی زبان سمجھی جاتی تھی ' اور سلطنت اور خواص کی زبان فارسی تھی - اس لئے اس طرف کسی نے توجہ نہ کی اور صرف ایک پٹھان نے جو اپنے فرزند ذوالفقار خاں میں جذبۂ رزم باقی رکھنا چاہتا تھا ' میر عدل جائسی سے لکھوا کر ایسی بے نظیر تصنیف کو محفوظ کر دیا -

وقائع ثنا کا خلاصہ

ابتدا میں حمد ہے - چونکہ سر ورق نہیں ہے - لہذا ۶ - ۷ اشعار کم ہیں حمد کا نمونہ یہ ہے :—

دہن کو دیا چشمۂ خوشگوار
او مخزن سخن کا کیا گنجدار
دیا لب چو یاقوت رنگ نگین
دیا تاب دندان کوں در ثمین
دیا ابرو رخ کو بڑی درجہ علو
کہا خوشنما دي ذقن او گلو

دیا طعمہا نو بنو رنگ بو

کرم سوں کہا تب کلوا واشر ہوا

اس احساس کا کر سکے کچھ بیان

اگر ہوئے ہر موئے صدصد زبان

دیکھو صانع کے دست تقدیر کون

کیا مختلف رنگ تصویر کون

کیا کوی نبوت دے موسی خلیل

کیا کوئی نمرود فرعوں ذلیل

کوئی شاہ کرکے دیا عدل داد

کوئی ظالم و مدبر و بد نہاد

کسی کوں دیا دولت و عز و شان

کسی کو کیا خوب محتاج نان

حمد کے بعد عنوان ہے - "تضرع نمودن بدرگاہ جل و علی و آمرزش خواستن از گناہان" اس میں خدا کو بہت سی قسمیں دیں ہیں کہ میرے گناہوں کو بخش دے :—

مثلاً

قسم ہے تجھے رحم اور قہر کی

قسم ہے صفت لہر در لہر کی

قسم ہے تجھے ناز طفلاں کی

قسم تجھکوں عشق جوانان کی

تجھے آہ سرد اسیراں کسوں

تجھے ہوئے خون شہیداں کسوں

تجھے اپنی عظمت خدائی کسوں
تجھے میرے درد جدائی کسوں
تجھے روح حـوا و آدم کسوں
تجھے اپنی سب خلق و عالم کسوں

اس کے بعد عنوان ھے "در نعت حضـرت سیدالمرسلین شفیع المذنبین رسول اکرم صلی اللہ علیہ و سلم" نمونہ یہ ھے :--

ملائک کریں پائے بوسی تـری
نہ تختِ فلک ایک کرسی تری
کیوی زھرہ برجیس خدمت کریں
ثریا تـری چنر کی جیالریں
دیوے ماہ وقت سواری رکاب
بسـر چمکیان لے چلے آفتـاب
رواں جب کرے فوج کوں بر عدو
کریں عیسیٰ لگین صدا طر قو
جو دیکھیا تری بخشش عام کوں
ھوئی حرص عزازیل خود کام کوں
لگا کھنے افسوس سوں آہ مار
او روتا تھا حسرت ستیں زار زار
جو جانتا میں ھوگا محمد نمود
میں ھی کرتا آدم کوں پہلے سجود

نعت کے سلسلے میں چاروں اصحاب کی منقبت یوں کی ہے :—

ہو حاکم شریعت کے مسند بنائے
مربع بٹھے چار تکیہ لگائے

بجائے خود ہر یک کو تمکیں دیا
ابوبکر کو یار پیشیں کیا

عمر داہنے اور عثماں یسار
رکھا پشت دیں شاہ باذوالفقار

کہوں شاہ کہ کے علی مرتضیٰ
قدم پر قدم ہے نبی الورا

مخالف پہ ہوتا تھا تنگ روزگار
کہ جس وقت چلے شاہ دلدل سوار

لرزتے تھے آواز چابک کے بیچ
دبکتے کبوتر سے کابک کے بیچ

دیا زینت ہر یک تدیں گرد و پیش
او مضبوط کی پشت بازوئے خویش

بٹھے درمیان سید ہاشمی
بفرمان ایزد کیا حاکمی

نعت کے بعد عنوان ہے " مناجات کردن بدرگاہ باری تعالیٰ جل شانہٗ بشفاعت ائمہ معصومین " لیکن اس میں حضرت علی کا نام نہیں ہے غالباً اسوجہ سے کہ اصحاب کے زمرہ میں آپ کا نام آ چکا ہے -

اس میں حضرت فاطمہ بنت رسول اللہ سے شروع کیا ہے - ان کے بعد ائمہ ، حسن ، حسین ، زین العابدین - باقر - جعفر - موسیٰ رضا

محمد تقی - علی نقی - حسن عسکری - مہدی زمان رضوان اللہ علیہم کے نام ہیں - اور ان سب کے واسطے سے یہ دعا مانگی گئی ہے کہ :—

او برلیائے میری تو یک آرزو * کہ اس بن ترستا خلق مو بمو
مسلط کر اولاد تیموریہ * دے آرائش این عالم صوریہ

اس کے بعد " عذر خواستن از بزرگان کہ چشم از عواقب [۱] کہتران بپوشند " ہے - جسمیں اپنا نام اور وطن بتایا ہے -

نام و وطن مصنف و تاریخ تصنیف

زاہد نام - ثنا تخلص - سادات قصبہ کراری ضلع الہ آباد سے ہیں - کراری میں شیعہ زیادہ اور سنی کم آباد ہیں - لیکن میں اوپر عرض کرچکا ہوں کہ آپ بظاہر سنی معلوم ہوتے ہیں - اپنے متعلق فرماتے ہیں :—

سنو عرض میری ای صاحب کمال
حدیقہ سخن کا ہوں میں نونہال
کہا جنگ میں شاہ دران کی
خلیفہ نبی ظل سبحان کی
کیا نظم در ریختہ بیتہا
حقیقت تمام ابتدا انتہا

---

[۱]— کاتب کی کم علمی پر یہ لفظ دلیل ہے - حقیقت میں بجائے عواقب کے معایب لفظ چاہئے -

سنا تھا جو کچھہ اور آنکھوں دکھا
جدا کر حقیقت وقائع لکھا
توی سن ھجران سید نامدار
ھزار اور صد اور ھفتاد چار
کرو سیر جو تم وقائع ثنا
کہیں بیت کے بیچ دیکھو خطا
صلاح دیو اُسے جو رہے آن بنی
کرم سوں کرو دور طعنہ زنی
میں کوشش سے اپنے کیا نا قصور
فاما سخن کا گہر ہے دور دور
کہاں لگ چلے یہ طبیعت نحیف
اصل سوں ہے ترکیب انسان ضعیف
جو ھو نیش زن کوئی ز راہ تباہ
ازیں عقربا دہ خدایا پناہ
مصنف کا سن نام جو ناسنا
اسم زاھد ہے او تخلص ثنا
ہے سادات کا کمترین خادماں
او پشتین سے ھے کراری مکاں
صفت اُس مکان کی نہیں مختصر
کہا کچھہ ذرا موجز ومختصر
خدا نے دو کونین سے گر قبول
مہر سوں کیا جائے آل رسول

غرضکہ یہ تصنیف جس کا نام مصنف نے وقائع ثنا رکھا ہے ۱۱۷۴ھ میں شروع کی گئی - ۱۱۲۶ھ میں ختم ہوئی - لکھتے ہیں کہ :—

بخوش روز شنبہ بوقت سحر
و در چار سن شاہ عالی گہر
تھے ہجرت کے سن یا ز ہفتا دوشش
او تاریخ شعبان کی بھی دوشش
ثنا نے کیا یہ وقائع تمام
محمد نبی پر درود و سلام

آخری شعر ہے :—

جو دل خوش کرے پڑہ وقائع ثنا
کرم سون کرے تک ثنا پر ثنا

عذر خواہی اور اپنا نام و وطن بتانے کے بعد اصل کتاب شروع ہوتی ہے - عنوان ہے "وقائع اول در صنت نا نہا و عماداری او - در تغیر کردن ملہار از ہندوستان - بحال شدن جنکو و جنگ نمودن جھنکو در سکر تال" - اسے اسطرح شروع کرتے ہیں :—

دیکھو قدرت قادر ذوالجلال
کسی کون نہیں گفتگو کی مجال
ملک پر دو عالم کے مختار ہے
حکومت اُسی کون سزاوار ہے
نعرض سکے کر کوئی کیا گماں
سب تابع حکم کے ہیں کون و مکاں

اس وقائع سے ایک خاص بات یہ معلوم ہوتی ہے - کہ اُس زمانے میں ہندو مسلمانوں کے تعلقات نہایت اچھے تھے - حالانکہ مرہٹوں نے بہت زیادہ سختی شروع کردی تھی - چوتھہ کے علاوہ لوٹ مار بھی ہوجاتی تھی لیکن ہندوستانیوں کو اُن سے زیادہ شکایت نہ تھی - بالاراؤ پیشوا کے زمانے میں ہند کا صوبہ‌دار ملہار راؤ تھا - اُسکے زمانے میں سب ہندی خوش تھے - لیکن جب جھنکو راؤ صوبہ دار ہوا تو اس سے ہندو مسلمان سب نالاں ہوگئے حقیقت میں مرہٹہ ' راجپوت اور جات ' بحیثیت ہندو ہونے کے کبھی متحد نہیں ہوئے ' اور نہ اس حیثیت سے کبھی ہندوؤں اور مسلمانوں کی لڑائی ہوئی - وقائع اول کے اشعار ذیل صاف صاف اس امر کی تائید کرتے ہیں :—

یک سردار دکھن میں با حشم و جاہ
کہ رگھنا تھا سب راو رانا نگاہ
اسم بالاراؤ تھا بہت بے نظیر
او نانا بھی کہتے صغیر و کبیر
سپاہی جوانمرد و حاتم بڑا
او تارا تھا دولت کا ماتھے جڑا
مقرر کیا پونا میں جائگاہ
رکھا ماتیہ چن چن دکن کی سپاہ
نہ ایسا ہوا جب سوں پونائے میں
نہ ہندی جسے ہندیو دکھنی

(ملاحظہ فرمایے ہندی اور دکھنی الگ الگ قومیں تھیں - ہندی میں ہندو مسلمان دونوں داخل تھے)

اتنا لکھنے کے بعد اُسکی فتوحات کی تعریف کی ہے پھر لکھا ہے :—

طرف ہند کے بھیجتا صوبہ دار
تعینات رکھتا تھا لکھہ لکھہ سوار
تھا مامور برہند ملہار راؤ
کہ رکھتا بہت ہندیوں سوں لگاؤ
بگڑتا کدھین بیجا حرکت ستیں
نکالتا تھا سب کام حکمت ستیں
رفیق ہوتا جسکا دل و جان سوں
نہ رکھتا عداوت مسلمان سوں
ہوئی منقلب گردش روزگار
کیا جھنکوں کوں ہند کا صوبہ دار
سنا غازدین خان نے یہ روبکار
ہوا جھنکو اب ملک کا صوبہ دار
کہا کیا کیا نانا نے خیال خام
تھا ملہار جی سب سوں واقف تمام
نجانے طرح کیا کرے اشکار
بہت بد ہے یہ طفل ناکردہ کار

القصہ جھنکو راؤ نے دھلی پر حملہ کردیا - عمادالملک غازی الدین خاں وزیر تھا اور جو کچھہ نام نہاد حکومت باقی تھی وہ اس کے ہاتھہ میں تھی - اور اس طرح صلح ہوئی کہ جھنکو راؤ نے کہا :—

جو کرتا سلوک تم سے آیا ملہار
وہی ہے مرا آج قول و قرار

یک شمشیر خلعت مرحمت کرو

او پنجاب کو مجھکوں رخصت کرو

جو کچھہ ہم کریں جا وہاں دست برد

کریں اونکو حصہ تمہارا سپرد

مرہٹے لٹیرے تھے - مگر شاہی پروانہ حاصل کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے دیوانی کی اجازت لیکے جھنکو راؤ پنجاب کی طرف روانہ ہوگیا -

نجیب الدولہ نے جب مرہٹوں کی آمد سنی تو اُس نے آکر راؤ جھنکو سے صلح کی باتیں شروع کیں اور اُس سے مل کر یہ طے کیا کہ بخشی گری مجھے دلوائے اور غازی الدین خان کو نکالئے - لیکن باغیت کے قریب جھنکو نے اودھ پر حملہ کرنے کا ارادہ کردیا - اسلئے نجیب الدولہ وہاں سے رخصت ہوا اور سکرتال پر مرہٹوں سے خوب لڑا - اسکے بعد پسپا ہوگیا اور احمد شاہ ابدالی کو خط لکھا کہ جلد آئے - احمد شاہ نے لکھا کہ :—

ہوا حائل اب موسم برشکال

نظر میں نہیں ہے سپہ کا نکال

کروں ہند بردار از گرد خیل

بشرطے طلوع ہو ستارہ سہیل

اس کے بعد وقائع دوم ہے - یعنی " فرستادن ایلچی غازدین خان بطرف شاہ درانی - جواب آوردن ایلچی و رخصت شدن غاز دین خان از بادشاہ برائے شجاع الدولہ بہادر بنابر صلح نجیب خان و جھنکو در سکر تال " -

نجیب الدولہ کی نوشت و خواند کا حال سن کر عماد الملک غازی الدین خاں نے احمد شاہ کو ایلچی کے ذریعہ سے بہت کچھ زر و جواہر بھیجا اور لکھا کہ آپ کے تشریف لانے کی چنداں ضرورت نہیں ہے -

سنا جاتا ہے شاہ کا پھر نزول
اب ہرگز نکیجئے کبھی قصد بھول
یہاں مرہٹہ ہیں بہت بے ادب
لئے پھرتے ہیں فوج سردار سب
کریں جو طلب فوج کوں وقت کار
دکھن سے چلے آویں لکھا سوار
تسین بیٹھے رہئے وہیں باسرور
غنیم سے متابل ہونا کیا ضرور
خبردار کرنا غلاموں کا کار
پھر آگے شہنشہ کا ہے اختیار

، احمد شاہ نے اسکا سخت جواب دیا - غازی الدین نے بادشاہ وقت سے درخواست کی آپ اگر باہر نکل کے جنگ کریں تو ہم یقیناً درانیوں کو بھگا دینگے - بادشاہ نے کہا کہ میرے پاس نہ فوج ہے نہ روپیہ -

چھپا کچھہ نہیں تجھہ سوں اے نور چشم
نگہ کر تو ہی کچھہ بھی ہے خیل و حشم
نہ ماھی مراتب نہ جھنڈا نشان
رہے نہ مرے ہاتھہ گجنال بان
نہ نوبت نقارے نہ کرنائیاں
نہ جھانجھیں نفیریں نہ سرنائیاں

نہ عربی دھل ھے و نہ طاسہا
نہ کرناتھہ کے دکھنی باجہا
نہ ضربیں رھیں اب نہ گھوڑ نالیاں
نہ رھڑو نہ لمچھر نہ چبوچبکیاں
رھیں نا وہ شانئیں جیوں مورتیں
جزائر دھماکے نہ زنبورگیں
نہ آ شام کے وے سوار اوپچي
تیاري کوں میرے رھے اوپچي
نہیں ساتھہ میرے رسالے بلی
نہ آلشاھی او نہیں کابلي
رھے نا وے قولر او عہدری
نہ والا شاھی جنگی تبي بر تري
اعلی شاھی ' ولا شاھي رسالوں کے نام معلوم ہوتے ہیں
نہ احدی رھے نا رھے گرزدار
نہ ساتھی رھے وے مغل پنجہزار
نہ پر قول کہیں اب نہ بنگہ بہیر
نہیں ساتھی چہوتے بڑے کوئی امیر
نہ فراش ھیں او نہیں خیمہ گاہ
نہیں ساتھہ مردان جنگی سپاہ
نہ لشکر کہیں اب نہ اردو بزار
نہ بتال صراف نہ بیلدار
نہ ھاتھی ھمارے و نہ فیل بان
نہ باروں کو ھیں اونٹ نہ ساربان

نہ سائیس ہیں نہ طویلہ نہ خیل
نہیں ساتھہ میرے نتھالوں کے بیل

نہ رتھیں رہیں پردہ زرکاریاں
رہیں نہ سواری کی انباریاں

نہ کوئی چھکڑہ ہے لے چلے رخت کوں
کہاں ریں گئے چھوڑ کر تخت کوں

نہ خود اب رہے نا جھلم بکتریں
نہ گھوڑے رہے ناسری پاکھریں

رہیں نا بندوقیں مری خاصگی
نہ بارود شیشہ و نا جامگی

نہ چلہ کمانوں میں ناسے سریں
نہ ترکش میں پیکاں نہ ثابت سریں

سپر ہے نہ شمشیر جمدھر کوئی
نہ بلم نہ نیزہ نہ خنجر کوئی

ببرچی نہ پاس نا کوئی آبدار
رونہ نہ کرئی نہیں کمش دار

نہ طرہ نہ کلغی نہ چیرہ دستار
نہ جامہ دوپٹہ نہ پٹکہ ازار

نہ آمد کہن کی نہ گنجینہ پر
رہے نہ مرے ساتھہ صندوق زر

ایسے طالع میرے پھنسے پابگل
ہوئے سنگ سوں سنگ بہی سنگدل

جواہر گئے اپنی پھر کہاں کوں
چلے موتی دریائے عمّان کوں
تجمل نہ کچھ اور نہ کچھ فوجہا
مگر تنہا ہم او دوسہ فوجہا
رہا نہ مرے ساتھ کچھ ساز سوں
بہ دو گوش و بینی کہاں جا سکوں
اگین ناچنے تیغیں چوری جب انی
کریں کیا وہاں جا ہم دستک زنی
بڑے شہر میں اپنے نیک نام سوں
کریں کیچ اب کس سر انجام سوں
سبہ مغلئی سوں گئی لوٹ کہ گیروں
چھتر تخت کیا لے میں سر پر دھروں
کیا خوب تحقیق ہم مردماں
مگس ہیں یہ دولت کے سب بیگماں
جو دولت گئی اب مرے ساتھ سوں
گئے اڑ وہ یکسر سبھی ساتھ سوں
اگر مرضی ہے تیری اب خواہ مخواہ
پڑوں باھر اب چھوڑ آرام گاہ
ہوں بیمار میں اور بہت درد مند
یک چوپالہ لیا باکہاران چند
نفع کچھ نہ لیکن مرے ساتھ سوں
بچوگے نہ تم لوگوں کے ہاتھ سوں

خلق دیکھ میری بلند افسری
کریں گے بہت ریش خندی تری
کریں گے سب آپس میں یہ قیل قال
وزیر نے کیا بادشاہ کا یہ حال

مندرجہ بالا مرثیہ سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں - اول یہ کہ بادشاہ مجبور محض تھے اور نام کو اُنکی حکومت باقی رہ گئی تھی - دوسرے یہ کہ باوجود اس قدر مجبوری کے خاندان تیموریہ کا اتنا وقار ہندوستانیوں کے دل میں تھا کہ تخت دھلی پر نہ تو کسی مسلمان نے بیٹھنے کی جرأت کی اور نہ مرھٹوں، جاٹوں یا سکھوں نے بادشاہ کو اپنا بادشاہ نہ سمجھا ہو، حتیٰ کہ بنگال میں بھی دیوانی کے اختیارات کا پروانہ اسی مغلیہ خاندان کے مجبور بادشاہ کی طرف سے انگریز کمپنی نے حاصل کیا تھا - اسی طرح جھنکو راؤ نے پنجاب کی دیوانی کا پروانہ حاصل کیا - اور اسی طرح اس سے پہلے احمد شاہ ابدالی نے لاھور و ملتان کی دیوانی حاصل کی تھی -

غرضکہ بادشاہ نے لڑنے سے انکار کردیا اور غازی الدین خاں کو اختیار دیا کہ مرھٹوں کو ساتھ لیکے احمد شاہ سے جنگ کرو - غازی الدین خان نے جو کچھہ فوج تھی اُسے دو ماہ بانٹنے کا حکم دیا اسلئے کہ اکثر یہ ہوتا تھا کہ مہینوں تنخواہ نہیں ملتی تھی اور سب درگاہوں پر جاکے دعا مانگی -

دھلی سے شاہ درے آئے - وہاں سے فرخ نگر آکر ڈیرہ کیا - نجیب خان نے شجاع الدولہ سے مدد مانگی - شجاع الدولہ نے جواب دیا -

اگرچہ مرہٹہ قدیم ہے رفیق
لیکن بھیجتا ہوں صلح کے طریق
نہو اب ذرہ ایک کچھ آزردہ دل
کمر باندہ جنگ پر رہو مستقل

اور سکر تال کی طرف معہ فوج کے روانہ ہوگیا - نجیب الدولہ نے آکر بہت خوشامد کی اور نذر پیش کی - شجاع الدولہ نے جھنکو راؤ سے کہلا بھیجا کہ شاہ درانی کے آنے کی خبر ہے تم اُدھر جاؤ - یہاں میں انتظام کرتا ہوں - جھنکو نے مان لیا اور لاہور کی طرف روانہ ہوگیا -

وقائع سیوم " متوجہ شدن ظل سبحانی خلیفۃ الرحمانی احمد شاہ درانی بطرف ہندوستان " -

اس وقائع میں احمد شاہ درانی کی روانگی کا حال ہے - جب دریائے اٹک پار اتر آئے تو مرہٹوں سے مقابلہ ہوا - تھوڑی سے لڑائی کے بعد مرہٹوں نے شکست کھائی اور لاہور کی راہ لی - پھر پٹیالہ کی طرف بھاگے - ابدالیوں نے دریا عبور کرنے کے بعد شہر چنترال میں قیام کیا - جب بادشاہ دہلی کو خبر ہوئی تو وہ بہت خوش ہوا کہ اب غازی الدین خان کے پنجہ سے نجات ملیگی -

سنا جب خبر دل بہت خوش کیا
کلاہ فخر کوں ہوا پر دیا

اور غازی الدین خان نے سنا تو :—

خبر سن بہت پر خروش ہو گئے
کیا سر نگوں اوخموش ہو گئے

وقائع چهارم - "شنیدن وزیر (عمادالملک غازی الدین خان) آمدن شاہ درانی و مصلحت کردن با مصاحبان خود و کشتن بادشاہ عالمگیر ثانی را" -

وزیر نے پھر بادشاہ سے کہا کہ احمد شاہ آگیا ہے - اب چلئے پہلے روہیلوں کا قلع قمع کریں - پھر مرہٹوں کو ساتھ لیکے درانیوں کو ہندوستان آنے کا مزا چکھائیں - لیکن باد شاہ نے یہ کہ کے ٹالدیا کہ :—

مری بات تحقیق جانو تمہیں
شہنشہ سوں لڑنے کی طاقت نہیں
کیا مفلسیں بہت خاطر پریش
نہیں ہاتھ میرے بجز موئے خویش
اکیلا کوئی فوج کو موڑنا
کہیں یک چنا بھاڑ کوں پھوڑنا

وزیر نے یہ بات سنی تو اپنے مصاحبوں سے مشورہ کیا کہ بادشاہ کو قتل کردیا جائے - بادشاہ سے آکے کہا کہ دو فقیر خراسان سے آئے ہیں اُن سے چل کے دعا کرائیے کہ ہندوستان سے درانیوں کی بلا ٹلے - بادشاہ فوراً تیار ہو گیا - قضا سر پر کھیل رہی تھی - نہا دھو وضو کرکے اور تخت پر سوار ہو کے کوٹلہ پہانچے - فقیروں نے استقبال کیا - اور خنجروں سے مار کر فصیل کے نیچے گرادیا - جب شہر میں ہنگامہ مچا تو نبیرہ جہاندار کام بخش بن اورنگ زیب کو شاہجہان ثانی کا لقب دیکر بٹھا دیا - اور مسجد میں دوگانہ پڑھوا کے قلعہ میں داخل کر دیا - شہر میں ہلڑ مچا کہ ابدالی آرہے ہیں - لوگ جوق جوق بھاگنے لگے -

سنا غلغلہ شہر کے درمیان
چلیں گردسوں بار بر داریاں

خبر ہوگئی سارے کوچہ گلی
سب اسباب لے عمدہ بیگم چلی
شہر چھوڑ کے لوگ باہر چلا
سو بہتا جدھر تھا سو تیدھر چلا
غریبیں بچارے چلے درمیاں
قبائل آئے سر اُپر گٹھریاں
لگے لوٹ نے راہ میں رہزناں
گویا مردا اوپر زغن کرگساں

وقائع پنجم شلیدن راؤ جینکو آمد آمد شاہ درانی و متابل شدن میدان قرنال در شاہجہان آباد و شکست خوردن جھنکو و غیازالدین خان (غازی الدین خان) و غارت شدن شاھجہان آباد -

غازی الدین دھلی سے روانہ ھوکر سکرتال پر آیا اور راؤ جینکو نے اُس کی پیشوائی کی - اودھر سے ابدالیوں کی فوج بھی آگئی تھی پہلے حملہ مرھٹوں نے کیا - احمد شاہ نے جنرل شاہ ولی خان سے ساز و سامان لیکر آگے چلنے کو کہا - لڑائی ھوئی اور دکھنیوں کو شکست ھوئی ' تو غازی الدین خان کے مشورہ سے دھلی کی طرف روانہ ھوئے روھیلوں کو جب احمد شاہ کے آنے کی خبر معلوم ھوئی تو نجیب خاں نے اُن کا بصد خوشی استقبال کیا - اور روھیلہ سرداروں نے نذرین گزرانین - پھر دتا جی نے بہت دلیری سے ابدالیوں کا مقابلہ کیا اور میدان میں مارا گیا - فوج نے آکر دھلی میں پناہ لی - رات کو یہ خبر مشہور ھوئی کہ مغل متہائی کا پل لوٹ رہے ھیں - سیدی بلال نے یہ حال دیکھ کے لاھوری دروازہ بند کردیا - لیکن یہ مغل نہ تھے -

ابدالی تھے - ہندوستانیوں کے تعاقب میں دہلی تک چلے آئے تھے اور شہر میں گھس پڑے تھے - قتل عام شروع کردیا -

نہ چھوڑے زن و مرد برناؤ پیر
سبھی ہوتے تھے طعمۂ تیغ و تیر
جو اوتا نظر میں سووے قتل کر
نہ کرتے ذرا رحم بھی طفل پر
زنوں کو پکڑ وہ لیجاتے کشاں
نہ دہشت خدا کی نہ شرم کساں

غرضکہ خوب لوٹ مار ہوئی - شاہ نے باہر خیمہ نصب کیا - اتنے میں یہ خبر پہنچی ' کہ جھنکو اور ملہار راؤ نے آپس میں اتحاد کرکے نار نول پر ڈیرہ ڈالا ہے - پھر وہاں سے شکست کیا کر بھاگا - اس کے بعد جاٹوں کے قلعہ کو شکشت دی گئی اور کول (علی گڈہ) کا قلعہ دوندے خاں نے فتح کر لیا - مگر اس قلعہ کو عجب ترکیب سے فتح کیا - غباروں میں بارود کے گولے رکھ کے اُڑایا - جو قلعہ میں جاکے گرے اور جب اُسے دیکھنے کو سپاہی جمع ہوئے تو بارود میں آگ لگی اور وہ گولے پھٹنے لگے اس طرح غباروں سے قلعہ میں آگ لگا دی - آخرکار ساکنان قلعہ نے امان طلب کی اور قلعہ خالی کردیا -

وقائع ششم ''رسیدن ہرکارہ دردکہن خبر رسانیدن نانہا جیو از ہزیمت جھنکو و غیاز الدین خاں و روانہ شدن بھاؤ جی ویسواس راؤ بمقابلہ شاہ درانی '' -

پیشوا نے جب سنا کہ جھنکو کو شکست ہوئی اور وزیر نے بادشاہ کو قتل کیا تو وہ کس درد و رنج سے کہتا ہے کہ -

سنا آج ہندوستان کی سر گذشت

جھلکو غازدین خاں نے کھائی شکست

دیکھو غازدین خاں کی عقل تباہ

مارا شاہ اپنا نپٹ بیگناہ

اس اندیشہ سوں ہوتا ہوں ناتواں

کریں گے مجھے طعن پیر و جواں

غریبوں کی جاگہ نہ چھوڑا کہیں

زبردست سوں کچھہ بس آتی نہیں

غرضکہ پیشوا کا بھائی بھاؤ بافوج گران معہ فرزند پیشوا وسواس راؤ روانہ ہوا - غازی الدین نے شاہجہاں ثانی کو قید کر دیا - اور عالی گہر کو تخت پر بٹھایا - مرہٹوں نے کنجپورہ پہنچ کر قطب شاہ صمد خان کو ابراھیم خان گاردی کے توپ خانہ سے معہ فوج کے شہید کردیا - اور ایک سردار مسمی نجابت خاں کو زندہ گرفتار کر لیا - احمد شاہ ابدالی نے یہ خبر سنی تو بہت افسوس کیا ' اور دریائے جمنا کو فوراً معہ فوج عبور کیا - اس خبر کو سن کر بھاؤ ' وسواس رائے اور ابراھیم خان گاردی نے مشورہ کی مجلس منعقد کی اور بھاؤ کی رائے سے یہ طے پایا کہ فوج کو ایک بڑا لشکر بنا کے گھیر دیا جائے ' اور اُس کے اندر سے توپ خانہ کی مار کی جائے - یہ لشکر شہر پانی پت اور گرھانہ کے درمیان بنایا گیا - گویا ایک قلعہ بنا لیا - کئی روز تک دونوں طرف سے گولہ باری رہی - اور رسد رساں دستوں میں آپس میں لوٹ مار ہوتی رہی -

وقائع ششم "برآمدن مرہٹہ از لشکر و جنگ کردن شاہ درانی و کشتہ شدن بھاؤ وبسواس راؤ و فتح یافتن شاہ درانی" -

چونکہ مرہٹہ لشکر کے اندر محصور ہوگئے تھے - نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ روز میں رسد آنی بند ہوگئی اور جو کچھ باقی تھا وہ بھی سب کھا پی گئے گھوڑوں اور آدمیوں کے مرنے سے بیماری پھیلی - فاقہ سے سب تنگ آگئے - آخرکار مجبوراً مرہٹوں کی یہ حالت ہوگئی کہ :-

دیکھیں خواب میں لقمہ دیتا کوئی

جو جاگے تو ہے مشت خالی ہوئی

سمجھ خواب کوں تب بہت روتے

اُس حسرت ستیں جان کو کھوتے

ہوئے کیتے بے آب و دانہ فنا

تڑپتے پڑے جو رہے ما لقا

کہا لوگوں نے بھاز بھائی ستیں

نہیں طاقت اب بینوائی ستیں

اگر مرنا ہے تو نکل کے مرو

نہیں کوچ کر شہر دہلی چلو

مرہٹے لشکر سے باہر نکل آئے اور ابراہیم خاں گاردی کے توپ خانہ نے آفت بپا کردی -

کہا شاہ نیں تب بمبردان دیں

بعربی زبان اُقتل المشرکین

رزم بہت خوب لکھی ہے - اور واقعتاً یہ معرکہ ایسا ہی تھا کہ زبانِ قلم سے اس کا بیان بہت مشکل ہے - بخوف طوالت فی الحال اسے نظر انداز کیا جاتا ہے - لڑائی بہت سخت ہوئی دو لاکھ آدمی مارے گئے - حتیٰ کہ -

فلک نے کہا بس کر اے شاہ دیں
برابر مرے مت کرے اب زمین

ابراھیم خان گاردی گرفتار ھوا تو :—

کہا شاہ نے تب کہ اے بوالفضول
نمانا ترس کچھہ خدا و رسول
قتل کیوں کیا کنجپورہ آن کر
ایسا کوئی کرتا مسلماں پر
کفر سوں تعجب نہیں سرکشی
نہ تھی تجھکوں لازم برادر کشی

مرہٹوں کو کامل شکست ہوئی - اور احمد شاہ ابدالی سجدۂ شکر بجا لایا - اس کے بعد مزار ولی الہند حضرت بو علی شاہ قلندر کے اندر جاکے دیکھا تو معلوم ہوا کہ جو لوگ یہاں آکے چھپے تھے اُن کے سر کسی ڈیبی تلوار نے کاٹ ڈالے تھے - احمد شاہ نے خود کھڑے ہوکر درگاہ کو دھلوایا اور فاتحہ پڑھا - اور پھر ملک کا انتظام کرکے واپس ولایت چلا گیا -

---

یہ ہے خلاصہ اس رزمنامہ کا جس میں مختلف اس قسم کے واقعات ملتے ہیں جو موجودہ انگریزی تواریخ سے بالکل مختلف ہیں - اس کے علاوہ اس جنگ میں متعدد مقامات پر ایسے واقعات پیش آئے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اٹھارویں صدی تک ہندو مسلمان محض مذہب کے نام پر ایک دوسرے کے دشمن نہ تھے - اور گو مرہٹوں میں احساس قومیت پیدا ہوگیا تھا لیکن وہ بھی دھلی کے تاجدار کو قابل عزت ہی نہیں بلکہ ہندوستان کا جائز فرمانروا سمجھتی تھی -

ثنا کی شاعری

یاد رکھنا چاهئے ' که جس زمانے میں ثنا نے یه رزمنامه لکھا هے وہ ریختہ کا ابتدائی زمانه تھا اور بعد میں جتنے شعرا گزرے اُنھوں نے ایرانی شاعری کی صوری و معنوی تقلید کی - جس کا لازمی نتیجه یه هوا که شاعری فطری نه رهی - تقلید کی کورانه بے راهه روی میں پڑکر گُل و بلبل نرگس و سنبل اور آب رکنا باد و گُلگشت مصلے هی یاد رہ گئے - نه هندوستان میں کوئل دکھائی دی ' نه آموں کی بہار نه کنول دکھائی دئے نه گنگ و جمن کی وادیاں - لیلا اور شیریں تو سب کو یاد رهے - مگر وہ دیویاں جنھوں نے ساوتری اور سیتا کا جامهٔ هستی پہن کر خراب آباد هند کو منور کردیا تھا اُن کی طرف سوائے حزین کے کسی کا ذهن منتقل نہوا شاعر کہتا هے اور بہت خوب کہتا هے که :—

در محبت چون زنِ هندی کسے مردانه نیست

سوختن بر شمع مرده کارِ هر پروانه نیست

لیکن ثنا کی شاعری میں آپ یه دیکھیں گے که فارسیت کا اثر غالب هونے کے باوجود اُنھوں نے خالص هندوستان کی چیزوں سے فطری شاعر کی طرح اثر پذیري کی هے - ملاحظه فرمائے -

قصبه کراری کی تعریف میں کہتے هیں :—

او دیوان عالم کا هے انتخاب

بڑا نورتن میں زمرد خوش آب

ہے سر سبز او تازہ از آدانت
بسر ما و گرما ہمیشہ بسنت
ہے گلزار بستی و ہم مرغزار
گویا حوض کو تر بھرے چشم سار
کھڑے گرد اشجار طوبی سرشت
دیا حق نیں (نے) پر کالۂ از بہشت
دے جاتی طرح اوس زمین سوں خزاں
کبوتر جیوں کعبۂ دو جہاں

(یعنی وہاں خزاں نہیں آتی جس طرح کعبہ میں کبوتر نہیں جاتے)

راو جیلکو نے پنجاب فتح کرلیا ہے - اس کی خوشی میں جشن ہو رہا ہے - یہاں جو حالت دکھائی ہے وہ کتنی فطری اور پر کیف ہے - فردوسی نے بھی جو شاعری کی ہے اسمیں اہل نظر صرف دو چیزوں کو دیکھتے ہیں ایک رزم دوسرے بزم - ثنا کی بزم ملاحظہ فرمائے - (خط کشیدہ الفاظ ہندوستانی تشبیہ و استعارہ کو ظاہر کرتے ہیں) -

کی خاطر جمع ملک کے کام سوں
بتّھے جشن میں بہت آرام سوں
کہا میرے خاصے مصاحب بلا
او جامے کا شیشہ و ساغر لیا
بلا اب جوتیں مطرب دکھنی
الاپیں بدا سازہا راگنی
میں مختار ہوں اب ہندستان پر
جیونکہ باغبان ہے گلستان پر

تب ساقی لے آیا دو آتش شراب

کہ تھی بہت خوشبو و ہم رنگ آب

(ملاحظہ فرمائے ہندی شراب پانی کی طرح تھی - شراب ارغوانی نہ تھی) -

مغنی چلے سازھا لیکے سنگ

تنبورے و قانون او بین چنگ

کوئی لے کمانچہ رباب ارغنوں

کوئی دھمد عمیں - ڈھولکیں - جھن جھنو

کوئی دف - دوتارہ کوئی جلترنگ

کوئی تال مردنگ مہور مورچنگ

ہوا راستہ سب چلیں کنچنی

چھوڑیں مکھ اوپر زلف کی ناگنی

(ملاحظہ فرمائے کنچنیاں جارہی ہیں - ساقی بچے نہیں ہیں اور منہ پر زلف کا مار نہیں ہے ناگنی ہے - جسکے کاٹے کی لہر نہیں) -

گوندہ او شانہ کر خوب موئے سیاہ

لیا شب نے گویا سورج کی پناہ

رکیا فرق نازک بسر با شکوہ

ندی بہ چلی درمیان دو کوہ

پہن سر او پر مور اور مورنی

چمکتا زمرد و ہیرا جڑی

پہن بالیاں اور ٹیکا سجا

کرنپول بھی خوب موتی تھا

ایسا زیب رخ گوشوارہ ہوا

گویا متصل ماہ تارا ہوا

باندھا جب گلوبند او چھبکلی

کلی زر کی گویا بنی سر کھلی

پہنا بدھیاں سب جڑاؤ گہر

پہنا گنج خوبی اوپر مار زر

(ہندوستان میں مشہور ہے کہ خزانہ کے اوپر ناگ دیوتا بیٹھ جاتے ہیں اور حفاظت کیا کرتے ہیں) ۔

سجا بازو بند اور جہانگیریاں

او پاؤں میں پازیب چوراسیاں

لیا پہن انگلیوں میں انگشتری

ملی پنجۂ ماہ سے مشتری

لگایا پشانی میں غازہ شتاب

نمودار تھا قوس پر آفتاب

کھنچا آنکھوں میں سرمہ دنبالہ دار

کنول میں چھپے بچگاں سیاہ مار

ملا رخ پہ گلگلونہ کوں بید رنگ

عرق آگیا گل کتیں دیکھ رنگ

رکھا خال مشکین زنخدان پر

سیہ زاغ بیٹھا گلستان پر

(ہندوستان میں کالی بکری - کالا کوا - کالے تل صدقے میں دئیے جاتے ہیں اور خال مشکین بھی حسن کو دو بالا کرنے کے علاوہ

نظر بد سے بچانے کے کام آتا ھے - اس لئے سیہ زاغ سے تشبیہ دی گئی ھے) -

دیا لب و دنداں کوں اک پان سوں
لیا آب یاقوت مر جان سوں
کیا سرخ ھاتھوں کو مہلدی رچا
شفق نے لیا دیکھ کر ملہ چھپا
ازاریں پہن پاؤں میں خنجری
اوپر سر بسر سب لباس زری
پہن زرو زیور جھمک کر چلی
گویا رات کوں شعلۂ آتشین
کیا زیب مجلس کی نزدیک شب
ھوا تھات عشرت کا موجود سب
رکھا پھلے آگے گزک او نقل
اوتھا ساقی لے ساغر و شیشہ مل
کیا پر بہت مے ستیں جام کوں
پلاؤ نے لگا بادہ خود کام کوں
کیا ساقی نے جب پیالہ رواں
ھوئے مست مجلس کے پھرو جواں
کہا مطربوں سوں کہ کھیلچو صدا
زباں پر لیاؤ تو آئوں ادا
لیا مطربوں نے سمجھ راز کوں
تیار کر بجانے لگے ساز کوں

الاپ کر کے آھنگھا تان کی
کھنچا راگنی شیام کلیان کی

جو دیکھا محو ھوگئی انجمن
لگی بول نے کا تھوڑا او یمن

یمن میں لگی بول نے ھولیاں
بتاؤنے لگیں بھاؤ سب لولیاں

تھرک کے اوتھیں او لگیں ناچنے
لگے گت ستیں گھونگرو باجنے

ھوا رقص میں دور دامن رواں
جہاز حسن کا ذہل گیا بادباں

معلق زنان چرخ - یکبائے سوں
جیوں پھرتی ہے گرداب دریائے سوں

موافق بجیں ساز او دستکیں
اوتھا ھاتھہ کر تیں او را وکتئیں

کبھیں ناز سوں رخ اوپر اوڑھنی
سرج پر دمکتی گویا دامنی

اوتھائیں تھیں جب ھاتھہ کو انگ انگ
لگا دور دل کھیلنے جیوں پتنگ

کہا راگنی سب محبت اساس
لگا سور تھا بوقت بھبھاس

ھوئی مستی جھنکوکوں مے تان کی
بٹھے گویا شادی پہ ملتانی کی

اک دولت سے نہیں مست متوالہ تھا
دوبالا نشہ رقص او پیالہ تھا

هندو مسلم تعلقات

مندرجۂ بالا بزم کے نمونے کے علاوہ اور بھی بزم کے نمونے ہیں اور رزم بھی کافی پر زور ہے - معاشرت کے متعلق بھی بہت سی باتوں کا اس رزمنامے سے پتہ چلتا ہے - مثلاً اُس زمانے میں ہندوستان میں کیا رسمیں تھیں - ہندوستانیوں کا طرز زندگی کیا تھا - اور عورتوں کا اُس سوسائٹی میں کیا درجہ تھا - انگریزی کمپنی کا دہلی اور مضافات میں کیا اثر تھا - اور عام حالت تجارت و صنعت و حرفت کی کیا تھی - لیکن جس چیز پر اس رزمنامے سے مخصوص طور پر روشنی پڑتی ہے وہ یہ ہے - کہ اُس زمانے میں یہاں ہندو مسلم سوال نہیں تھا - اور احمد شاہ ابدالی کی لڑائی ہندوؤں سے نہ تھی بلکہ مرہٹہ قوم سے تھی - لیکن یاد رہے کہ مرہٹوں کے ساتھ خود عمادالملک غازی‌الدین خاں کی پوری امداد تھی - اور پنجاب سے آدینہ بیگ کی دعوت پر مرہٹوں نے حملہ کیا تھا - سندھیا کے علاوہ ابراہیم خاں گاردی ہی وہ سر دار تھا جس نے روہلہ پٹھانوں کے آٹھ ہزار سپاہیوں کو قتل کرنے کے بعد میدان سے منہ نہیں موڑا اور آخر کار ابدالیوں کے ہاتھوں گرفتار ہوکر قتل ہوا - یہ بھی واضح رہے کہ باوجودیکہ مرہٹوں کو پوری حکومت حاصل ہوگئی تھی اور اُنہوں نے دہلی کو بھی فتح کرلیا تھا لیکن تیموری نسل کے نام نہاد بادشاہ کو تخت سے نہیں اُتارا ' نہ موجودہ زمانہ کے پرو پاگنڈا کے لحاظ سے یہ مناسب سمجھا کہ اورنگ زیب کی اولاد سے انتقام لیا جائے -

حتیٰ کہ تاریخ شاہد ہے کہ جس غلام قادر نے شاہ عالم کی انکھیں نکالیں تو اُسکا سر کاٹ کے خود سندھیا نے بادشاہ کے قدموں میں ڈالا تھا حالانکہ سندھیا مرہٹہ تھا اور غلام قادر اور شاہ عالم دونوں مسلمان تھے - واقعہ یہ ہے کہ یہ جنگ ہندوؤں اور مسلمانوں کی نہ تھی بلکہ ہندوستانیوں اور افغانوں کی تھی - ہندوستانیوں کے لیڈر مرہٹے تھے لیکن ان کا عین وقت پر راجپوتوں اور جاٹوں نے ساتھ چھوڑ دیا - اور جنگ بھی اس غرض سے نہیں تھی کہ دہلی کا تخت لیا جائے - بلکہ افغان لوٹ مار کے اپنے ملک کو واپس چلے گئے اور ہندوستان میں پھر وہی نام نہاد اور کمزور سلطنت تیموریہ باقی رہ گئی - ہندو - مسلمان - مرہٹے - جاٹ غرضکہ جملہ اقوام ہند بادشاہ دہلی کو اپنا جائز بادشاہ سمجھتی تھیں - اور حقیقت تو یہ ہے کہ اُس وقت کی آپس کی لڑائی بھڑائی سے ملک کی تجارت صنعت و حرفت کو فائدہ ہی پہنچتا تھا - ہاں بیرونی ممالک کے باشندے جو دولت لوٹ مار یا تجارت کے ذریعہ سے لیجاتے تھے اُسے آپ ہندوستان کا فائدہ سمجھئے یا نقصان یہ آپ کی سمجھ پر منحصر ہے -

بہر حال ثنا نے جن اشعار میں ہندو مسلم مسئلہ کی تشریح کی ہے وہ درج ذیل ہیں -

عنوان ہے " مناجات کردن بدرگاہ باری تعالیٰ جل شانہ بشفاعت ائمہ معصومین " اس میں ائمہ کے واسطے سے اس طرح دعا مانگی گئی ہے :—

ز طفلی تری حب ہے بیچ جان

نجانا ترے بن کوئی ایزدان

الٰہا پیچھا تیرا میں اے دستگیر
گرم مت کرے مجھ پہ آتش سعیر
او بر لہاے میری تو یک آرزو
کہ اس میں ترستا خلق مو بمو
مسلط کر اولاد تیموریہ
دے آرائش این عالم صوریہ
ہوا ہے حدیقہ جہاں خار خار
کرم سوں لیا ایک نو آئین بہار
پھولے لہلہا ہند کی سبز باغ
ہوں افسردگاں لب معطر دماغ

رزمنامے کے آخری اشعار ہیں :—

ہوئے شاہ ہندوستاں سوں بدا
چلے پھر طبل باز گشتی بجا
خدایا فضل کر ہندستان پر
جہاں لگ ہنود و مسلمان پر

غرضکہ دعا یہی ہے کہ اولاد تیموریہ تخت پر رہے اور ہندو اور مسلمان پر خدا اپنا فضل کرے - کتنا اچھا زمانہ تھا - نہ ہندو مسلمان ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے - نہ یہاں کے تمدن و معاشرت پر لڑائیوں کا کچھ اثر ہوتا تھا ہندوستان کی زندگی تھی جو اپنے پر سکون فلسفۂ ہمہ اوست میں مگن تھی - اسے یہ بھی خبر نہ تھی کہ فرنگی آیا یا افغان گیا حتی کہ اب تک دیہاتوں میں باوجود تغیر زمانہ اور انقلاب عظیم کے آپ دیکھیں گے کہ کسان اپنی وہی پرانی زندگی بسر کر رہا ہے - اور اس کے لئے سوائے اپنی روزی کمانے اور قسمت پر شاکر

رہنے کے اور کوئی مشغلہ نہیں ہے - ضرورت ہے کہ فلسفۂ ویدانت اور فلسفہ عمر خیام کا مقابلہ کیا جائے - اس لئے کہ خیام شاید نئے الفاظ میں وہی بات اس طرح کہتا ہے :--

در یاب که از روح جدا خواهی رفت

در پردۂ اسرار خدا خواهی رفت

مے خور که ندانی ز کجا آمدۂ

خوش باش ندانی کی کجا خواهی رفت

(اکتوبر ۱۹۳۴ء)

محمد تقی احمد

تاریخ اودھ

اٹھارویں صدی کے شروع میں مغلوں کی سلطنت کے زوال کے بعد صوبۂ اودھ میں ایک ریاست کی بنیاد پڑی جو مشرقی تمدن اور دور وسطی کی تہذیب کا آخری نمونہ تھی- باوجود اِس کے کہ قریب ڈیڑھ سو برس تک یہ ریاست قائم رہی اور اِس کی علمی اور ادبی خدمتیں نہایت قابل وقعت ہیں - مگر اِس وقت تک اِس کی تاریخ مدوّن نہیں کی گئی - اِس کا ذمہ‌دار کون ہے ؟ ہمارے صوبے میں علمی اور ادبی اداروں کی کمی اور اُن کی غفلت، ضرور اِس کمی کی ذمہ‌دار کہی جاسکتی ہے، مگر صرف اتنا ہی نہیں - انگریزی حکومت نے بھی اِس طرف توجہ نہیں کی ہے - جس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ انگریزوں کے اودھ کے ساتھ تعلقات کی تاریخ بہت ہی تاریک ہے ' خود انگریزوں کی لکھی ہوئی تاریخیں، مثلاً جیمس مل (James Mill) کی تاریخ، میجر برڈ کا Dacoity in Excelsis ہنری لارنس کے اودھ کے متعلق مضامین اور اُن

یورپین سیاحوں کے مشاہدات، جو وقتاً فوقتاً ہندوستان کے مختلف حصوں میں اٹھارویں اور انیسویں صدی میں دورہ کرتے رہے، مثلاً Bishop Heber اور Mundey اِس کا پورا ثبوت دیتے ہیں، کہ سلطنت کی تباہی اور حکومت کی خرابیوں کی بیش تر ذمہ‌داری، انگریزوں کی غلط پالیسی پر تھی - نمونے کے طور پر چند اقتباسات اُن تاریخوں سے پیش کیے جاتے ہیں - ہنری لارنس جو کمپنی کی حکومت کے بہت مشہور رکن گذرے ہیں اور جنھوں نے پنجاب اور اودھ میں نہائت اہم ملکی اور سیاسی خدمات انجام دیں، یہ رائے ظاہر کرتے ہیں کہ ہندوستان میں کسی ریاست میں انگریزوں نے اِس قدر تواتر کے ساتھ مداخلت نہیں کی، جس قدر کہ اودھ میں، اور یہ مداخلت مطلقاً بیکار تھی - اِسی ضمن میں وہ نہائت موثر الفاظ میں اِس مداخلت کے تباہ‌کن اثرات کو "جھلسانے والی مداخلت" (The blighting influence of interference) سے تعبیر کرتے ہیں -

سر جان شور، سنہ ۱۷۸۳ع میں لکھنؤ ریزیڈنٹ کی جگہ تخفیف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے یہ عہدہ دار، دیسی ریاستوں میں اِس لیے رکھا جاتا ہے کہ بد انتظامی اور فساد کو ترقی دے، تاکہ اِس طور پر کمپنی کو اُن ریاستوں کے ضبط کرنے کا اچھا موقع مل سکے -

(There is even ground for the supposition that the measure has been adopted for the express purpose of promoting misgovernment and confusion.........for affording plausible excuses for our taking possession of them.)

غالباً اِن چیزوں کو چھپانے کے لیے اودھ کی تاریخ کی طرف توجہ نہیں کی گئی - نہ تو ہمارے اسکولوں میں اودھ کی تاریخ نصاب میں داخل ہے - اور نہ کالج اور یونیورسٹیوں میں - تمام تہذیب یافتہ ملکوں میں لوکل

ہسٹری (local history) پہلی چیز ہوتی ہے - جس سے واقفیت ضروری سمجھی جاتی ہے، مگر ہمارے صوبے کے سر رشتۂ تعلیم کی پالیسی اِس معاملے میں جداگانہ ہے اور اُس کے نصاب تعلیم میں لوکل ہسٹری کا کہیں نام بھی نہیں - کالج اور یونیورسٹیوں میں اِس وقت تک یورپ کی تاریخ پر اتنا ہی زور دیا جا رہا ہے جتنا کہ شروع میں یورپین یونیورسٹیوں کے تعلیم یافتہ اور ہندوستانی تاریخ سے نابلد انگریز پروفیسروں کے زمانے میں، دیا جاتا تھا - اگر کوئی تبدیلی نصاب میں ہوئی بھی ہے تو وہ ہندوستانی پروفیسروں کی زبان فارسی اور اسلامی رواج اور معاشرت سے ناواقفیت کی بدولت ، محض برائے نام ہے - ایم اے کے درجوں میں اب بھی ایلیٹ کی تاریخ، حفظ کی جاتی ہے؛ جس کی وجہ یہ نہیں کہ ایلیٹ کے جمع کئے ہوئے تاریخی مخطوطات ، نایاب اور نادرالوجود ہیں ؛ بلکہ استاد اور شاگرد دونوں کی فارسی سے ناواقفیت کی بدولت، انگریزی ترجمے، تاریخی اوراد و وظائف بنے ہوئے ہیں- اگر تاریخ فرشتہ یا تاریخ فیروزشاہی جیسی روزمرہ کی آسان فارسی میں لکھی ہوئی اور آسانی سے دستیاب ہو جانے والی کتابوں سے مدد لینے کی ضرورت پڑتی ہے، تو بجائے اِس کے کہ اصل کی طرف توجہ کی جائے، انگریزی ترجمہ، (گو وہ بہت زیادہ قیمتی اور اسی قدر ناقابل اعتماد ہوتا ہے) کام میں لایا جاتا ہے -

چونکہ یہی دقت تاریخ اودھ میں بھی ہے کہ اُس پر کوئی مبسوط کتاب، انگریزی میں موجود نہیں ہے؛ لہذا کالج کے فارسی سے ناواقف اساتذہ اِس پر مجبور تھے کہ وہ اِس کو طاق نسیاں کے حوالے کر دیں - ورنہ مرہٹوں کی تاریخ کی طرح جو چلد سال کے اندر مدوّن کر دی گئی، سلطنت اودھ کی تاریخ بھی مدون ہو جاتی اور ہمارے یونیورسٹی کے پروفیسروں ہی میں سے سر جادو ناتھ اور سارد سائی، کی سی شہرت کے

لوگ پیدا ہو جاتے۔ تاریخ اودھ کی خدمت سب سے زیادہ لکھنؤ یونیورسٹی پر فرض تھی؛ میں خود بحیثیت طالب علم' یونیورسٹی کے افتتاحی جلسوں میں شریک تھا' جن میں پہلے وائس چانسلر ڈاکٹر چکرورتی آنجہانی نے اپنی تقریروں میں وعدہ کیا تھا کہ لکھنؤ یونیورسٹی' اودھ کے علم و ادب اور تاریخ کی تحقیق اور تدوین کا اہم کام' اپنے ذمے لے گی - اور اِس نئی یونیورسٹی کے قائم کرنے کا یہی مقصد بیان کیا گیا تھا کہ وہ اِس خدمت کو انجام دے گی - آج یونیورسٹی کو قائم ہوئے سترہ سال کے قریب ہوئے اور تاریخ اودھ کی خدمت' جس کا اس نے بیڑا اُٹھایا تھا' مطلق نہ ہو سکی - گزشتہ دسمبر میں لکھنؤ کی ایک علمی صحبت میں جو یونیورسٹی کے فاضل پروفیسر ڈاکٹر رادھا کملا مکر جی کے بنگلے پر تھی اور جس کی وجہ انعقاد' سرکار کی لکھنؤ میں تشریف آوری تھی' یونیورسٹی کے ایک نوجوان شعبۂ تاریخ کے لکچرر نے تاریخی تحقیقات کی دقتوں کو بیان کرتے ہوئے یہ کہا کہ لوگ مخطوطات کو چھپاتے ہیں اور اسی لیے تاریخ اودھ پر کوئی کام نہیں کیا جا سکتا - میں نے اُس وقت بھی فاضل لکچرر کی رائے سے اختلاف کیا تھا اور اب بھی کرتا ہوں۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ فارسی سے ناواقفیت اور مخطوطات حاصل کرنے کی وہمی دقتوں نے ہمارے پروفیسروں کو مخض ڈرا رکھا ہے - ورنہ تاریخی مخطوطات اِس کثرت سے اب بھی موجود ہیں' کہ اُن کا دستیاب ہو جانا قطعی ناممکن نہیں۔ اِس قدر ضرور دقت ہے کہ یہ نوادر بیشتر پرانے قصبات کے اجڑے ہوئے گھرانوں کے کرم خوردہ کتب خانوں' میں موجود ہیں - اور کسی قدر تلاش کی ضرورت ہے؛ قبل اِس کے کہ ان جگہوں کا پتا چل سکے -

یو پی ہسٹاریکل سوسائٹی کے سالانہ جلسے میں جو اوائل فروری میں لکھنؤ میں ہوا تھا' میں نے یہ چاہا تھا کہ اِس مسئلے کو پیش

استعداد بہت بلند پایہ نہ تھی - مصنف عمادالسعادت کا یہ لکھنا کہ "ایزد متعال او را از ازل مستعد بامارت و ایالت ساختہ و جبلتش را بحلیۂ حکومت و ریاست پیراستہ" بیجا نہیں ہے - برہان الملک کے چونکہ اولاد نرینہ نہ تھی' لہذا اُن کے داماد صفدر جنگ اُن کے بعد سنہ ۱۷۳۹ء میں اودھ کے صوبہ‌دار ہوئے - یہ بہت ہی ذی‌استعداد تھے اور اِن کے خطوط جو رضا عام لائبریری میں موجود ہیں' اِن کی علمی استعداد کے شاہد ہیں - امور ملکی سے اِن کو خاصی واقفیت پہلے ہی ہو چکی تھی اِس لیے کہ برہان‌الملک کے زمانے میں اِن کو بحیثیت نائب صوبہ‌دار اودھ' کافی تجربہ ہو چکا تھا' مگر صفدر جنگ کی فوجی قابلیت میں ضرور کلام ہے - کم از کم اتنا مسلم ہے کہ برہان‌الملک پر اُن کو ترجیح نہ تھی' مگر زمانہ ضرور زیادہ موافق تھا - صفدر جنگ نے برہان‌الملک سے زیادہ ترقی کی اور وزارت کے عہدے پر سرفراز ہوئے - یہی وجہ تھی کہ صوبہ‌داران اودھ' نواب وزیر کے لقب سے موسوم ہوئے - صفدرجنگ کا زمانہ نہائت پر آشوب تھا - نادر شاہ کے ساتھ ہی دھلی کی سلطنت کی تباہی کے آثار پورے طور پر نمایاں ہو چکے تھے - میر تقی میر جو اِن واقعات کے چشم دید شاہد تھے' اُس زمانے کی سیاسی تبدیلیوں اور انقلابات کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں' کہ :—

ہر روز اختیار جہاں پیش دیگریست
دولت مگر گدا ست کہ ہر روز بردریست

اِس دور کی شہر آشوبی اور تلاطم کا اندازہ عالم گیر ثانی اور اُس کے وزیر خانخانان کے قتل کے واقعے کے بیان سے جو میر صاحب کے الفاظ میں نقل کیا جاتا ہے' خوب ہو سکتا ہے :—

"یاران چون از بادشاہ دلجمعی نداشتند مشورت کردند ...... کہ

کروں تاکہ اودھ کی تاریخ کے متعلق کچھ ذخیرہ فراہم ہو سکے؛ اور وہ بیش قیمت ماخذ جو بے توجہی کی وجہ سے ضائع ہو رہے ہیں ' جمع کر لیے جائیں - مگر سال آئندہ کے بجٹ میں اِس کے لیے غالباً بچت نہ نکل سکی - میں نے یہ بھی چاہا تھا کہ میرے پاس جو مخطوطات یا مطبوعہ نسخے' تاریخ اودھ کے متعلق موجود ہیں' ہسٹاریکل سوسائٹی کی طرف سے شائع ہو جائیں- مگر یہ بھی ناممکن ثابت ہوا -

میں نے فاضل ناظرین کا بہت سا وقت' محض اِن دقتوں کے بیان کرنے میں صرف کر دیا - بہتر ہے کہ اب اِس طویل قصے کو مختصر کیا جائے اور اصل مضمون کے متعلق چند واقعات عرض کیے جائیں - اِس لیے کہ اودھ کی تاریخ کی outline بھی اِس مختصر مضمون میں بیان نہیں کی جا سکتی - لہذا محض چند واقعات کا بیان کر دینا بہتر ہے' تاکہ اِس ضمن میں اُن مخطوطات کا بھی تذکرہ ہو سکے جو اِدھر اُدھر میری نظر سے گذرے ہیں - اور تاریخ اودھ کی تدوین بہت کچھ اُن پر منحصر ہے -

یہ مشہور واقعہ ہے کہ سعادت خاں' برہان الملک جو سادات نیشاپور میں سے تھے' سنہ ۱۷۲۲ع میں اودھ کے صوبہ‌دار بناکر دھلی سے بھیجے گئے - سعادت خاں اپنے زمانے کے امراے دھلی میں سب سے زیادہ قابل تھے - اِس قابلیت کا صرف ایک ھی شخص اور تھا یعنی نظام‌الملک بانی سلطنت حیدرآباد - برہان‌الملک نے محض اپنی ذاتی قابلیت سے ترقی کی تھی - اُن کی تاریخ پیدائش اور بچپن کی زندگی کے بابت تاریخی واقعات کا پتا نہیں چلتا - عمادالسعادت میں صرف اِس قدر ہے کہ "از عہد رضاعت تا بسن کمال بہ مہد تعلیم و تربیت پرورش می‌داد"- برہان‌الملک کی فوجی قابلیت ضرور اعلیٰ درجے کی تھی؛ گو عملی

ادشاہ را از میان بردارند و انتظام الدولہ (وزیر) را نیز زندہ نگذارند ......
بعد از شام سوار کردہ بادشاہ را بردند چون در قلعچہ رسید بزخم کارد کار آن بیگناہ ساختند و مردہ او را پائین دیوار انداختند بعد' از شام آنجا برگشتہ در نماز رسن بہ گلوئے خانخانان افگندہ کشیدند و بسختی تمامش کشتہ' لاشۂ او را .... غرق دریا نمودند - مردہ بادشاہ تمام روز برسوائی تمام بر روے خاک افتادہ ماند''۔

ایسے پر آشوب زمانے میں صفدر جنگ کو طاقت بڑھانے کے بڑے موقعے تھے - دھلی اور اودھ دونوں اُن کی ترقی کے زینے بنے ہوئے تھے - اگر دھلی میں اُن کے مد مقابل اور حریف موجود تھے' تو اودھ میں اُس وقت مطلع صاف تھا اور خودمختار ریاست قائم کرنے کے بہترین مواقع موجود تھے - صفدر جنگ نے اپنے ہی زمانے میں اودھ کو بالکل خودمختار بنا لیا محض نام کا دھلی سے تعلق تھا -

اُن کے بعد اُن کے بیٹے شجاع‌الدولہ سنہ ۱۷۵۶ع میں نواب وزیر ہوئے' جن کو اودھ کا سب سے مشہور اور قابل ترین حکمران کہنا چاہیے - اُن کی ذاتی کمزوریاں کچھ بھی ہوں' مگر اُن کی رعایا پروری ' عدل ' ھردلعزیزی اور سیاسی قابلیت میں کوئی شک نہیں - مصنف سیرالمتاخرین' جو اُن کی' حافظ رحمت خاں کے ساتھ معاملت کی وجہ سے بہت خفا تھے' اتنا ماننے پر مجبور ہوئے کہ ''سرکار عمدہ داشت و صفات حمیدہ هم در ذات او مجتمع و خلق کثیرے از دولت او منتفع بود''۔ بکسر کی جنگ نے انگریزوں کا تعلق اودھ کے ساتھ قائم کر دیا - یہاں پر ماخذوں کے سلسلے میں ایک بات قابل ذکر ہے :— منشی فیض بخش کاکوروی جو خود اِس جنگ میں موجود تھے' اپنے چچا ابوالبرکات خاں بخشی کے ساتھ شجاع‌الدولہ کی فوج میں تھے' اُن کی ایک طویل مثنوی

ہے، جو خود مصنف کے ہاتھ کی لکھی ہوئی کتب خانۂ تکیۂ شریفیۂ کاظمیہ (قصبۂ کاکوری ضلع لکھنؤ) میں محفوظ ہے، اُس کے چند اشعار نقل کیے جاتے ہیں:—

ابوالبرکات خان چون از حدِ خویش برون زد خیمہ و شد سبقت اندیش
بسرحد عظیم آباد جا کرد سواد چھپرا را دولت سرا کرد
شد از بسیاری لشکر زمین تنگ تزلزل گشت در سرکار سارنگ
کہ ناگاہ رو برو شد فوج انگریز نمودند از دو جانب عزم خونریز

منشی فیض بخش کی دو اور تصنیفات اِسی کتب‌خانے میں محفوظ ہیں - ایک تو ''بیاض'' ہے، جس میں چند خطوط صاحب بیاض نے تبرکاً نقل کیے ہیں؛ یہ خطوط اُن کے معتقد الیہ شاہ محمد کاظم کاکوروی کے، منشی صاحب کے خطوط کے جواب میں ہیں - اِن خطوط سے بہت سے تاریخی واقعات کی صحیح تاریخوں کا پتا چلتا ہے، جو تاریخ اودھ سے متعلق ہیں؛ اس لیے کہ اِن خطوط میں اُن واقعات کا تذکرہ ہے - دوسری چیز ''چشمۂ فیض'' ہے - یہ ایک نسب‌نامہ ہے جس کا ایک حصہ مصنف نے تاریخ اودھ کے نذر کیا ہے اور اپنے چشم دید واقعات نہایت وضاحت سے بیان کیے ہیں- اِس کے چند اقتباسات یہاں بھی درج کیے جاتے ہیں -

(شجاع‌الدولہ اور حافظ رحمت خاں کی جنگ)

در عالم خواب بودیم کہ یک ناگاہ از طرف حریف آواز توپ آمد ...
... القصہ، تمام شب در بیداری گزشت ... . نقشۂ جنگ مفصل........
اینست کہ حافظ رحمت خان با تمامی فوج در جاے قلب کہ گرد آن جنگل بانس بود دیرہ داشت ...... نواب وزیر می خواستند کہ نوعے باید کہ ازان مکان بیرون آید ...... حافظ مضطربانہ از خیمہ بیرون آمد ......

همین که بر پشت زمین قائم شد گلولۂ توپ ......مانند ملک‌الموت رسیدہ ...... بعقب افتاد افتادن همان بود و پرواز روح از جسم همان -

(شجاع‌الدولہ کی وصیت)

نواب آصف‌الدولہ را یاد فرمودند ...... بابا سہ وصیت است ... یکے' آنکہ همشیرهاے خود را ...... بانجباے وطن ...... یا همسران اقلیم ... نکاح کرد فراغت خواهند گرفت - دوم' آنکہ برادران خود را خوار نکنند ...... و اگر از طرفین کشیدگی خاطر رو دهد......باقلیم بعیدہ بفرستند - ......سوم' آنکہ از صاحبان انگریز در هیچ وقت نوعے خلاف نخواهند کرد -

(آصف‌الدولہ کے نام بہو بیگم صاحبہ کا خط)

نوشتن جواب حوالۂ راقم شد ...... ترقیم یافت ...... در کدام کتاب دیدہ کہ فرزند صلبی با مادر خود ......بے صدور قصور شرعی و عرفی در عین ثروت و اقتدار پسر باین درجہ رسد ...... سلاطین و امرا براے قیام جاہ خود با پدران و برادران کشت و خون کردہ اند نہ با زنان ...... ''تو خود بگو کہ هرگاہ در قرآن شریف در حق ابوین ''ولا تقل لهما أفٍ'' واقع است روز باز پرس بجناب احدیت چہ جواب خواهی داد -

مصنف کی ایک مشہور کتاب ''تاریخ فرح‌بخش'' کا ترجمہ انگریزی میں سنہ (؟) ۱۸ء میں ہوا تھا - مترجم کتاب یعنی ڈاکٹر ہوئی (Dr. Hoey) کو یہ کتاب لکھنؤ میں ایک خونچے والے کے پاس مل گئی تھی' عام طور پر اِس کتاب کے نسخے دستیاب نہیں ہوتے! نہ یہ چھپ سکی' مگر انگریزی ترجمہ کو اب نادرالوجود ہے' صرف کتب‌خانوں میں ملتا ہے - آصف‌الدولہ کے زمانے کی یہ مفصل تاریخ کہی جا سکتی ہے- شجاع‌الدولہ کے انتقال (سنہ ۱۷۷۵ء) اور آصف‌الدولہ کی تخت‌نشینی سے اودھ کی تاریخ میں ایک نیا دور شروع ہوتا ہے - آصف‌الدولہ

اپنی والدہ ' بہو بیگم صاحبہ کی ناچاقی سے فیض آباد کا قیام ترک کر کے لکھنؤ آ جاتے ہیں اور یہی پایۂ تخت بن جاتا ہے - یہی وجہ اُس کے فروغ کی ہوئی ' ورنہ اِس سے قبل نہ تو وہ علمی اور ادبی مرکز تھا ' نہ کوئی بڑا شہر - آصف الدولہ کا لکھنؤ آنا اور دھلی کے شعرا اور دوسرے ماہرین فن کا اودھ کی طرف رخ کرنا ' ساتھ ھی دربار فیض آباد کے تمام عمائد کا لکھنؤ چلا آنا ' یہ واقعات' اودھ کی تاریخ میں نہائت درجہ اہم ہیں - در اصل اِسی زمانے سے نواب اودھ کی سیاسی اور ملکی دلچسپیاں کم ہو جاتی ہیں - بیرونی حکمت عملی انگریزوں کے ھاتھ میں آ جانے اور انگریزی فوج کے ملک میں قیام کرنے کے بعد' نوابان اودھ کے پاس بہترین مشاغل' فن تعمیر کا ذوق اور علمی و ادبی مذاق باقی رہ جاتے ہیں - شجاع الدولہ کے زمانے تک سلطنت کے حدود بڑھانا اور فوجی طاقت کا مستحکم کرنا دن رات کا مشغلہ تھا ' مگر آصف الدولہ کے زمانے سے یہ دلچسپیاں ختم ہو جاتی ہیں - شجاع الدولہ کی قائم کی ہوئی فوج رفتہ رفتہ کم ہو جاتی ہے اور انگریزی فوج بڑھتی جاتی ہے - بیرونی حملوں کا خوف کم ہو جاتا ہے - لہذا تعمیرات اور ادبی و شاعرانہ مشغلے باقی رہ جاتے ہیں' جو روز بروز ترقی کرتے جاتے ہیں - یہاں تک کہ اُن کی تکمیل سلطنت کے انتزاع یعنی واجد علی شاہ کے زمانے میں ہوتی ہے -

بحیثیت حکمران آصف الدولہ کے کچھ بھی کارنامے نہ سہی' مگر اُن کی ہر دلعزیزی اور سخاوت سے کون انکار کر سکتا ہے؛ لکھنؤ کے دکاندار اب تک اُن کا نام لیتے ہیں اور یہ مثل "جس کو دلوائے مولا اُس کو دے آصف الدولہ" اِس وقت تک زبان زد ہے - آصف الدولہ کا انتقال سنہ ۱۷۹۷ع میں ہوا - وزیر علی خاں کی چلد روزہ حکومت کے بعد

سعادت علی خاں نواب ہوئے - "از سعادت تا بہ سعادت" ایک مشہور مقولہ ہے، جو یہ ظاہر کرتا ہے کہ سعادت خاں برہان‌الملک سے لے کر سعادت علی خاں تک سلطنت اودھ سیاسی اور ملکی حیثیت سے عروج پر تھی - سعادت علی خاں کی بیدار مغزی میں کوئی کلام نہیں، باوجود ریزیڈنٹ کی مداخلت کے انہوں نے مالی معاملات میں بہت کچھ اصلاحیں کر دیں - اُن کا دستورالعمل جس کا ترجمہ خان بہادر مولوی سید ابو محمد صاحب ایم اے، ممبر پبلک سروس کمیشن نے "یو پی ہسٹاریکل جرنل" میں شائع کرایا تھا، شاہد ہے کہ اُن کی امور ریاست اور علی‌الخصوص ملکی‌اور مالی معاملات سے واقفیت، بہت ہی اعلیٰ درجے کی تھی - سعادت علی خاں کے انتقال کے بعد سنہ ۱۸۱۴ع میں اُن کے بھتیجے غازی‌الدین حیدر نواب ہوئے - اُن ہی کے زمانے میں بادشاہت کا اعلان کیا گیا اور سلطنت دہلی سے ظاہری تعلقات بھی قطع کیے گئے - یہ بادشاہت نام ہی کی تھی - اِس لیے کہ شاہ اودھ کو بیرونی حکمت عملی میں مطلق دخل نہ تھا - نہ صرف اِس قدر بلکہ اندرونی معاملات اور خانگی امور میں بھی، گورنر جنرل اور ریذیڈنٹ کے مشورے اور حکم کی ضرورت پڑتی تھی - مفتی خلیل الدین خاں کاکوروی کے، جو اُس زمانے میں شاہ اودھ کی طرف سے گورنر جنرل کے دربار میں سفیر تھے، خطوط، جو اُن کی بوسیدہ کوٹھی کے تہ خانے میں کچھ عرصہ ہوا دستیاب ہوئے ہیں، شاہ اودھ کے اختیارات کا پتا دیتے ہیں - اِن خطوط کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ غازی الدین حیدر کے بادشاہ کا خطاب اختیار کرتے ہی ایک لفظی بحث، شاہ اودھ اور گورنر جنرل کے درمیان چھڑ گئی - غازی الدین حیدر، شاہ جہاں کا اور اُن کی بیگمات، ممتاز محل اور نور جہاں کا خطاب، اختیار

کرنا چاہتے تھے، مگر گورنر جنرل نے اجازت نہیں دی - چنانچہ ایک خط میں حسب ذیل عبارت ہے :-

"و شاہ اودھ کہ ہرسہ بیگمات خود خطابہا دادہ اند در قبول آن اہالیان این سرکار را بسیار عذر است - چرا کہ این، خطابہاے بیگمات سلاطین دہلی است.............و در مقدمۂ لفظ شاہ جہان کہ شاہ اودھ را تبدیل آن گوارا نیست درین امر، نواب گورنر جنرل می فرمایند کہ جائے افسوس کہ شاہ اودھ را تبدیل این خطاب گوارا نیست و ازین جا بطرزے کہ اوشان می خواہند قبول نمی توان شد"

جب ایسی معمولی معمولی باتوں میں گورنر جنرل کے احکام کی ضرورت پڑتی تھی تو ظاہر ہے کہ اہم معاملات میں (اندرونی ہوں یا بیرونی) شاہ اودھ کو کیا اختیارات ہوں گے ؟

غازی الدین حیدر کے انتقال کے بعد سنہ ۱۸۲۷ع میں اُن کے بیٹے نصیرالدین حیدر بادشاہ ہوئے - سفیر اودھ کے خطوط، نیز اودھ پیپرس (Oudh Papers) سے یہ پتا چلتا ہے کہ اودھ کی سلطنت کے ضبط ہونے کا امکان، اِسی وقت پیدا ہو گیا تھا - نصیر الدین حیدر کا انتقال سنہ ۱۸۳۷ع میں ہوا - اُن کے مرتے ہی لکھنؤ میں ایک بہت بڑا فساد اُٹھ کھڑا ہوا - فریدون بخت عرف مُنّا جان جو اپنے کو نصیر الدین حیدر کا بیٹا کہتے تھے، تخت کے دعویدار ہوئے؛ اور اپنی دادی بادشاہ بیگم کی ہمت افزائی سے ایک فوج کے ساتھ قصر شاہی میں داخل ہوئے - جان لو "John Low" جو اُس وقت ریذیڈنٹ تھے، مانع ہوئے - مقابلے کی نوبت آئی اور چند ساعت تخت پر بیٹھنے کے بعد، منا جان اور بادشاہ بیگم دونوں، انگریزی حراست میں لے لیے گئے اور کانپور اور چند دنوں بعد چنار بھیج کر دونوں بحیثیت سیاسی مجرم، مرے -

اِس واقعے کی مفصل تاریخ، مہراج بلرامپور کی پرائیوٹ لائبریری میں وقائع دلپذیر، مصنفۂ عبدالاحد امیتھوی، ایک نہائت عمدہ ترتیب دیے ہوے قلمی رسالے کی صورت میں موجود ھے، جس کا انگریزی میں میں نے ترجمہ کر کے انڈین پریس کو چھپنے کے لیے دیا ھے - اِس طرح کی بہت سی چیزیں تاریخ اودھ پر جا بجا موجود ھیں، جو اِس وقت بھی محفوظ کی جاسکتی ھیں، بشرطیکہ ھمارے صوبے کا کوئی ادبی اور علمی ادارہ اِس طرف متوجہ ھو جائے -

سعادت علی خان کے بیٹے، محمد علی شاہ، جو اُس وقت ساٹھ برس کی عمر کے تھے؛ منا جان کے اِس واقعے کے بعد انگریزوں کے خیال میں تخت کے حقدار ثابت ہوئے - اِن کا تجربہ حکومت کے معاملات میں بہت کافی تھا؛ باوجود بڈھے ھونے کے اُنھوں نے چار سال حکومت بہت ھی قابلیت سے کی - اُن کا ایک سال کا مکمل روز نامچہ جو لکھنؤ یونیورسٹی کی لائبریری میں غالباً مسعود حسن صاحب رضوی کی ایما سے خرید کر رکھا گیا ھے، اُن کے سیاسی مشاغل اور حکمرانی کی قابلیت کا ایک عمدہ کارنامہ ھے - اگر تلاش کیا جائے تو ایسی اور بھی چیزیں دستیاب ھو سکتی ھیں، جن سے شاھانِ اودھ کی روزانہ زندگی کے واقعات وثوق کے ساتھ معلوم ھوں- محمد علی شاہ کا انتقال سنہ ۱۸۴۲ء میں ھوا - اور اُن کے بعد، امجد علی شاہ، اُن کے بیٹے تخت نشین ھوئے- انھوں نے پانچ سال کے قریب حکومت کی - سنہ ۱۸۴۷ء میں اُن کے مرنے کے بعد اُن کے بیٹے واجد علی شاہ تخت نشین ھوئے ؛ جن کے زمانے میں اودھ انگریزی حکومت میں (سنہ ۱۸۵۶ء) شامل کر لیا گیا - واجد علی شاہ، جان عالم کے لقب سے کافی مشہور ھیں اور اِس میں شک نہیں کہ بحیثیت حکمراں، اُن کی قابلیت کتنی ھی ادنیٰ درجے کی کیوں

نہ ہو ، مگر اُن کی ہردلعزیزی و علمی ذوق اِس قدر اعلیٰ درجے کے تھے کہ وہ اِس وقت تک لکھنئو اور اودھ ھی کیا ، بلکہ ھندوستان کے لوگوں کو یاد ھیں - واجد علی شاہ کے زمانے کے ریذیڈنٹ ، کرنل سلیمن اور میجر اوٹرم ، جنھوں نے لارڈ ڈلھوزی کے حکم سے دو طویل رپورٹیں اودھ کی بابت تیار کی تھیں ، خاص طور سے قابل ذکر ھیں - سلیمن کی مشہور کتاب (A Journey through the Kingdom of Oudh) اودھ کی تاریخ پر کافی روشنی ڈالتی ھے - اوٹرم کی رپورٹ ، جو اودھ پیپرس (Oudh Papers) میں محفوظ ھے ، اسی قدر اودھ کی تاریخ کے لیے ضروری ھے - حال میں ایک نئی کتاب دستیاب ھوئی ھے ، جو اوٹرم اور سلیمن کی رپورٹوں کی تنقید ھے - یہ نادرالوجود تنقید ، مسیح الدین خاں سفیر اودھ نے بعد انتزاع سلطنت اودھ ، پارلیمنٹ کے سامنے پیش کرنے کو اپنے قیام لندن کے زمانے میں سنہ ۱۸۵۷ع میں لکھ کر طبع کرائی ، جو اُسی سال غدر کے واقعے کی وجہ سے انگلستان ھی میں ضبط کر لی گئی - اِس کتاب کے متعلق ایک جرمن شخص ڈاکٹر ھیفمین کا ایک خط واجد علی شاہ کے نام کا بھی خوش قسمتی سے مل گیا ھے ، جس میں انھوں نے لندن میں مسیح الدین سے ملاقات ، اِس کتاب کی ضبطی اور جرمن زبان میں اُس کے ترجمے کا مفصل واقعہ ، درج کیا ھے - یہ کتاب بغض حیثیتوں سے نہایت بیش قیمت ھے - اِس لیے کہ اِس سے میجر برڈ نے اپنی مشہور تصنیف Dacoity in Excelsis میں بھی واقعات لیے ھیں - علاوہ اِس کے اِس میں بھی بہت سے واقعات ، تفصیلات اور اکثر خطوط ملتے ھیں ، جو کسی دوسری جگہ دستیاب نہیں ھو سکتے - انتزاع سلطنت کو اِس وقت اسّی سال کے قریب ھوئے اور اب یہ مسئلہ سیاسی نہیں رہا ، بلکہ تاریخی ھو گیا اور مورخ کے لیے اوٹرم اور سلیمن

کمپنی رپورٹوں کے ساتھ مسیح الدین خاں کی اس نادرالوجود اور نہایت بیش قیمت تصنیف کے مطالعے کی بھی سخت ضرورت ہے - میں نے کوشش کی تھی کہ "یو پی ہسٹاریکل سوسائٹی" اس بیش قیمت تاریخی ذخیرے کو اپنی طرف سے شائع کردے - مگر بدقسمتی سے ممکن نہ ہوسکا' اور ذمہ دار حضرات نے سوسائٹی کی مالی دقتوں کا عذر فرمایا - میرا ارادہ ہے کہ مصنف کی مختصر سوانح عمری کے ساتھ اس کے بعض حصوں کو اختصار کے ساتھ خود طبع کرا دوں -

تاریخ اودھ کے متعلق جس طرح کی خلط ملط بحث' اس تشنہ مضمون میں کی گئی ہے؛ اُس کی میں معافی چاہتا ہوں - بہر صورت قبل اس کے کہ میں اس مضمون کو ختم کروں' چند ایسی باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں' جو تاریخ اودھ کے مطالعے کو دلچسپ اور مفید بناتی ہیں - تاریخ اودھ انگریزوں کی' دیسی ریاستوں کے ساتھ معاملات کا نہایت سچا نمونہ ہے - صلح نامہ الہ آباد سنہ ۱۷۶۴ع سے لیکر تا ضبطی ریاست سنہ ۱۸۵۶ع انگریزی سلطنت کی نشو و نما اور سلطنت اودھ کی کل مدت حیات کا دور ہے - لہذا کلایو سے لیکر ڈلہوزی تک: دیسی ریاستوں کے ساتھ' انگریزی حکمت عملی کے تمام نمونے' اس مختصر تاریخ میں مطالعہ کیے جاسکتے ہیں - ایک طرف تو ولزلی' لارڈ ہیسٹنگز اور لارڈ ڈلہوزی کی دیسی ریاستوں کے ساتھ غیر رواداری اور دوسری طرف لارڈ کارنوالس اور لارڈ ہارڈنگ کے ایسے دیسی ریاستوں کی دقتوں کو محسوس کرنے والے گورنر جنرلوں کی رواداری کے' ایک ہی جگہہ پر نمونے دکھائی دیتے ہیں - ساتھ ہی ساتھ نئے نئے قسم کے سیاسی کھیل اور تماشے ایک ہی جگہہ پر مجتمع پائے جاتے ہیں - مثلاً دھلی کی سلطنت کا دلاًمدی وقار ختم کرنے کے لیے نواب اودھ کو شاہ کا خطاب اختیار کرنے کی طرف متوجہ کرنا اور

اس بادشاہت کو بلحاظ اختیارات - نوابی کے دور سے بھی زاید خالی بنا دیا - دوسرا عجائب روزگار واقعہ یہ ہے کہ آصف الدولہ کی وفات سے نصیرالدین حیدر کی موت تک تقریباً چالیس سال کے عرصے میں دو مرتبہ وراثت کا جھگڑا پڑا - آصف الدولہ کے مرنے کے بعد' وزیر علی اور نصیرالدین حیدر کی موت کے وقت' فریدون بخت عرف منا جان' متوفی حکمرانوں کے تخت کے دعویدار' بحیثیت اُن کی اولاد نرینہ ہونے کے ہوئے- اول الذکر تو چار ماہ حکومت کرنے کے بعد اور آخرالذکر چند ساعت تخت پر بیٹھ کر علحدہ کردیے گئے- دونوں صورتوں میں کمپنی کی بن آئی- پہلی مرتبہ سعادت علی خاں کو بٹھا کر آدھا ملک ہاتھ آیا اور دوسری بار محمدعلی شاہ کو تخت نشین کرکے نیا صلح نامہ مرتب ہوا- جس سے انگریزوں کا اقتدار بہت زیادہ بڑھ گیا - بہر صورت وراثت کے معاملات میں اِس طریقے کی اکھاڑ پچھاڑ اور اُس کے بعد اُس سے اِس طرح کا فائدہ اُٹھانا ' قطعی یہ بتلاتا ہے کہ یہ وراثت کے جھگڑے بھی بہت کچھ معنی رکھتے تھے اور شاید سیاسی چال ہی تھی جس سے کہ بتدریج ریاست کو کمپنی اپنے قبضے میں لا رہی تھی - گو کہ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ سنہ ۱۸۵۶ء میں پورا اودھ ضبط کیا گیا - مگر واقعات تاریخی اِس کے خلاف ہیں - بکسر کی لڑائی سے لیکر انتزاع سلطنت تک کئی بار سلطنت اودھ کا نقشہ بدلا - چنانچہ سنہ ۱۷۶۵ء میں بنارس ' غازیپور اور کانپور اودھ سے لیا گیا - سنہ ۱۷۸۷ء میں فتحگڈھ اور سنہ ۱۷۹۸ء میں الہ آباد چنار کے بدلے میں انگریزوں کے ہاتھ آ گیا - پھر سعادت علی خاں کی تخت نشینی کے موقعے پر آدھی سلطنت قرضے کی ادائگی کے نام سے انگریزی سلطنت کو ملی اور آخرکار واجدعلی شاہ کی معزولی' بقیہ نصف کی ضبطی کی وجہ ہوئی- اِس کے علاوہ متواتر عہدنامجات محض انگریزی اثر کو بڑھانے اور ریاست کی طاقت اور ملکی

وسعت کو کم کرنے کے لیے ہوا کیے - ملکی وسعت کے کم ہونے کے ساتھ ہی ساتھ دیسی فوج کا استحصال بھی ہر عہدنامے کا ضروری جزو تھا - علاوہ اِس کے اودھ کے خزانے پر بھی برابر بیجا ٹیکس لگتا رہا - ہنری لارنس خوب لکھتے ہیں :—

"Oudh was periodically used as a wet nurse to relieve the difficulty of E. I. Company's finances".

مگر باوجود اِن شدائد کے سب سے زیادہ قابل تعریف اودھ کے حکمرانوں کی فرمانبرداری تھی - جس کی تعریف خود انگریزوں نے برابر کی - علاوہ اِس کے کس قدر قابل خیال یہ واقعہ ہے کہ ضبطی ریاست تک سیکڑوں موقعے ایسے ہوئے' جن پر تصادم ممکن تھا؛ مگر علی التواتر حکمران اودھ نے صبر اور ضبط سے کام لیا - ملاجان کی تخت نشینی کے علاوہ' کبھی انگریزی فوج سے لڑائی کی نوبت نہیں آئی - مضمون کو ختم کرتے ہوئے مجھے یہ یاد دلانا ضروری ہے کہ سب سے زیادہ تاریخ اودھ کے مطالعہ کرنے والے کو اُس دور کی علمی اور ادبی ترقی کو ملحوظ رکھنا ہے - اِس ترقی کا ثبوت' میں مولانا شرر کی مشہور تصنیف "مشرقی تمدن کا آخری نمونہ' سے پیش کرتا ہوں :—

اِس کے تسلیم کرنے میں شائد کسی کو عذر نہ ہوگا کہ ہندوستان میں مشرقی تمدن کا جو آخری نمونہ نظر آیا وہ گذشتہ دربار اودھ تھا۔ .... جو عجیب و غریب ترقیاں دکھا کر بہت ہی جلد فنا ہوگیا -

مولانا شرر کی آخری تاجدار اودھ کے ادبی کارناموں کے متعلق جو رائے ہے- وہ بھی یہاں پر نقل کی جاتی ہے - 'حزن اختر' کے مقدمے میں فرماتے ہیں کہ ' واجدعلی شاہ کا علمی مذاق نہایت ہی پاکیزہ اور اعلٰی درجے کا تھا...... اُن کی علمی استعداد بہت ہی بڑھی ہوئی تھی - عربی

کے تو عالم نہ تھے، مگر فارسی میں اُن کا درجہ شائد ابوالفضل سے کچھ کم ہوگا ...... فارسی نثر ...... جس خوبی کے ساتھ قلم برداشتہ واجد علی شاہ لکھ دیتے، میرے خیال میں کسی سے ممکن نہ تھا - یہی حالت نظم کی تھی۔ طبیعت اِس قدر موزوں پائی تھی کہ شائد ایسا موزوں طبع نہ دیکھا گیا ہوگا - اُس سلطنت کے دور میں جیسے جیسے قادرالکلام نثار و شعرا پیدا ہوئے، اُن کا تذکرہ اختصار کے ساتھ مشکل ہے - غزل گوئی ' مرثیہ گوئی ' ہجو ' ہزل ' ڈرامہ ' غرض تمام اصناف سخن کے ماہرین پیدا ہوئے - شاہان اودھ کا یہ کارنامہ ایسا ہے جس میں وہ سلاطین مغلیہ کے صحیح وارث کہے جانے کے حقدار ہیں - اردو زبان کی ترقی اِن ہی کے دم سے ہوئی اور انہی کی رواداری اور مذہبی بے تعصبی کا نتیجہ تھا کہ ہندو مسلم تعلقات ' نہایت شگفتہ رہے اور دونوں قوموں نے باہم اردو کی ترقی اور فارسی زبان کے قیام کی کوشش کی - اِس وقت بھی ہزارہا ہندو شعرائے فارسی کا کلام دستیاب ہوتا ہے - لچھمی نرائن قتیل اور ٹیک چند کے ایسے بہت سے نام گنائے جاسکتے ہیں - مذہبی رواداری اِس درجہ ترقی کر گئی تھی کہ ہزارہا ہندو ' محرم کی عزاداری کو عقیدتاً کرتے تھے اور مسلمان " ہندو میلوں میں شرکت ' بالکل عیب نہیں سمجھتے تھے - راجہ درشن سنگھ محرم میں لاکھوں روپیہ صرف کرتے تھے اور واجد علی شاہ نے سادھو کا پارٹ رھس میں خود لیا - علاوہ اِس کے اکثر جگہوں پر ہندو اور مسلم اتحاد کی یادگاریں اِس وقت تک ملتی ہیں - مہاراج تکیت رائے کی مسجد ' کاکوری ضلع لکھنؤ اور دمگرھ ضلع الہ آباد میں شاہ باسط علی قلندر رح کی خانقاہ اور مزار مہاراج کی مذہبی رواداری کا اِس وقت تک ثبوت دیتے ہیں - رابرٹس نے اپنی کتاب سینز آف ہندوستان میں سنہ ۱۸۳۵ء کا

مشاہدہ اِن الفاظ میں درج کیا ہے :—

(Though the Muslim religion has the ascendancy that of the Hindoo is not only tolerated but allowed the fullest enjoyment of its superstition) اودھ کی سلطنت کی تاریخ میں بھی اعلیٰ ترین عہدہ داروں میں بیشمار نام ہندوؤں کے ملتے ہیں۔ مثلاً نول رائے، ٹکیت رائے، جھاؤ لال، امرت لال، درشن سنگھ وغیرہ - حضرات ' کیا آپ مجھ سے اتفاق نہ کریں گے کہ اِس دور کی تاریخ کا مطالعہ ہمارے بچوں اور نوجوانوں کے لیے مفید ہو گا - اور اُن کو آپس کے اختلافات کو سلطنت اور قومی ضرورتوں کے لیے غیر ضروری اور مضر سمجھنے میں مدد دے گا - لہٰذا ہمارا فرض ہے کہ ہم تاریخ اودھ کی طرف توجہ کریں -

———

رائے بہادر جناب پریاگ دیال صاحب،

صوبہ اودھ کے سکے

صوبہ اودھ کے سکوں کے متعلق کچھ عرض کرنے سے پیشتر اس کے تواریخی حالات پر ایک سرسری نظر ڈالنا لازمی ہے تاکہ صاف طور پر یہ ظاہر ہو جائے کہ کس کس موقعہ پر اور کن کن وجوہات سے اس صوبہ میں سکے جاری ہوئے -

سنہ ۱۷۲۰ع میں محمد شاہ بادشاہ دہلی نے اپنے وزیر سلطنت سعادت خاں کو صوبہ‌دار اودھ مقرر فرمایا - سعادت خاں کا اصلی نام محمد امین تھا جو کہ خراسان میں نیشاپور کے سید خاندان سے تعلق رکھتا تھا - اس عہدے پر مامور ہوتے ہی اس نے اپنا لقب برہان‌الملک اختیار کیا اور دہلی چھوڑ کر اپنے صوبہ میں چلا آیا اور لکھنؤ و اجودھیا کو اپنا خاص قیام گاہ بنایا -

یہ پہلا نواب تھا جسنے مچھلی کی شکل کو اپنا خاص نشان قرار دیا - اس کے بارہ میں یہ روایت بیان کی جاتی ہے کہ ایک روز برہان‌الملک جمنا کے کنارے ہاتھ اٹھائے نماز پڑھ رہا تھا جبکہ ایک مچھلی پانی سے اچھل کر اس کے ہاتھوں میں آگئی - اس واقعہ کے تھوڑی ہی دیر بعد اس کو اودھ کی صوبہ‌داری مل گئی - یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس واقعہ کی اصلیت کس حد تک صحیح ہے مگر یہ ضرور ہے کہ مچھلی کا نشان اودھ میں بہت ہی مبارک سمجھا جاتا ہے اور بالعموم پرانے مکانوں کے صدر دروازوں پر موجود ہے اور ایک شگون سمجھا جاتا ہے - برہان‌الملک نے لکھنؤ کے قلعہ لکھنا کا نام اسی وجہ سے مچھی

ہوں رکھا تھا - سنہ ۱۷۳۹ع میں سعادت خاں کا انتقال ہوا - اس کی جگہ اس کا داماد منصور علی خاں صفدر جنگ اودھ کا صوبیدار ہوا اور سنہ ۱۷۴۷ع میں دھلی سلطنت کا وزیر بھی مقرر کیا گیا - اس وقت سے وہ اور اُس کے جانشین نواب وزیر کہلانے لگے - یعنی نواب صوبہ اودھ اور وزیر سلطنت مغلیہ دھلی - صفدر جنگ نے شہر فیض‌آباد کی بنیاد از سر نو ڈالی اور زیادہ تر وھیں سکونت پذیر رھا - سنہ ۱۷۵۳ع میں اس کا انتقال ہوا اور شجاع‌الدولہ اس کی جگہ اودھ کی گدی پر رونق افروز ہوا -

سنہ ۱۷۵۴ع عالمگیر ثانی بادشاہ دھلی کے عہد میں بنارس کی تکسال کا انتظام اس کے سپرد ھوا اور سنہ ۱۷۷۵ع یعنی شجاع‌الدولہ کی وفات تک یہ تکسال اُسي کے زیر اھتمام رھی اور اسمیں سکے بادشاہ شاہ عالم ثانی کے نام سے ڈھلتے رھے -

سنہ ۱۷۷۵ع میں اضلاع بنارس و جونپور زیر تحت ایسٹ انڈیا کمپنی ھوے مگر اسکے کچھ عرصہ قبل بریلی کی تکسال بھی جاری ھو چکی تھی - نواب شجاع‌الدولہ بہادر اور انگریزی فوج کے سپہ سالار جنرل چیمپین صاحب (Champion) نے ملکر روھیلوں کو جن کا کہ سپہ سالار حافظ رحمت خاں تھا بمقام میران کٹرہ جو کہ ضلع شاھجہاں‌پور میں واقع ھے سنہ ۱۷۷۴ع سنہ ۱۱۸۸ھ میں شکست دی اور اس فتحیابی کی خوشی میں ایک تمغہ نقرئی تکسال بریلی سے جاری کیا - یہ تمغہ (پلیٹ ۱ - نمبر ۱) بہت ھی کمیاب ھے اور صرف دو تین نمونے اب تک مل سکے ھیں - خوش قسمتی سے یہ تمغہ لکھنؤ عجائب خانہ میں موجود ھے - اس کا وزن ۵۱۸.۵ گرین ھے اور قطر پونے دو انچ ھے - اس کے بائیں جانب یہ کتبہ ھے :-

پلیت ۱ - نمبر ۱

پلیت ۱ - نمبر ۲

پلیٹ ۲

۲
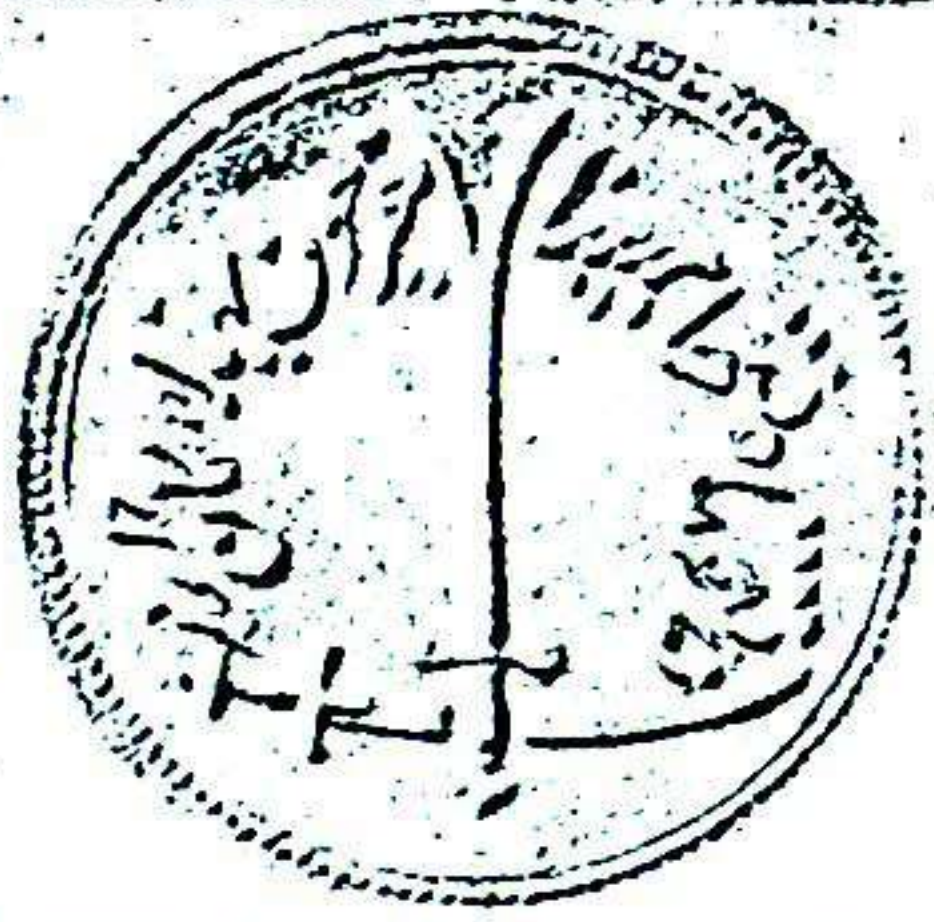
۱۰ ۱۱ ۱۲
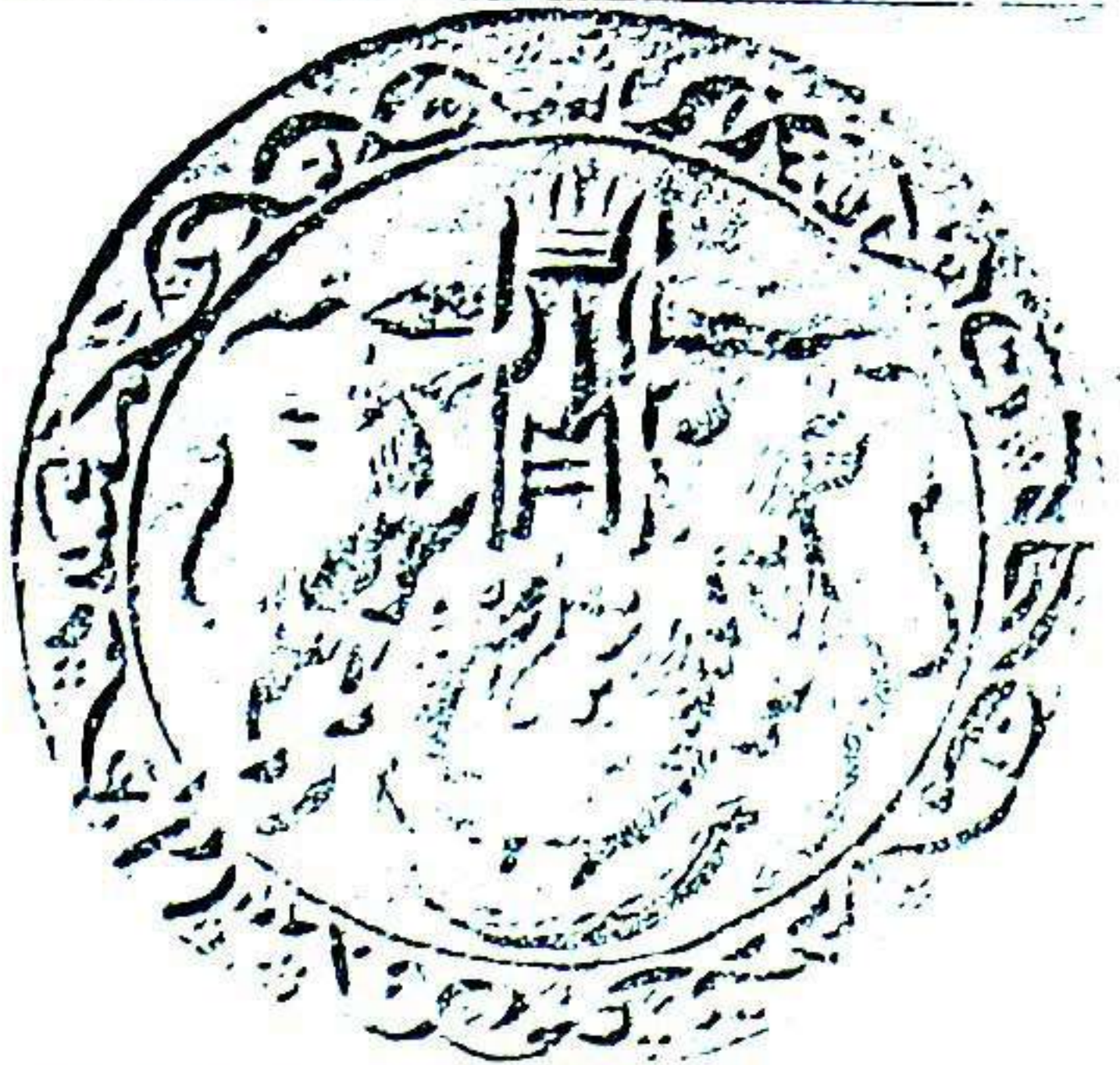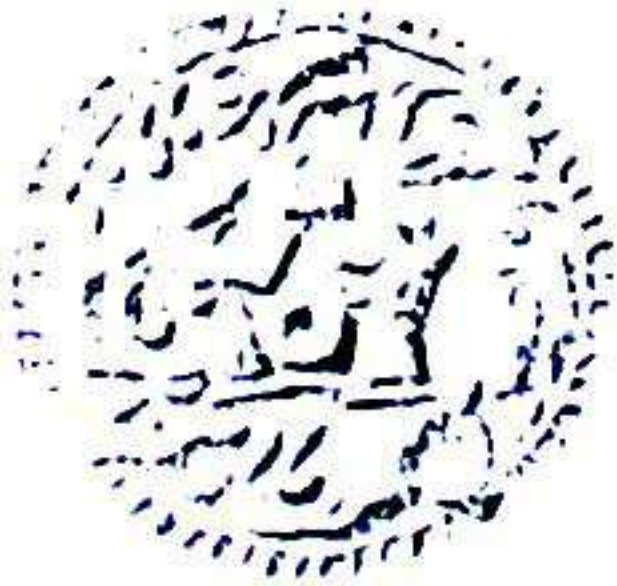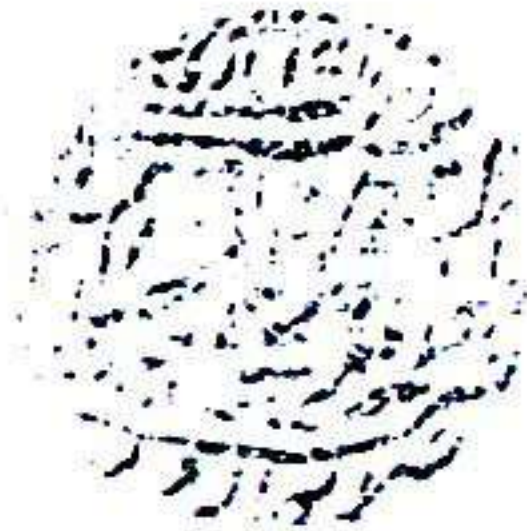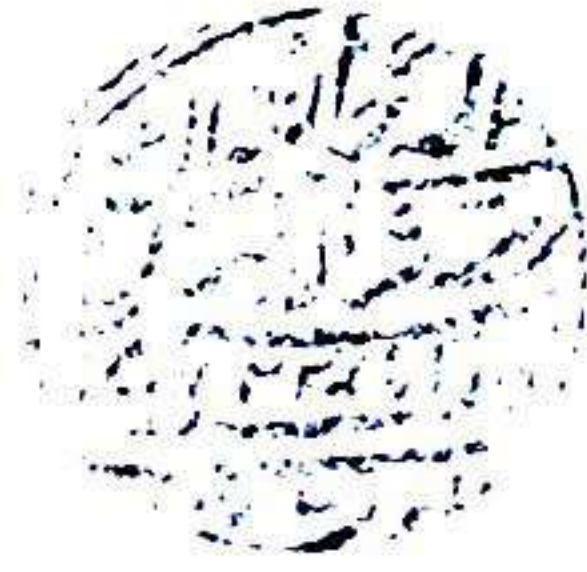
نواب

شجاع الدولہ وزیراعظم صد

یازدہم صفر روز شنبہ سنہ ۱۱۸۸ھ در الہی کھیرہ

روھیلہ ھارا زدہ و حافظ رحمت خاں

سردار روھیلہ کشتہ شدہ

اور دوسری جانب ایک نقطہ دار دائرہ کے اندر ایک دو ملنی تلوار سبد ھی کھڑی ھے اور اس کے قبضہ پر گذرتے ھوے اور زاویہ قائمہ بناتے ھوئے ایک دوسری معمولی تلوار ھے - تمغہ کی گولائی میں یہ کتبہ لکھا ھے :—

انا فتحناہ فتحاً مبینا

یفرحون بہذا سلطان الہند

نواب شجاع الدولہ نے ۲۶ جنوری سنہ ۱۷۷۵ع کو وفات پائی - اس کا مقبرہ گلاب باڑی فیض آباد کی خاص عمارتوں میں اب تک موجود ھے -

نواب اصف الدولہ اپنے والد ماجد نواب شجاع الدولہ کی جگہ پر رونق پذیر ھوے اور بجاے فیض آباد کے لکھنؤ میں سکونت اختیار کی اور اسکو کافی زینت دی - عالیشان عمارتیں مثلاً دولت خانہ ' رومی دروازہ ' کوٹھی بیبیاپور ' چلھت ھاوس اور بڑا امامباڑہ تعمیر کرائیں - خود دولت خانہ کے اندر آصفی کوٹھی میں بود و باش اختیار کی - یہ دریادلی ' یہ خوش نیتی اور سخاوت کا ایک رکن تھا - ذیل کی کہاوت مشہور ھے " جسکو نہ دے مولا اس کو دے آصف الدولہ " -

یہ کلمہ خیر اس کے انتقال کے بہت دنوں بعد تک دوکاندار اپنی دوکان صبح کھولتے وقت کہتے تھے - اس نے جارج سویم بادشاہ انگلینڈ کے شفا پانے پر پچیس ہزار روپیہ ڈاکٹر کی نذر کیا اور پچیس ھزار اس کے

نام سے غریبوں اور محتاجوں کو تقسیم کردیا - اس کے عہد میں مچھلی دار روپیے جن پر سنہ جلوس ۲۶ موجود ہے بادشاہ شاہ عالم کے نام سے بنتے رہے - اس نے ۲۱ ستمبر سنہ ۱۷۹۷ع کو لاولد انتقال کیا اور مچھی بھون کے امام‌باڑہ میں دفن کیا گیا - اس کے بعد وزیر علی اور سعادت علی خاں تخت نشین ہوے مگر انکے عہد میں کوئی خاص سکہ یا تمغہ جاری نہیں ہوا -

غازی‌الدین حیدر جو صوبہ اودہ کا آخری نواب وزیر تھا - ۱۱ جولائی سنہ ۱۸۱۴ع کو اس عہدہ پر سرفراز ہوا - اس کے عہد کا خاص واقعہ یہ ہے کہ لارڈ ہیسٹنگز مارچ سنہ ۱۸۱۸ع میں لکھنؤ تشریف لائے اور اس کو یہ ترغیب دی کہ تم سلطنت دہلی سے اپنا قطع تعلق کرکے خود مختار ہو جاؤ اور بحیثیت بادشاہ اودہ سکہ جاری کرو - بالآخر سنہ ۱۸۱۹ع میں خطاب بادشاہ اودہ عطا ہوا اور اس وقت سے دہلی کی حکومت سے کوئی سروکار نہ رہا -

غازی‌الدین حیدر کی تاجپوشی بہت ہی جوش و خروش سے عمارت موسومہ لال بارہ دری میں جس میں کہ اِس وقت لکھنؤ کا عجائب خانہ ہے ہوئی - تاجپوشی کے دن تیس ہزار روپیہ کے جواہرات لٹائے گئے اور چاندی کے تمغے و خلعت اراکین و امرا و روساء کو تقسیم ہوے - تمغہ کا وزن ۱۲۶۰ گرین ہے اور قطر ڈھائی انچ ہے - یہ تمغہ (پلیٹ ۱ - نمبر ۲) اعلیٰ درجہ کی کاریگری اور دستکاری کا نمونہ ہے - اس کے پہلے طرف ایک دائرے میں تاج و ہار سے مزین بادشاہ کی شبیہہ ہے اور بقیہ جگہ میں پھول و بیل بنی ہے - حاشیہ پر گولائی میں ذیل کا کتبہ جس کا آغاز بادشاہ کے بائیں ہاتھ کے نیچے سے ہے موجود ہے :—

سکہ زد بر سیم و زر از فضل رب ذوالمنن

غازی الدین حیدر عالی نسب شاہ زمن   سنہ احد

دوسرے طرف مارکہ ہے - اسمیں دو شیر ہاتھوں میں جھنڈا لئے ہیں - ان جھنڈوں پر مچھلی بنی ہے - دونوں جھنڈوں کے درمیان ایک کٹار ہے - کٹار کے اوپر تاج اور نیچے دو مچھلیاں ہیں جلکی گولائی سے ایک دائرہ بن جاتا ہے - سب سے نیچے ایک لہردار باریک جھنڈا ہے - داھنے گوشہ پر حرف " ج " ہے اور کنارے حاشیہ کی گولائی میں یہ دعائیہ شعر ہے :—

تا ہزار سال شاہا بقائے عمر تو بادا

ہزار سال باشی تو در زمان خدا

اس تمغہ پر حیرت ہے کہ خلاف دستور بادشاہ کی شبیہ موجود ہے - سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دفعتاً عرصہ قریب دو سو سال بعد شبیہ کا خیال کیسے گزرا - کیونکہ مغل بادشاہوں میں صرف آزاد خیال جہانگیر بادشاہ نے اپنی شبیہ خلاف شریعت بنوانا پسند فرمایا تھا - اس قسم کا سب سے آخری سکہ ہجری سنہ ۱۰۲۳ میں اجمیر سے جاری ہوا تھا اور اس پر یہ شعر ہے :—

قضا بر سکۂ زر کرد تصویر

شبیہ حضرت شاہ جہانگیر

جہانگیر کے بعد کسی مغل بادشاہ نے اپنی شبیہ کو نہیں بنوایا یہ خیال اب تک صحیح تھا - مگر حسن اتفاق سے ابھی حال میں ایک تمغہ بادشاہ شاہ عالم ثانی کا دستیاب ہوا جس پر کہ شاہ عالم کی شبیہ موجود ہے - یہ تمغہ بھی بہ یادگار پھدائش مسند نشینی - و بحالی سلطنت جاری ہوا تھا اور اس کے ایک طرف یہ کتبہ ہے :—

ولادت در سنہ ۱۱۴۰ جلوس در سنہ ۱۱۷۳ بحال شد سلطنت ۱۲-

دوسرے جانب معمولی شعر ہے :—

سکہ زد در ہفت کشور سایۂ فضل الہ

حامی دین محمد شاہ عالم پادشاہ

پس یہ معلوم ہوتا ہے کہ غازي الدین حیدر نے جس طرح یہ شعر شروع میں اپنے سکوں پر لکھا غالباً اُسی طرح اپنی تاج پوشی کے یادگار میں بھی تمغہ پر اپنی شبیہہ بنائی -

غازي الدین حیدر نے کئی قسم کے سکے جاري کئے -

طرز (الف) یہ سکہ سنہ ۱۲۳۴ھ میں شاہ عالم کے نام سے جاري کیا (پلیٹ ۲ - نمبر ۱) - اس پر پہلی طرف یہ شعر کندہ ہے :—

سکہ زد در ہفت کشور سایہ فضل الہ

حامی دین محمد شاہ عالم بادشاہ

دوسري طرف اودہ کا مارکہ ہے جس میں دو مچھلیوں کے درمیان اس کا سنہ جلوس ۲۶ لکھا ہے اور ضرب " صوبہ اودہ دارالامارہ لکھنؤ " ہے - مچھلیوں کے اوپر کٹار اور تاج ہے اور ان کے دائیں بائیں جھنڈا لئے ہوئے شیر ہیں -

طرز (ب) یہ سکہ بھی سنہ ۱۲۳۴ھ میں اپنے نام سے جاری کیا مگر اس پر سنہ جلوس ۵ اس وجہ سے لکھا ہے کہ وہ اصلیت میں پانچ سال قبل یعنی سنہ ۱۲۲۹ھ میں اپنے والد ماجد کی جگہ پر نواب وزیر مقرر ہو چکا تھا -

طرز (ج) یہ سکہ بھی سنہ ۱۲۳۴ھ میں اپنے ہی نام سے جاري کیا اس میں سنہ جلوس ۵ کے بجائے سنہ احد ہے کیونکہ اس کی

بادشاہت کا یہ پہلا سال تھا اور اسی سال اس کی تاج پوشی بھی باضابطہ ہوئی تھی - ان (پلیٹ ۲ - نمبر ۲) سکوں پر ایک طرف یہ شعر کندہ ہے :-

سکہ زد بر سیم و زر از فضل رب ذوالمنن
غازی الدین حیدر عالی نسب شاہ زمن

اور دوسری طرف مثل (الف) و (ب) کے وہی عبارت و نشانات ہیں -

طرز (د) سنہ ۱۲۳۶ھ میں لکھنؤ کا لقب 'دارالامارہ' سے 'دارالسلطنت' ہو گیا اور ان سکوں پر '' ضرب صوبہ اودھ دارالسلطنت لکھنؤ '' تحریر ہے - (پلیٹ ۲ - نمبر ۳) -

غازی الدین حیدر نے سنہ ۱۲۴۳ھ میں وفات پائی اور نصیرالدین حیدر بادشاہ دویم ہوئے - ان کے عہد کے پہلے دو سال کے سکوں (پلیٹ ۲ - نمبر ۴) پر ان کا نام سلیمان جاہ ہے اور ذیل کا شعر ہے :—

بر ہر سکہ شاہی زدہ ز لطف اللہ
سپہر مرتبہ شاہ جہاں سلیمان جاہ

تیسرے سال یہ شعر بدلا اور سکوں پر بادشاہ کا نام نصیرالدین حیدر ہوا (پلیٹ ۲ - نمبر ۵) :—

سکہ زد بر سیم و زر از فضل حق ظل اللہ
نائب مہدی نصیرالدین حیدر بادشاہ

حکومت کے ساتویں سال سکہ کی دوسری طرف خفیف تبدیلی ہوئی (پلیٹ ۲ - نمبر ۶) - نشان و عبارت وہی رہی صرف عبارت بجائے اوپر نیچے اور کنارے کے گولائی میں ایک ہی سطر میں لکھی گئی - اور تاریخ جلوس سکہ کے مرکز سے ہٹا کر اسی سطر میں رکھی گئی -

نصیرالدین حیدر کی وفات پر ان کے چچا محمد علی شاہ تخت شاہی پر سنہ ۱۲۵۳ھ میں جلوہ افروز ہوئے - انہوں نے سونے اور چاندی کے سکوں پر ایک نئے قسم کا مارکہ ایجاد کیا - اس میں بجائے شیر کے دو عورتیں ہیں جو کہ ان کے جلوس کے پہلے اور دوسرے سال میں ننگے سر ہیں اور بعد ازاں نوکیلی چھجہ‌دار پگڑی پہنے ہیں- (پلیٹ ۲ - نمبر ۷ و ۸-) اور سکوں پر یہ شعر پایا جاتا ہے :—

بجود و کرم سکہ زد در جہاں
محمد علی بادشاہ زماں

محمد علی شاہ کے اول تین سال کے سکوں کے دوسرے جانب ضرب ''صوبہ اودہ بیت‌السلطنت لکھنؤ'' ہے مگر سنہ ۱۲۵۶ھ سے 'ملک اودہ' بجائے 'صوبہ اودہ' کے تحریر ہے -

سنہ ۱۲۵۸ھ میں محمد علی شاہ کے بعد ان کے بیٹے امجد علی تخت نشین ہوئے - ان کے عہد کے سکوں (پلیٹ ۲ - نمبر ۹) پر یہ شعر کندہ ہے :—

در جہاں زد سکہ شاہی بتائیدالہ
ظل حق امجد علی شاہ زمن عالم پناہ

اور دوسری طرف یہ مارکہ ہے - یعنی ایک گھومی ہوئی مچھلی کے اوپر تاج اور چھتر ہے اور ان کے دائیں اور بائیں کسی قدر گولائی میں دو تلواریں ہیں اور یہ کتبہ ہے - ''ضرب ملک اودہ بیت‌السلطنت لکھنؤ سنہ جلوس میمنت مانوس'' اس کے سکوں میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی - کچھ خفیف تبدیلی مثلاً تاج کے اوپر نقطہ یا مضراب یا لکیریں ملتی ہیں -

سنہ ۱۲۶۳ھ میں واجد علی شاہ تخت نشین ہوا - اس کے سکہ (پلیٹ ۲ - نمبر ۱۰) کی پہلی طرف یہ شعر ہے :—

سکہ زد برسیم و زر از فضل تائیدالہ

ظل حق واجد علی سلطان عالم بادشاہ

اور دوسری طرف مارکہ یا نشان شاہی ہے جس پر پھر تبدیلی ہوئی اور بجائے عورتوں کے مچھلی دار پریاں بنائی گئیں اور پورا نشان یہ ہوا :—

دائیں اور بائیں دو مچھلی دار پریاں جن کے ایک ہاتھ میں جھنڈا اور دوسرے ہاتھ میں مگدّر اور درمیان میں تھال ہے - اس کے اوپر تاج اور تاج کے اوپر چھتر اور چھتر کے اوپر طوطا ہے - یہ طوطا صاف نظر نہیں آتا مگر واجد علی شاہ کے فرمان پر جو شاہی مہر ہے اُس میں بالکل صاف ظاہر ہوتا ہے - اور نیچے کی جانب دو تلوار اور دو ترچھے مگدر ہیں - سب سے نیچے لہردار جھنڈا یا لکیر ہے - کتبہ یہ ہے :—
" ضرب ملک اودھ بیت السلطنت لکھنؤ سنہ جلوس میمنت مانوس "

سنہ ۱۲۶۷ھ میں واجد علی شاہ نے اپنے سکے کی دوسری طرف بجائے ضرب " ملک اودھ بیت السلطنت لکھنؤ " کے " ملک اودھ اختر نگر " رکھا کیونکہ بادشاہ خود شاعر تھا اور اُس کا تخلص اختر تھا - اس طرز کے سکے بہت ہی کمیاب ہیں غالباً اس وجہ سے کہ اسی سال ضرب کے نام میں پھر تبدیلی واقع ہوئی اور بجائے "ملک اودھ اختر نگر" کے "بیت السلطنت لکھنؤ ملک اودھ اختر نگر" ہوا (پلیٹ ۲- نمبر ۱۱ و ۱۲) -

واجد علی شاہ کے سکے بہت نفیس ساخت کے ہیں علاوہ روپیہ کے چاندی کی اٹھنی ، چونی ، دونّی اور اکنی پائی جاتی ہیں - اشرفی نصف اشرفی بھی موجود ہے - ایسے سکے اور دیگر بادشاہوں کے بھی جن کا تذکرہ میں پیشتر کرچکا ہوں دستیاب ہوئے ہیں -

اشرفی کا وزن قریب ۱۶۵–۱۶۴ گرین ہے اور روپیہ کا وزن ۱۷۲–۱۷۰ گرین ہے - پیسہ کا وزن ۲۰۰–۱۸۰ گرین تک ہے - گو واجد علی شاہ نے ایک پیسہ ۴۵۱ گرین وزن کا بھی جاری کیا تھا اس کا ایک نمونہ مسٹر براون کے ذخیرہ میں موجود ہے ' ادھلے بھی محمد علی شاہ اور امجد علی شاہ کے دستیاب ہوے ہیں اور عالیجناب بامفورڈ صاحب کے ذخیرہ میں موجود ہیں مگر یہ بہت کمیاب ہیں - اودھ کے سکوں پر غور کرنے سے معلوم ہوا ہے کہ یہ سکے مغل بادشاہوں کے سکے کے اندازہ پر بنائے گئے ہیں - طرز و وزن و عبارت ملتی جلتی ہے - ان سکوں پر بادشاہوں کے عظیم‌الشان لقب بھی پائے جاتے ہیں مثلاً غازی‌الدین حیدر نے اپنا لقب شاہ زماں رکھا - امجد علی نے عالم پناہ اور واجد علی نے سلطان عالم رکھا - اور اسی طرح لکھنؤ کو بھی اعزاز دیا اور القاب مثلاً دارالامارۃ ' دارالسلطنت ' بیت‌السلطنت اور اختر نگر عطا فرمایا -

بہر حال لکھنؤ کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس کی عزت افزائی بادشاہ وقت عرصہ سے کرتے آئے ہیں اور موجودہ سرکار کی بہت توجہ خاص اس پر ہے -

(اکتوبر ۱۹۳۶ء)

شوکت تھانوی

لکھنؤ

آپ جانتے ہیں کہ یہ لکھنؤ ہے - تاریخ بھی لکھنؤ کے وجود کا پتا دیتی ہے اور جغرافیہ بھی گواہ ہے کہ لکھنؤ ہندوستان کے صوبۂ اودھ میں دریائے گومتی کے کنارے آباد ہے - اور تو اور ریلوے ٹائم ٹیبل میں بھی لکھنؤ کے تذکرے موجود ہیں اور ہندوستان کے ہر تفصیلی اور اجمالی نقشے میں لکھنؤ موجود نظر آتا ہے ' مگر باوجود اِن تمام حوالوں کے آپ کے پاس سیاحوں کے اِس سوال کا دراصل کوئی جواب نہیں ہے کہ کیا یہی لکھنؤ ہے -

قصہ در اصل یہ ہے کہ لکھنؤ سے باہر لکھنؤ جن روایات سے تعبیر ہے در اصل وہ اب خواب ہو چکی ہیں اور لکھنؤ جو کچھ اب ہے وہ اُس خواب کی اُلٹی تعبیر - باہر سے آنے والے عجیب و غریب غلط فہمیوں میں مبتلا ہوکر لکھنؤ تشریف لاتے ہیں اور غالباً اُن کو یہ یقین ہوتا ہے کہ لکھنؤ اب تک شاہان اودھ کے تکلفات کا آئینہ دار ہوگا اور اِس شہر پر مغربی اثرات غالب نہ آئے ہوں گے - چنانچہ وہ لکھنؤ کا ٹکٹ لینے کے بعد لکھنؤ کے متعلق یہی توقعات قائم کرتے ہیں کہ لکھنؤ کے اسٹیشن پر اُترنے کے بعد ہی سب سے پہلے تو قلی مجرا بجا لائیں گے ' اُس کے بعد دست بستہ خیریت مزاج دریافت کریں گے اور بطور معذرت کہیں گے کہ "حضور نے بڑی زحمت فرمائی اور ہم کو یہ عزت بخشی !

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے

کبھی ہم اُن کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

حضور والا تشریف لے چلیں ہم خدام والا کا اسباب لاتے ہیں " - اس کے بعد اُن کو اُمید یہ ہوتی ہے کہ جب وہ ٹکٹ کلکٹر کو ٹکٹ دکھائیں گے تو وہ ہاتھ جوڑ کر اور اپنے کان پکڑ کر کہے گا کہ " استغفراللہ ' یہ حضور والا کیا کر رہے ہیں ' بھلا آپ کو بھی ٹکٹ دکھانے کی ضرورت تھی ؟ اول تو ہمارے لیے یہی ندامت کیا کم ہے کہ جناب والا کو ٹکٹ لے کر سفر کرنا پڑا اُس پر اب آپ ٹکٹ دکھا کر محجوب فرما رہے ہیں - تشریف لے جائیے ' یہ آپ کا گھر ہے - " اسٹیشن سے باہر آکر وہ منتظر ہوتے ہیں کہ اِکے والے اُن کا خیر مقدم کریں گے اور کہا تعجب ہے کہ لکھنؤ کے گھوڑے بھی دیدہ و دل فرش راہ کر دیں ؛ پھر جب وہ قلی کو مزدوری دیں گے تو وہ دو چار قدم پیچھے ہٹ کر کہے گا کہ " اے جناب ' بس اب حد ہوگئی - ہم اور آپ سے اِس اسباب کے اُٹھانے کی اُجرت لیں ! واللہ ہے کہ یہ ہرگز نہ ہوگا - آپ کو ہمارے سر عزیز کی قسم یہ غیریت نہ برتیے - آپ ہمارے مہمان ہیں ' ہم کو تو چاہیے تھا کہ آپ کی کوئی خدمت کرتے نہ کہ آپ سے مزدوری لیں - واللہ اگر آپ نے اِصرار کیا تو سخت صدمہ ہوگا " - بہر حال جب بہت اصرار کے بعد وہ قلی کی جیب میں زبردستی مزدوری کے پیسے ڈال کر اِکے پر تشریف رکھیں گے اور شہر کی جانب روانہ ہوں گے تو ہر گھر کے دروازے پر صاحب خانہ ہمہ تن ' خوش آمدید ' بنا ہوا اُن کو نظر آئے گا اور ہر ایک چاہے گا کہ وہ اُسی کے مہمان ہو جائیں ؛ مگر وہ سب سے معذرت کرکے جب کسی ہوٹل میں پہونچیں گے تو اُن کو انتظار ہوگا کہ ہوٹل میں پہونچتے ہی سب سے پہلے تو ہوٹل کا منیجر سرو قد کھڑا ہوکر اُن کا اِستقبال کرے گا پھر نہایت معطر قسم کا حقہ پیش کرتے ہوئے خاصدان آگے بڑھائے گا اور اِن تمام مدارات کے بعد اُن کے لیے ایک ایسا کمرا مہیا کیا جائے گا جس میں چکن اور جامدانی کے پردے پڑے ہوں گے ،

رومی قالین بچھے ہوں گے' شمامۃ العنبر سے کمرے کو مہکایا گیا ہوگا اور اگردان میں خوشبو سلگتی ہوئی ملے گی؛ نہ اپنا بستر کھولنے کی ضرورت ہوگی نہ اپنا لوٹا نکالنے کی بلکہ ہر آرام کی چیز وہاں پہلے ہی سے مہیا ہوگی اور مسافر کو یہ معلوم ہوگا کہ گویا اپنے گھر میں آ گئے -

مختصر یہ کہ وہ اِسی معیار پر اپنی توقعات قائم کرتے ہوئے آتے ہیں مگر لکھنؤ کے اسٹیشن پر اُترنے کے بعد اُن کو لکھنؤ کے اخلاق اور انہاک کنٹونملات کے پاہت فارسی اخلاق میں کوئی نمایاں فرق محسوس نہیں ہوتا اور اسٹیشن سے باہر نکل کر بھی وہ لکھنؤ کو لکھنؤ نہیں پاتے - اُن کو لطافت اور نازک انگرکھوں کی جگہہ وہی کرخت سوٹ اور وہی فہر لکھنوی شیروانیاں نظر آتی ہیں جو بمبئی میں بھی ہوتی ہیں اور میرٹھ میں بھی' کلکتے میں بھی نظر آتی ہیں اور پٹنے میں بھی - زمین دوز لچکدار آداب اور تسلیمات کے بجائے وہی نقش نما سلام علیکم یہاں بھی ملتا ہے' جس سے بھاگ کر علیگڈھ والے یہاں آتے ہیں؛ ہاتھ جوڑ کر مزاج پرسی کی خمیدہ رسم کے بجائے وہی کلائی توڑ جھٹکے دار شیک‌ہینڈ یہاں بھی ہے' جس کا صدمہ شانے تک محسوس ہوتا ہے اور معطر حقوں کی جگہہ وہی موٹے موٹے لٹھ نما سگار اور بدبو دار سگریٹ یہاں بھی ہوتے ہیں' جو ہاضمہ کے لیے ممکن ہے کہ مفید ہوتے ہوں لیکن شامہ کے لیے تو نہایت غیر شاعرانہ ہوتے ہیں- نہ نشست و برخاست میں اُقلیدس کے مختلف زاویوں کی قید نظر آئے گی' نہ علم مجلس کے سڑکوں پر مظاہرے؛ نہ زبان میں لچک محسوس ہوگی' نہ گفتار میں وہ شیرینی - کسی کے گھر پر جائیے تو وہ ٹانگیں پھیلائے ہوئے آرام کرسی پر دراز نظر آئے گا اور آپ کو اِس آرام کرسی کے مقابل ایک تکلیف دہ

کرسی پر بیٹھنا پڑے گا ؛ آپ کو لب فرش تعظیم دے کر صدر میں جگہ دینا کیا معنی ، لیتے ہی لیتے اپنے پیروں کی سودھ میں ایک کرسی پر بیٹھ جانے کا اشارہ کر دیا جائے گا ، کسی محفل میں جائیے تو وہاں فرش ہی کا پتا نہیں ، میر فرش کا کیا ذکر ؟ اسکول کے طالب علموں کی طرح کرسیوں پر اہل محفل بیٹھتے ہیں اور تالیاں بجاتے ہیں ؛ حقے کے دور کے بجائے ہر منہ میں ایک سگریٹ دبی ہوئی نظر آتی ہے - یہ حال سیاسی اور سرکاری محفلوں ہی میں نہیں ہے بلکہ اب تو مشاعرے کی ایسی خالص ادبی محافل بھی کرسیوں کی نشست اور اسٹیج کے ساتھ منعقد ہوتی ہیں ، جہاں نہ کوئی دور ہوتا ہے نہ مقدم و موخر کی کوئی پابندی : نہ کسی آنے والے کو تعظیم دی جاتی ہے نہ کسی جانے والے سے خدا حافظ کہنے کی ضرورت سمجھی جاتی ہے ، نہ کسی کے آنے کی خوشی نہ کسی کے جانے کا غم ، مشاعرے کی بزم ہے مگر حاضرین کے اُٹھائے مصرعے تک نہیں اُٹھتے ، شاعر کے کلام کو سامعین اِس طرح خاموشی کے ساتھ سنتے ہیں گویا کسی پبلسٹی آفیسر کی گرام سدھار تقریر کو دیہاتی منہ کھولے اور آنکھیں پھاڑے ہوئے سن رہے ہیں - اگر کوئی شعر اتفاق سے کسی کی سمجھ میں آ گیا تو سبحان اللہ اور مکرر ارشاد کی جگہ تالی بجا دی جاتی ہے گویا یہ شعر نہیں ہوا ہے بلکہ مداری نے اپنے ہاتھ سے انڈا غائب کرکے اپنی ٹوپی سے برآمد کیا ہے یا اسٹیج پر آتش اشتیاق کو مشتعل کرنے کے لیے مس رتن بائی اپنا نغمہ نامکمل چھوڑ کر چلی گئی ہیں اور یہ "ونس مور" ہو رہا ہے - مشاعرے کی محفل کے اِس " تھیٹر پن " کو دیکھ کر کون یقین کر سکتا ہے کہ وہ لکھنؤ کے ایک مشاعرے میں شریک ہے - اور ایک ہی پر کیا منحصر ہے اب تو رفتہ رفتہ ہر محفل کا یہی حال ہوتا جاتا ہے اور وہ دن بھی قریب

ہے کہ محافلِ رقص و سرود میں رقاصہ میز پر ناچے گی اور حاضرین کرسیوں پر بیٹھ کر لطف اندوز ہوں گے -

اب بتائیے کہ لکھنؤ کو لکھنؤ کہنا لکھنؤ پر لکھنؤ ہونے کی تہمت لگانا ہے یا نہیں ؟ مگر اِس کے معنی یہ نہیں کہ لکھنؤ والے بدل گئے یا اُنہوں نے لکھنؤ کو بدل دیا ! بلکہ قصہ در اصل یہ ہے کہ لکھنؤ کا جو ماحول اب تیار ہو گیا ہے وہ ایک بنیادی غلطی کا نتیجہ ہے - اگر لکھنؤ کو آباد کرنے والے شہر کے ناکوں پر اِس قسم کے پہرے بٹھا دیتے کہ باہر سے آنے والوں کو شہر سے دور کسی جگہ ٹھہرایا جاتا اور اُن کو صرف اِسی قدر اجازت ہوتی کہ آؤ گھوم پھر کر یا اپنا کام کرکے واپس چلے جاؤ ' تو شاید آج لکھنؤ کا یہ حال نہ ہوتا - اُس پر طرہ یہ کہ ریل نے پشاور اور لکھنؤ ' ڈبروگڑھ اور لکھنؤ ' کٹمنڈو اور لکھنؤ ' بنگلور اور لکھنؤ میں " قدمے فاصلہ دارد " والی کیفیت پیدا کر دی ہے اور اب لکھنؤ کا حال یہ ہے کہ - ع

غریب خانہ ہے موجود ہر بلا کے لئے

جس کا جہاں سے جی چاہتا ہے لکھنؤ پر آکر قبضہ کر لیتا ہے اور خود لکھنؤ والے لکھنؤ سے نکل کر جہاں کہیں جی چاہتا ہے چلے جاتے ہیں - حد یہ ہے کہ اب تو لکھنؤ کے مستند خاندانوں میں یہ حال ہے ماں سہسرام کی اور باپ لکھنؤ کا ' خالو پونا کا اور بھانجا لکھنؤ کا ' بیٹی مرادآباد کی اور داماد لکھنؤ کا - اِس کھچڑی نے اور بھی لکھنؤ کی مٹی پلید کر دی ہے اور اب لکھنؤ کا حال اُس ترکاری منڈی کا ہے جس میں مرچ بھی ملتی ہے اور کدو بھی ' بینگن بھی نظر آتا ہے اور ٹماٹر بھی - اِس بین الاقوامی کیفیت کے بعد لکھنؤ میں آکر لکھنؤ کو ڈھونڈھنا ستم ظریفی نہیں تو اور کیا ہے ؟ اب تو یہاں کنکوے اُڑانے والے غدارے

اُڑاتے ہیں، مرغ لڑانے والے گرے ہاؤنڈ ریس میں مصروف ہیں، بٹور ہر وقت ہاتھ میں رکھنے والے ٹینس کے بلے لیے ہوئے نظر آتے ہیں، شطرنج اور گنجفے کی محفلوں میں برج اور بکٹیل نظر آتا ہے، گلوریاں کھانے والے بھوپالی گٹکا شاہجہاں پوری بٹوؤں میں رکھ کر پھانکتے ہیں اور گھروں میں اگر سلگانے والے فنائل سے شوق فرماتے ہیں -

باہر سے آنے والے لکھنؤ اور کلکتے کی چہل پہل میں کوئی فرق نہ پا کر حیران ہوتے ہیں : تو اُن کو لکھنؤ کی سیر اِس طرح کرائی جاتی ہے کہ یہ قیصر باغ ہے یہاں یہ ہوتا تھا اور یہ حسین آباد ہے یہاں یہ ہوتا تھا، یہ چوک ہے یہاں پہلے یہ عمارتیں تھیں اور یہ حضرت گنج تھا اِس کی ترتیب پہلے یہ تھی - گویا اب لکھنؤ بجائے خود لکھنؤ نہیں رہا ہے بلکہ لکھنؤے مرحوم کا ایک قبرستان ہے جو اُسی نام سے موسوم ہے اور جہاں زائرین اب محض فاتحہ خوانی اور اشک افشانی کے لیے آتے ہیں -

(اپریل ۱۹۳۷ء)

پروفیسر عبدالباسط

عربوں میں شادی کے رسم و رواج

[ملک شام کے ایک مشہور پادری الخوری پالس ، نے عربی میں ایک کتاب عوائدالعرب کے نام سے لکھی ھے - مصنف نے جو حوران اور شرق اردن کا متعدد بار سفر کرچکے تھے وھاں کے لوگوں کی طرز بود و باش اور معاشرت وتمدن پر بہت سے مضمون لکھے جو مختلف اوقات میں شہر حریصا کے ماھانہ رسالے "المسرة" میں شائع ھوتے رھے تھے - اب یہ مقالے ایک کتاب کی صورت میں شائع ھوگئے ھیں اور حسن اتفاق سے اس کتاب کا ایک نسخہ برلن سے مجھے دستیاب ھوگیا ھے - ذیل کا مضمون اس کے ایک حصے کا ترجمہ ھے - عبدالباسط]

عربوں کے تمام قبیلوں میں شادی کا رواج عام ھوتا ھے چنانچہ کوئی شخص بھی تجرد کی زندگی بسر کرنے کا عادی نہیں ھوتا - سوائے اُن چند شخصوں کے جو کسی مجبوری یا شادی کے لازمی جز مہر کے ادا کرنے سے بوجہ تنگدستی یا ناداری کے شادی نہ کرسکیں - عرب جب اپنی نوجوانی کی عمر کو پہنچتا ھے تو وہ اپنے لئے ایک رفیقۂ حیات کا انتخاب کرچکتا ھے جو اس کو روزمرہ کے کام میں بڑی مدد دیتی ھے اور گھر کا تمام انتظام بھی کرتی ھے - غیر شادی شدہ مرد اور عورت بہت بری نگاہ سے دیکھے جاتے ھیں اور تمام عمر شادی نہ کرنے کی قسم کھا لینا سوائے عیسائیوں کے عربوں میں کسی اور جگہ نہیں ھوتا - یہی وجہ ھے کہ وھاں شرع و ناموس کے خلاف اگر کوئی بات سرزد ھوجائے تو اس کی بہت سخت سزا دی جاتی ھے - اس لئے اخلاق کے اعتبار سے اُن لوگوں کا درجہ بہت بلند ھوتا ھے - اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ھے کہ وہ لوگ شادی بیاہ کرنے میں بہت جلدی کرتے ھیں - کسی

کسی رشتہ‌دار یا دوست کو بھیجتا ہے جو لڑکی کے والدین کے پاس جاکر پیغام پہنچاتا ہے اور مہر کی مقدار دلہن والوں سے طے کرتا ہے۔ اس مہر کا نام اُن کی اصطلاح میں "سیاق" یا "فید" ہے۔ "سیاق" بلقاء کی زبان میں اور "فید" حوران کی زبان میں بولا جاتا ہے۔ لیکن عام طور پر جزیرہ کے سب بدو عرب بھی ان الفاظ سے بخوبی واقف ہیں۔ لڑکی کا باپ اگر اس لڑکے سے اپنی لڑکی کی شادی کرنے پر راضی ہو جاتا ہے تو پھر مہر کے بارے میں بہت طویل گفت و شنید کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ باپ اکثر اپنے بھائی یا بیوی وغیرہ سے مشورہ لئے بغیر بھی رضامندی کا اظہار کر دیتا ہے لیکن جب مہر کے تصفیے کے متعلق گفتگو شروع ہوتی ہے تو آپس میں لڑکی کی ماں، اُس کے بھائی چچا، ماموں اور دوسرے قریبی رشتہ‌دار سب حصہ لیتے ہیں اور شیخ قبیلہ بھی ضرور اس میں شرکت کرتا ہے۔ جو لوگ اس میں شریک ہوتے ہیں ان کو بھی اس مہر سے کچھ نہ کچھ حصہ ضرور ملتا ہے لیکن جس لڑکی کے بارے میں یہ سب کچھ ہوتا ہے خود اُس کو بہت کم واقعات کا پتا دیا جاتا ہے۔ اور نہ اس کی رائے لی جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان حالات میں لڑکی کی حیثیت بالکل ایک تجارتی سامان کی سی ہوتی ہے جس کی قیمت کے بارے میں سوداگر اور خریداروں میں جھگڑا ہوتا ہے۔ لڑکی کی قیمت کے گھٹنے یا بڑھنے کا مدار اس کی خوبصورتی۔ خاندانی شرافت، کام کاج میں ہوشیاری۔ مصائب برداشت کرنے کی اہلیت، گھوڑے کی سواری۔ جنگ میں بہادری اور اس قسم کی دوسری صفات پر مبنی ہوتی ہے جو اُن خانہ‌بدوش لڑکیوں کا طرۂ امتیاز سمجھی جاتی ہیں۔

کبھی کبھی بہت ہی کمسن بچی کی منگنی کسی ہم عمر بچے کے ساتھ کردی جاتی ہے اِس غرض کے لئے بچی کا باپ ایک خاص قسم کی گھاس جس کو 'فصالہ' کہتے ہیں ہاتھ میں لے کر بچے کے باپ کو دیتا ہے اور یہ منگنی ہو جانے کی نشانی سمجھی جاتی ہے۔ اس کے بعد کسی ٹوپی یا رومال میں ایک گرہ اس عہد کی یادگار یا توثیق کے طور پر لگادی جا[illegible]

لڑکی سب بھائیوں کے عقد میں اس صورت سے رہی کہ اس کو مسلسل بھ۔ بھائیوں سے طلاق ملتی رہی اور دوسرا بھائی اس کو اپنے عقد میں لیتا گیا یہاں تک کہ سب سے چھوٹے بھائی کے عقد میں آگئی۔

ایک مرتبہ ایسا واقعہ بھی پیش آیا کہ چچا نے اپنی بیٹی کو اپنے بھتیجے کے عقد میں دینے سے قطعی انکار کردیا اور دوسرے شخص سے بیاہ دیا تو بھتیجے نے لڑکی کو عین برات کے موقع پر جب کہ وہ عورتوں کے جھمگٹے میں گھوڑے پر بیٹھی اپنے شوہر کے گھر جارہی تھی بزور گھوڑے سے اُتار لیا اور لے جاکر اپنے گھر میں بند کردیا ۔ مجبوراً غریب چچا نے اس لڑکی کے شوہر کو اپنی چھوٹی لڑکی دیدی ۔ جس لڑکی کو اس طرح بزور اٹھاکر لایا جاتا ہے اس کو شادی میں مہر وغیرہ سے بھی محروم کر دیا جاتا ہے ۔ اس طرح کا واقعہ جس دلہن کے ساتھ پیش آجاتا ہے اس کو عرب کی اصطلاح میں "جبرہ" کہتے ہیں۔ چچا اور ماموں کی اولاد میں مناکحت کے اس رواج کی بنا پر شوہر کو ان کے یہاں 'ابن العم' (چچا کا بیٹا) اور زوجہ کو 'بنت العم' (چچا کی بیٹی) کہتے ہیں ۔ بیوی کو لوگ 'حلال' یعنی شرعا جائز یا مباح اور 'عرض' یعنی آبرو بھی کہتے ہیں۔ ان دونوں لفظوں میں جو لطیف اشارہ اُن کے معنوں کی طرف ہے وہ بالکل عیاں ہے ۔

مذکورہ بالا ازدواجی حقوق و قوانین کے علاوہ بھی عربوں کے یہاں اس مسئلہ میں بہت سی پابندیاں ہیں ۔ اگر کوئی اجنبی یا دور کا رشتہ دار کسی لڑکی کی خواستگاری کرے اور اُس لڑکی کا کوئی قریبی عزیز بھی اس کو مانگ رہا ہو تو اس دور کے عزیز یا اس اجنبی کو لڑکی ہرگز نہیں دی جائے گی ۔ اسی طرح کوئی شخص اپنی بیوی کے پہلے شوہر کی لڑکی سے نکاح نہیں کرسکتا و قس علی ہذا ۔ عیسائی عربوں کے ازدواجی رسم و رواج میں جو پابندیاں ہیں وہ اس سے بھی زیادہ سخت ہیں ۔

پیغام نکاح	کوئی لڑکا اگر ایسی لڑکی سے شادی چاہتا ہو جو اس کے قریبی رشتہ داروں میں سے نہیں ہے تو وہ اس کام کے لئے اپنے

کرنے کا اپنے آپ کو پہلا حقدار سمجھتا ہے چنانچہ کسی لڑکی کی شادی کسی غیر شخص سے اس وقت تک نہیں کی جاسکتی جب تک کہ اس کے ماموں اور چچا کے بیٹے اس سے شادی نہ کرنے کا اعلان نہ کردیں - اگر ان کی رضامندی حاصل کئے بغیر کسی اور شخص سے شادی کردی جائے تو ایسے جھگڑے پڑجاتے ہیں جن کا اثر تمام قبیلے یا شہر تک جاپہنچتا ہے - اگر چچا اپنی بیٹی دینے سے انکار کردے تو عموماً لڑکا قبیلہ کے شیخ کی مدد کا طالب گار ہوتا ہے تاکہ وہ اپنے اثر کو کام میں لاکر معاملے کو سلجھادے- اس کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ لڑکا پانچ اونٹ لے کر شیخ کے دروازے پر پہنچتا ہے اور اپنے چچا اور شیخ کو سنانے کی غرض سے کہتا ہے کہ "یہ میرے چچا کی بیٹی کے لئے ہیں کیوں کہ میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں" یہ سنکر چچا جواب دیتا ہے- "اپنا مال لے جاؤ ہمیں اس کی ضرورت نہیں" لڑکا پھر پانچ دن کے بعد چار اونٹ لے کر آتا ہے اور وہی بات دہراتا ہے جسے سنکر چچا وہی جواب دیتا ہے اور لڑکا واپس چلا جاتا ہے اور پانچ دن بعد تین اونٹ لیکر واپس ہوتا ہے اور وہی بات کہتا ہے چچا اُس کا پھر وہی جواب دیتا ہے لڑکا واپس چلا جاتا ہے اور پھر پانچ روز کے بعد دو اونٹ لیکر حاضر ہوتا ہے اور وہی بات دہراتا ہے اس طرح یہ نوبت آجاتی ہے کہ آخر میں لڑکا صرف ایک اونٹ لے کر وہاں جاتا ہے اور اگر پھر بھی چچا لڑکی دینے کا وعدہ نہ کرے تو وہ احتجاج کے طور پر اس کے سامنے ایک بکری ذبح کرکے ڈال دیتا ہے اور چچا کو مخاطب کرکے کہتا ہے کہ "یہ قربانی لڑکی کے لئے ہے" اِس کے بعد لڑکا گھر میں گھس کر لڑکی کو اٹھا لے جاتا ہے- اور اُسے اپنے گھر لے جاکر بغیر کسی مہر کے اور بغیر کوئی رسم ادا کئے اس سے شادی کر لیتا ہے- یہ رواج عام طور پر نہیں پایا جاتا بلکہ صرف چند مخصوص قبیلوں میں رائج ہے-

چچا کی بیٹی سے شادی کا حق بڑے بھائی سے لیکر سب سے چھوٹے بھائی تک علی الترتیب پہنچتا ہے- چنانچہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک ہی

ہے- جب دونوں بچے بڑے ہوکر سن بلوغ کو پہنچ جاتے ہیں تو اُن کی باقاعدہ
شادی کردی جاتی ہے -

مہر کبھی تو سکۂ رائج الوقت میں ادا کیا جاتا ہے اور کبھی اونٹ
بھیڑ - گائے زمین - اصیل گھوڑی - ملے - کپڑے یا ہتھیاروں کی شکل میں
ہوتا ہے - مہر میں ادا کی جانے والی مذکورۂ بالا اشیا کی قیمت سو لیرہ (1)
تک پہنچ جاتی ہے - اور بعض حالات میں اس سے بھی زیادہ -

مہر ، نکاح کے وقت ، برات کی رات سے پہلے یا کسی اور مقرر وقت میں
ادا کیا جاتا ہے - اور کبھی لڑکے کو ایک سال یا اس سے بھی زیادہ مدت لڑکی
کے باپ کی خدمت کرکے معاوضہ میں وہ لڑکی حاصل ہو جاتی ہے - یہی
معاملہ حضرت یعقوب نے لابان کے ساتھ کیا تھا (دیکھو توریت ، کتاب
پیدائش باب ۲۹) - کبھی باپ اپنی بیٹی ایک قبیلے میں دے کر اس کے
بدلے میں اس قبیلے کی لڑکی بیاہ لاتا ہے -

پھر لڑکا اپنی ہونے والی دلہن کے گھر میں آکر ایک جانور ذبح کرتا ہے
جس کو وہ لوگ پیام نکاح کی قربانی کہتے ہیں - اس جانور کا گوشت پکایا
جاتا ہے اور سب رشتہ دار اور دوست احباب اس کو کھاتے ہیں - ان تمام
مرحلوں کو طے کرلے کے بعد لڑکا اپنی شادی کی تاریخ کا گن گن کر انتظار کرتا
ہے کیونکہ شادی کی تاریخ مقرر ہوجانے کے بعد اس لڑکی سے ملاقات نہ تو
تنہائی میں ہوسکتی ہے اور نہ کسی رشتہ دار کی موجودگی میں -
یہ رسم قدیم عربی رواج کے مطابق ہے جس میں کسی مرد کا کسی غیر
عورت سے خلا ملا رکھنا سخت معیوب سمجھا جاتا ہے - اگر کوئی عرب اپنی
بیٹی کو اس کے منگیتر سے شادی کے قبل ملتے جلتے دیکھ لے تو وہ بیٹی کو
فوراً نیزہ مار کر یا بندوق کی گولی کا نشانہ بنا کر مار ڈالتا تھا - کیونکہ
بیٹی کا یہ فعل اس کی خودداری کے خلاف سمجھا جاتا تھا -

شادی کی رسمیں دیہاتی عربوں میں شہریوں سے کسی قدر مختلف

---

(1) لیرہ ایک سکہ ہے جو کم و بیش دس آنے کے برابر ہوتا ہے -

عورت سے عصمت فروشي يا اس قبيل كي كوئي ادنی سي لغزش بھي ھو جاتي تو اُسے نہايت سخت اور الملاک سزا دی جاتی ھے - ان حالات میں اکثر عورت کو اپنے خاوند یا گھر کے قریبی رشتہ داروں کے ھاتھوں اپني زندگی سے ھاتھ دھونا پڑ جاتا ھے - یہي وجہ ھے کہ عرب کي عورتیں اپني عفت اور عصمت کي حفاظت پر مجبور ھوتي ھیں -

بیوی کا انتخاب رواج عام کي رو سے ماں باپ کرتے ھیں - عام طور پر یہ فریضہ باپ انجام دیتا ھے - چنانچہ قبیلہ کي لڑکیوں میں سے جس پر باپ کي نظر انتخاب پڑتی ھے اس کے متعلق وہ اپنے بیٹے کو اطلاع دے دیتا ھے کبھي خود بیٹا بھی اپنے لئے اُن لڑکیوں میں سے کسي ایک کا انتخاب کرکے اپنے والدین کو اطلاع کردیتا ھے - اور اگر والدین یا اور کسي قریبي رشتہ دار کو کوئي اعتراض نہیں ھوتا تو اُس لڑکي سے شادي ھو جاتی ھے شادي کے بارے میں خود لڑکیوں کو اپنا شوھر انتخاب کرنے کا بہت کم موقع دیا جاتا ھے - اکثر تو لڑکیوں کو دولہا کے گھر جاکرھي معلوم ھوتا ھے کہ اس کا شوھر کون ھے البتہ اس عورت کو جو بیوہ ھو یا مطلقہ ھو عموماً نئے شوھر کے انتخاب میں کچھ بولنے کا حق ھوتا ھے -

بعض حالات میں ایسا بھی ھوتا ھے کہ ھونے والے میاں اور بیوی میں پہلے سے تعارف ھو جاتا ھے اور یہ اکثر اُن چشموں پر ھو جایا کرتا ھے جہاں لڑکے شام کو اپنے مویشی کو پانی پلانے لاتے ھیں - اور لڑکیاں اپنی اپنی صراحیاں اور گھڑے بھرنے آ جایا کرتي ھیں - وھاں روزانہ ایک دوسرے کو دیکھنے کا موقع ملتا ھے اور پھر ان ملاقاتوں سے محبت بھی پیدا ھوجاتي ھے اور بالآخر دونوں شادي کرکے اس محبت کو مستحکم کرلیتے ھیں -

خانہ بدوشوں کی صحرائي زندگي میں آپس کي ملاقاتوں کے مواقع بہت حاصل ھوتے ھیں' اس لئے کہ وہ لوگ کھلی فضا میں زندگی بسر کرنے کے عادي ھوتے ھیں -

عربوں میں یہ رسم عام ھے کہ لڑکا اپنے ماموں یا چچا کي بیٹی سے شادي

ہوتی ہیں - اور ایک قبیلے کی رسموں سے دوسرے قبیلے کی رسموں میں فرق ہوتا ہے- اس لیے اب ہم حوران؟ بلقاء اور بعض خیمہ‌نشین عربوں کے ہاں کی رسموں کو الگ الگ بیان کرتے ہیں - ان میں اکثر باتیں وہ ہیں جن کو ہم نے بہ چشم خود دیکھا ہے اور بعض ایسی بھی ہیں جن کو معتبر لوگوں سے سنا گیا ہے -

حوران کے عیسائی قبائل کے رسم و رواج

شادی کے دن دولہا کے گھر اس کے نوعمر رشتہ دار جمع ہو جاتے ہیں اور اس پرمسرت تقریب کا افتتاح گانے بجانے سے کیا جاتا ہے - ان نوجوانوں میں سے ایک شخص بھر کے ایک کمرے میں چلا جاتا ہے اور وہ دولہا کو موسیقی اور راگ کے نغموں کی پرکیف فضا میں غسل کراتا ہے- دولہا کے ساتھ اور لوگ بھی غسل کرنے چلے جاتے ہیں لیکن ان میں غسل کرنے میں سبقت وہ شخص کرتا ہے جو کثیر الاولاد ہوتا ہے غسل کرنے کے بعد سب آنکھوں میں سرمہ لگاتے ہیں اور ہاتھ پاؤں میں عورتوں کی طرح مہندی لگاتے ہیں - بالوں کی لٹیں آگے کی طرف لٹکا لیتے ہیں اور دولہا کو نہایت نفیس لباس پہناتے ہیں اور ایک خوب آراستہ کئے ہوئے گھوڑے پر بٹھا کر جلوس نکالتے ہیں - جس میں سب چھوٹے بڑے شریک ہو کر گاتے ناچتے سارے شہر میں گشت کرتے ہیں -

گھوڑے کے آگے آگے دولہا کی کوئی رشتہ‌دار لڑکی مردانہ لباس میں تلوار کے کرتب دکھاتی چلتی ہے - اس سے آگے براتی لوگ گھوڑوں پر سوار ہوتے ہیں - جب اس طرح گشت کرتا ہوا یہ جلوس شہر کے کسی بڑے معزز شخص کے گھر کے سامنے سے گزرتا ہے تو نوعمر لڑکے تالیاں بجا بجا کر دحلہ دحلہ کے نعرے لگاتے ہیں جس کو سن کر گھر والی باہر نکل آتی ہے اور مٹھائی یا ملتی دولہا پر سے نچھاور کرکے اس گھوڑے کی گردن میں ایک ریشمی یا عمدہ سوتی رومال باندھ دیتی ہے- اس کے بعد جلوس اسی شان

شوکت کے ساتھ گشت پر چل نکلتا ہے اور آخر میں شہر سے باہر نکل کر کسی چھوٹے سے میدان میں کچھ دیر کے لئے پڑاؤ ڈال دیا جاتا ہے - وہاں دوڑ دوڑ شروع ہو جاتی ہے - پھر نشانہ‌بازی کا کھیل ہوتا ہے - اپنی اپنی بندوقوں سے نشانے لگاتے ہیں اور اس میں اپنا اپنا کمال دکھاتے ہیں -

ان دلچسپ مشاغل کے بعد جلوس پھر چل پڑتا ہے اور گانے بجانے اور خوشی و مسرت کے نعروں سے ساری فضا گونج جاتی ہے - اس کے بعد اسی شان و شوکت کے ساتھ گاؤں کا رخ کیا جاتا ہے اور گاؤں کے شیخ یا اس کے نائب کے در دولت پر جا کر سب ٹھہر جاتے ہیں وہاں پہلے ہی سے کھانا پکا پکایا تیار ہوتا ہے - جلوس والے جا کر کھانے پر بیٹھ جاتے ہیں - ادھر دلہن والے دلہن کو نہلا دھلا اور بنا سنوار کر شیخ کے گھر لے آتے ہیں اور وہاں نکاح پڑھا جاتا ہے اور عقد کے شرائط قلمبند کئے جاتے ہیں شادی اگر عیسائیوں کی ہے تو نکاح کے لئے گرجا چلے جاتے ہیں جہاں دلہن کے سامنے نماز اکلیل پڑھی جاتی ہے - دلہن اس وقت سر سے پیر تک ایک سفید براق چادر میں اس طرح ڈھکی ہوتی ہے کہ اس کا چہرہ یا کوئی اور حصۂ جسم نظر نہیں آتا - پادری پہلے دلہن سے پوچھتا ہے کہ اُسے فلاں شخص کے نکاح میں آنا منظور ہے - یہ سوال مذہبی حیثیت سے کیا جاتا ہے کیونکہ شریعت میں اس کا بڑا حکم ہے اور یہ امر ضروری بھی ہے کوئی دلہن بغیر اس کی مرضی کے کسی ایسے شخص سے نہ بیاہ دی جائے جس سے وہ رضامند نہ ہو - اسی وجہ سے پادری نماز اکلیل اس وقت تک شروع نہیں کرتا جب تک کہ دلہن کی طرف سے کم از کم کسی اشارے کنایے ہی سے اس کی رضامندی حاصل نہ کرے نکاح خوانی کے دوران میں بعض نچلے نہ بیٹھنے والے دولہا دلہن اور خود پادری صاحب کے موقع موقع سے سوئیاں چبھوتے رہتے ہیں تاکہ دولہا دلہن کو اپنی شادی سے اتنی بے پایاں مسرت نہ ہو جائے کہ جس کے بعد ان کو کسی مصیبت سے دوچار ہونا پڑے -

نکاح‌خوانی کے بعد دلہن کو دولہا کے گھر لے آتے ہیں اور اب اس مرحلے پر پہنچ کر شادی کی خوشیاں منانے کا زور گویا ختم ہوجاتا ہے -

گھر لاکر دلھن کو بیچ آنگن میں ایک بڑے چبوترے پر بٹھا دیتے ہیں
اور اس کے آس پاس دولھا کی قرابت دار عورتیں اور لڑکیاں بیٹھ جاتی ہیں
اور قہوے اور نقل کا دور چلتا ہے۔ ادھر دولھا کے دوست، احباب اور قرابت دار
گھر کے کسی اور حصے میں اس کے ارد گرد بیٹھے ہوتے ہیں۔ گرمیوں کا موسم
ہو تو صحن میں بیٹھتے ہیں۔ اس اثنا میں ذبح جانوروں کا گوشت ذبح ہو
اور پک کر تیار ہوجاتا ہے اور دعوت کا انتظام مکمل ہو چکتا ہے۔ دستر خوان
پر چاول یا دلئے کا ڈھیر ہوتا ہے اور جابجا مختلف قسموں کا گوشت
چنا ہوتا ہے جس میں سے ہر طرف سے گھی بہ بہ کر نکلتا نظر آتا ہے
دعوت میں شریک ہونے والے اس منظر کو دیکھ کر دولھا والوں کی سیر چشمی
اور فیاضی پر واہ واہ کرتے ہیں

کھانے سے فراغت پاکر سب لوگ پھر دولھا کے پاس بیٹھتے ہیں اور پھر
قہوے اور نقل کا دور چلنے لگتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد سب نوجوان اٹھ کھڑے
ہوتے ہیں اور ایک بڑے دائرے کی شکل میں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر
کھڑے ہوجاتے ہیں۔ دائرے کے بیچ میں ایک نوعمر لڑکا جو اچھا گانا جانتا ہے
کھڑا ہو کر اشعار گا گا کر پڑھتا ہے اور اس کے گرد ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے
ہوئے نوجوان گانے کے ساتھ ساتھ مردانہ ناچ شروع کر دیتے ہیں۔ اس خاص
قسم کے ناچ کو وہ لوگ "بکہ" کہتے ہیں۔ دیکھنے والوں کو نظر آتا ہے کہ وہ
سب نوجوان ایک ساتھ پیچھے جھکتے ہیں کبھی دائیں بائیں اور کبھی ایک
دو قدم آگے بڑھاتے ہیں۔ ان کی ہر ہر حرکت جچی تلی اور ایک خاص
انداز کی ہوتی ہے۔ اور اس منظر سے دیکھنے والوں پر عجیب کیفیت طاری
ہو جاتی ہے کبھی کبھی نوجوانوں کے اس دائرے میں کوئی لڑکی کھڑی ہو
جاتی ہے جو ننگی تلوار لے کر رقص کرتی ہے یا ایک ریشمی رومال ہاتھ
میں رکھ کر ناچتی ہے اور اس کے ارد گرد نوجوان اس کی اداؤں پر تالیاں
بجا بجا کر اور طبلے کی تھاپ پر گا گا کر اس کو داد دیتے جاتے ہیں۔

لیکن عورتوں اور مردوں کا یہ باہمی رقص و سرود بعض پادریوں نے اپنے

خاص فرقوں کے لئے ممنوع قرار دیا ھے -

رقص و سرود کے ان گانوں میں بالعموم غم انگیز اور دردناک مضامین ہوتے ھیں جن میں دنیا کی بےثباتی - موت اور اس کی ہولناکیوں کا بیان ہوتا ھے۔ یہ بات تعجب سے دیکھی جائے گی کہ عرب لوگ خوشی کے موقعوں پر ایسے المناک اشعار کیوں پسند کرتے ھیں - لیکن جو لوگ عربوں کی فطرت میں سنجیدگی اور متانت سے واقف ھیں ان کو اس پر تعجب نہ ہوگا - اس لئے کہ کتنی ہی دلچسپیاں کیوں نہ جاری ہوں عرب اپنی متانت اور سنجیدگی کو کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتا - ایسے گانے جن میں عیش پسندی اور بےراہ‌روی ہو عربوں کے یہاں نسبتاً بہت کم ملتے ھیں -

اس جلسہ میں کبھی تو قہوہ کا دور چلتا ھے اور کبھی تلقل شروع ہو جاتا ھے اور گانا بجانا بھی موقع موقع سے ہوتا رہتا ھے - ان تمام دلچسپیوں کے ساتھ آدھی رات تک جماؤ رہتا ھے اس رتجگے کا نام ان کے یہاں "سہجہ" یا سہجۃ" ھے دوسرے دن دولہا دلہن کو سب مبارکباد دینے کو آتے ھیں اور تحفے میں بالعموم کھانے کی چیزیں لاتے ھیں ان تحائف کو "نوار" کہتے ھیں- شادی کی رسمیں اور ان کی دلچسپیاں اور یہ رتجگے متواتر سات دن تک ہوتے رہتے ھیں اور ان پر بہت کچھ صرف ہوتا ھے -

رومن کیتھولک فرقے کے بعض پادریوں نے ۱۹۱۱ع میں اس ساری تقریب کے لئے صرف تین دن کی مدت مقرر کردی ھے -

بلقاء والوں کے رسم و رواج | شادی کی رسموں میں حورانی اور بلقاء کے رسم و رواج میں تھوڑا سا اختلاف پایا جاتا ھے -

عیسائیوں میں شادی عام طور پر اتوار ہی کے دن ہوتی ھے - شادی کے ایک ایک ہفتہ قبل سے دولہا کے دوست احباب اور عزیز اقارب اس کے گھر آ کر جمع ہو جاتے ھیں - اور رقص سرود کی محفلیں گرم رہتی ھیں - ان میں جو "دبکہ" یعنی ناچ ہوتا ھے وہ ایک خاص قسم کے ڈھول کی آواز پر ناچا جاتا ھے - ان محفلوں میں دولہا کی رشتہ‌دار لڑکیوں میں سے کوئی لڑکی

مردانہ لباس پہن کر تلوار کے کرتب دکھاتی ہے - بعض مرتبہ یہ لڑکی تلوا
یہ کرتب دکھاتی ہے - اس کو اِن کی زبان میں "حاشی" کہتے ہیں
کبھی اس لڑکی کے ساتھ کوئی دوسری لڑکی بھی اس قسم کے کرتب دکھاتی ہے
تو اس کو "عزب" کہتے ہیں - یہ عموماً پورے ہتھیاروں سے مسلح ہوکر
اپنی شمشیرزنی کی نمائش کرتی ہے - جمعہ کے روز دولہا کے گھر والے
تقریباً بیس جانور جمع کرکے چند آدمیوں کو ان کے ساتھ کرکے لکڑیاں
جمع کرنے بھیجتے ہیں - یہ لوگ جب لکڑیاں لاد کر واپس لوٹتے ہیں تو
دولہا کے باپ کی طرف سے ان کا استقبال گانے بجانے کے ساتھ کیا جاتا ہے
اور جو کھانے ان کے لئے تیار ہوئے ہیں - سب مل کر اس کو کھاتے ہیں
اس کے بعد سب اپنے اپنے گھر واپس چلے جاتے ہیں - ان لوگوں کو دولہا کے باپ
کی طرف سے ہر جانور پر تین تین لکڑیاں بطور تحفے کے دی جاتی ہیں
سنیچر کے دن رتجگا ہوتا ہے۔ اور دولہا دلہن اور ان کے گھر والوں کے مہندی
لگانے کی رسم ادا کی جاتی ہے۔ اتوار کے دن یہ مہندی چھڑا دی جاتی ہے
اور نہانے کے لئے پانی گرم کیا جاتا ہے۔ دولہا کے ساتھ اس کے دوست احباب
بھی نہاتے ہیں لیکن نہانے میں پہل وہ شخص کرتا ہے جس کی
اولاد سب سے زیادہ ہوتی ہے کیوں کہ وہ اس کو نیک شگون خیال کرتے ہیں
اس کے بعد دولہا کو شادی کا جوڑا پہنایا جاتا ہے اور وہ گھوڑے پر سوار ہوکر
گانے بجانے ڈھولوں اور بندوقوں کی آوازوں اور شور و شغب کے ساتھ گرجا کا رخ
کرتا ہے۔ وہاں نکاح خوانی ہوتی ہے۔ عورتیں ایک لمبی لکڑی لاتی ہیں اور
اس پر دلہن کا وہ جوڑا اور تمام ساز و سامان لٹکا دیا جاتا ہے جو
دولہا کی طرف سے دلہن کو دیا جاتا ہے۔ اس لکڑی کو دولہا کی رشتہ دار
عورتوں میں سے کوئی عورت اٹھا کر چلتی ہے اور اس کے پیچھے پیچھے لڑکیوں
اور عورتوں کی بڑی بھیڑ ہوتی ہے یہ تین تین چار چار مل کر اپنی ڈولیاں
بنا لیتی ہیں اور وہ عبا اوڑھ لیتی ہیں جو دولہا کی طرف سے دلہن کے
رشتہ دار عورتوں کو تحفے میں ملتا ہے یہ عورتیں اس عبا میں لپٹی ہوئی

ایک چلتا پھرتا گنبد سا معلوم ہوتی ہیں - یہ تمام راستے برات کے ساتھ ساتھ دولہا دلہن کے متعلق گیت گاتی جاتی ہیں - جب راستے میں شیخ کا گھر پڑتا ہے یا خوری کا مکان آجاتا ہے یا عمائدین شہر میں سے کسی اور شخص کا مکان ملتا ہے تو کچھ دیر کے لئے وہاں ٹھہر جاتی ہیں اور پادری کے گھر کے سامنے کھڑے ہوکر " سہرا " گاتی ہیں جس میں یہ الفاظ بھی آتے ہیں :-

" ابلغوا للخوری فی السماط علیہ لو لو لو " اس طرح جلوس کی شکل میں یہ عورتیں دلہن کے گھر جا پہنچتی ہیں اور جو کپڑے دولہا کے یہاں سے اس کے لئے ساتھ لاتی ہیں وہ اس کو نہلا دھلا کر پہنا دیتی ہیں پھر اس کو ایک شاندار گھوڑے پر بٹھا کر گرجا میں لے جاتی ہیں وہاں دولہا دلہن کا نکاح ہوتا ہے- پھر ان سب مرحلوں کے بعد یہ سارا مجمع دولہا کے گھر واپس آجاتا ہے اور وہاں مسرت و شادمانی اور مختلف دلچسپیوں کا سامان شروع ہو جاتا ہے- جب دلہن دولہا کے گھر پر پہنچتی ہے تو دروازے پر اس کو تھوڑا سا گندھا ہوا آٹا دیا جاتا ہے وہ اس کو لے کر دروازے پر لگا دیتی ہے اس ٹوٹکے کو وہ لوگ خوش‌حالی اور فارغ البالی کے لئے نیک شگون خیال کرتے ہیں دولہا کو زیتون کے درخت کی ایک ٹہنی لاکر دی جاتی ہے وہ اس کو اپنی تلوار سے کاٹ ڈالتا ہے اور اس ٹوٹکے کے ذریعے سے امن و سلامتی کی نیک فال لی جاتی ہے- کبھی دولہا اور دلہن دونوں کے قدموں میں انار کے دانے بکھیر دیے جاتے ہیں اور اس سے کثرت اولاد کے لئے نیک شگون لیا جاتا ہے یہ سب مراسم ادا کرنے کے بعد دونوں گھر کے اندر قدم رکھتے ہیں اور پھر ان کو صحن کے بیچ میں ایک چبوترے پر لاکر بٹھا دیا جاتا ہے- ان کے ارد گرد عورتوں کا جمگھٹ ہو جاتا ہے- مرد گھر کے باہر ٹھہر جاتے ہیں یا چھتوں پر چڑھ جاتے ہیں - تھوڑی دیر وہاں بیٹھنے کے بعد دولہا اٹھکر پھر مردوں میں چلا جاتا ہے- اس کے بعد شادی کا کھانا سب لوگوں کے سامنے چن دیا جاتا ہے- کھانے میں گوشت چاول اور دوسرے مرغن کھانے ہوتے ہیں کھانا کھانے سے فراغت کے بعد دولہا کو حاضرین میں سے بطور سلامی کچھ رقم نقد دیتے ہیں - یہ رقم [illegible]

ایک لیرہ یعنی تقریباً ایک اشرفی کے بقدر رہو جاتی ھیں - اس کے بعد دولہا اور دلہن دونوں یکجا ھوکر اس چبوترے پر آکر بیٹھ جاتے ھیں -

پھر تمام حاضرین اٹھ آتے ھیں اور دولہا کو کمرے میں تنہا چھوڑ دیا جاتا ھے پھر ایک خوبصورت بکری لائی جاتی ھے- دولہا اس بکری کو دلہن کے سامنے ذبح کرتا ہے اور دلہن کو اس بکری پر ہاتھ رکھے رہنا پڑتا ھے- دولہا بکری کا خون لیکر گھر کے دروازے اور دونوں چوکھٹوں پر مل دیتا ھے اور اپنی بیوی کے سینے اور پیشانی پر بھی لگا دیتا ھے۔ اس قربانی کو ذبیحۃ الدلہ یعنی شادی کی قربانی کہا جاتا ھے-

بعض مرتبہ یہ قربانی دروازے کے اوپر کی طرف چھت پر کی جاتی ھے تاکہ اس کا خون بہہ کر نیچے دونوں چوکھٹوں اور دروازے پر لگ جائے اس کے بعد سب اپنے اپنے گھروں کو واپس چلے جاتے ھیں اگلے روز علی الصبح دلہن کے گھر والے ناشتہ لیکر آتے ھیں، یہ ناشتہ روٹی گھی اور شکر سے ملاکر تیار کیا جاتا ھے جس کو وہ اذاقیات یعنی عمیدہ کہتے ھیں - دولہا دلہن باھر نکل آتے ھیں اور اس ناشتے میں دونوں مل کر شرکت کرتے ھیں -

دلہن اس موقع پر اپنا عبا اپنی ماں کو دیدیتی ھے اور پھر مبارکباد دینے والوں کی آمد و رفت شروع ہو جاتی ھے- یہ آنے والے اپنے ساتھ تحفے تحائف بھی لاتے ھیں - جو عام طور پر جانوروں مثلاً بھیڑوں بکریوں کی شکل میں ہوتے ھیں - ان کا مقصد یہ ھوتا ھے کہ شادی کی رسموں کے دوران میں ان کا گوشت پکایا جائے- ان قربانی کے جانوروں کو 'قری العریس' یعنی دولہا کی دعوت کے نام سے موسوم کیا جاتا ھے-

یہ شادی کی رسمیں تقریباً ایک ھفتہ تک جاری رہتی ھیں - ھر شام سے رتجگا شروع ہو جاتا ھے- اور مراسم کے دوران میں وہاں کا پادری برابر ساتھ رہتا ھے جو دولہا اور دلہن کو ان رسموں کے طور طریقے سمجھاتا اور بتاتا رہتا ھے- ان موقعوں پر اگر دولہا دلہن میں کوئی بھی کسی قسم کی غلطی کر دیے تو پادری کو اختیار ہوتا ھے کہ اپنی لکڑی سے انہیں

مار دے اور اگر کوئی شخص مبارک باد دینے والوں میں سے دولھا دلھن سے "تشریف رکھئے" نہ کہے تو وہی پادری اُس پر جرمانہ عائد کر دیتا ہے اور جرمانہ کی وہ رقم دولھا دلھن کو مل جاتی ہے کیونکہ ہر آنے والے کو تعظیم دینے کے لئے دولھا اور دلھن دونوں کو کھڑا ہونا پڑتا ہے اور آنے والا اس موقع پر کہتا ہے کہ آپ تشریف رکھئے '

یہ میعاد ختم ہونے پر دولھا کے عزیز و اقارب اگلے سات دن تک برابر دعوتیں کرتے رہتے ہیں ان دعوتوں میں صرف دولھا شریک ہوتا ہے اور دلھن گھر میں رہتی ہے جس کو وہیں کھانا بھیج دیا جاتا ہے بعض مرتبہ دلھن اس عرصہ میں اپنے میکے چلی جاتی ہے وہاں وہ اپنی طرف سے بہت بڑی دعوت کرتی ہے۔ اس کے بعد یہ تمام مراسم خوشی و مسرت کے ساتھ ختم ہوجاتے ہیں۔

بلقا والوں میں دلھن کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے میں عجیب و غریب رسمیں برتی جاتی ہیں جن کا ذکر یہاں دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

دولھن کو رخصت کرتے وقت ایک بڑے عمدہ اونٹ کو لایا جاتا ہے اور اس پر ایک بڑا محمل رکھا جاتا ہے جس میں چار لڑکیوں کے بیٹھنے کی جگہ ہوتی ہے۔ قبیلے کی نہایت خوبصورت اور خوش آواز لڑکیوں کو منتخب کرکے اس میں بٹھایا جاتا ہے۔ یہ اکثر دلھن کی رشتہ دار بھی ہوتی ہیں۔ قبیلہ کے چند سربرآوردہ اشخاص ہتھیاروں سے مسلح ہوکر نہایت نفیس گھوڑوں پر سوار ہوکر اس محمل کے آگے پیچھے ہو لیتے ہیں اور اس شان و شوکت سے یہ جلوس اس گاؤں میں پہنچتا ہے جہاں سے دلھن کو رخصت کرانا ہوتا ہے۔ یہ جلوس گاؤں کے باہر ٹھہر جاتا ہے وہاں پہلے اس محمل کے آگے جانوروں کی قربانی کی جاتی ہے۔ اور حسب دستور قہوہ تیار کیا جاتا ہے اور دلھن کے مہر میں سے جس کا ادا کرنا باقی ہوتا ہے از قسم مویشی یا لباس وغیرہ وہ اس وقت ادا کردیا جاتا ہے اور وہ رات اسی جگہ بسر کی جاتی ہے۔ اس کے بعد دلھن کو دولھا کے پاس پہنچانے کی تیاریاں شروع ہوجاتی ہیں۔

ھیں - اس وقت یہ دستور ہے کہ دلھن بھاگ کر دور کسی پہاڑ کی گھاٹی وغیرہ میں جا چھپتی ہے اس کی تلاش میں بڑا وقت صرف کیا جاتا ہے۔ بالآخر جب وہ مل جاتی ہے تو اس کو گھر لاکر نفیس پوشاک پہنا دیتے ھیں اس وقت وہ اپنے والدین کی رضامندی حاصل کرکے اس محمل میں جو تیار ہوتا ہے سوار ہوجاتی ہے۔ بعض مرتبہ بجائے محمل کے سجا ہوا گھوڑا بھی ہوتا ہے اس وقت گیتوں کی آواز اور شور و غل سے کان پڑی آواز نہیں آتی - آگے آگے سوار گھوڑوں پر دوڑتے ھیں بندوقوں کے ہوائی فیر بھی ہوتے جاتے ھیں اور اس طرح وہ جلوس روانہ ہوتا ہے۔

دوسری طرف قبیلہ کی عورتیں اور لڑکیاں جمع ہوکر دلھن پر زبردست حملہ کر دیتی ھیں اس پر پتھروں کی بوچھار ہوتی ھے پھر اس کو محمل سے گرا لیا جاتا ھے اور چوٹی پکڑ کر پتھریلی زمین پر گھسیٹا جاتا ہے۔ اس سب حرکت کا مدعا یہ ہوتا ہے کہ دلھن کہیں بھاگ نہ جائے - یہ بھی سنا گیا ہے کہ اس موقع پرہ دلھن کے بھائی بہن یا چچازاد بھائی کو لکڑیوں سے اس قدر مارا جاتا ہے کہ کبھی کبھی اس کا سر تک پھٹ جاتا ہے اور یہ وحشیانہ شوق بعض حالتوں میں دلھن کو اچھا خاصا مجروح کر دیتا ہے۔

بعض قبیلوں میں یہ دستور ہے کہ دولھا کے گھر والے دلھن کو اڑا لاتے ھیں اور وہ اس طرح دولھا دلھن کے بھائی سے ایک دن مقرر کر لیتا ھے اور اس دن دلھن کے گھر آکر گھر والوں کی بےخبری میں اسے اڑا لے جاتا ہے۔ اس کے بعد دلھن والوں میں اچھی خاصی جنگ ہوتی ہے اس کے بعد صلح ہوتی ہے صلح کے بعد دلھن جائز اور قانونی طور پر اس کی بیوی قرار پاتی ہے

یہ مخالفت کا مظاہرہ جب ختم ہو جاتا ہے تو پھر جلوس گانے بجانے ساتھ روانہ ہو جاتا ہے دلھن اپنے محمل میں واپس آکر بیٹھ جاتی ھے اور جب تک اس کی نظر کے سامنے اس کی بستی رہتی ھے وہ رومال ہلا ہلا کر اپنے عزیز و اقارب کو رخصت کرتی نظر آتی ھے۔

دولھن کے ساتھ اس کي چند رشتہ‌دار عورتیں ضرور جاتی ھیں اور یہ عموماً وھي عورتیں ھوتي ھیں جنھوں نے دلھن کو تحفے دئے ھوں۔ یہ تحفے اُون کي بني ھوئی رنگ برنگ کی مختلف تھیلیاں ھوتی ھیں جو اس غرض سے دي جاتي ھیں کہ دلھن ان میں اپنا جھیز وغیرہ رکھ لے ۔۔

یہ شادي کا جلوس جب کسي بستي کے قریب سے گذرتا ھے تو گانے بجانے کي آواز بلند ھو جاتي ھے اور گھوڑوں کي دوڑ اور بندوقوں کے چلنے کي آوازیں زیادہ زور سے ھونے لگتي ھیں -

بعض مرتبہ یہاں کي عورتیں بھي پہلے کی طرح حملہ کر بیٹھتی ھیں لیکن یہاں کے لوگ فوراً اس حملہ سے باز رکھنے کي کوشش کرتے ھیں - اس طرح اس برات کا جلوس دلھن کو رخصتی کراکر جب دولھا کے اپنے گاؤں یا قصبے میں پہنچتا ھے تو وھاں کي رنگ رلیوں اور دلچسپیوں کا کیا پوچھنا ھے- گاؤں سے عورتیں گاتي ھوئی مختلف ٹولیوں میں دلھن کے استقبال کو نکل آتی ھیں اور اس کو قبیلے کے ایک طرف لگے ھوئے خیمے میں اتارتی ھیں - یہ خیمہ علحدہ نصب کیا جاتا ھے اس لئے اس کو وہ لوگ اپني زبان میں برزہ یا خلہ کہتے ھیں -

یہان دولھا کے دوست احباب رشتہ‌دار پہلے سے ھي جمع ھوتے ھیں وہ لوگ اپنے ساتھ تحفے تحائف بھی لاتے ھیں جو عموماً بھیڑ بکریوں کی صورت میں ھوتے ھیں اس کے بعد شادی کی خوشیوں کي ابتدا ھو جاني ھے جس کا نام ان کے یہاں "تري" ھے

پہلے میدان میں گھوڑ دوڑ شروع ھوتي ھے پھر رقص ' جس میں صیقل شدہ چمکدار تلواروں سے کرتب دکھائے جاتے ھیں - اس میں عموماً ایک لڑکی مردانہ کپڑے پہن کر کسی لڑکے کے ساتھ جو اپنے ھاتھ میں ڈھال اور تلوار لئے ھوتا ھے شمشیر زني کے کرتب دکھاتي ھے آس پاس کا مجمع اس لڑکي کي ھمت بڑھانے کے لیے گیت گاتا رھتا ھے- خاص خاص موقعوں پر تالیاں بھي بجائي جاتي ھیں - اگر اس تماشے میں مقابل کا لڑکا جیت جاے تو اس جیت کو

لڑکي کے سر پر ھاتھ رکھکر ظاھر کرتا ھے۔ لیکن اگر لڑکي جیت جاوے تو اسے اختیار ھوتا ھے کہ وہ ھارے ھوئے لڑکے کو تلوار سے مارے خواہ اس کے زخم ھی کیوں نہ آجائیں - عام طور پر لڑکي ھی غالب رھتی ھے اور جیتنے والي سمجھي جاتي ھے اور اس کا مقابل مغلوب ھو جایا کرتا ھے -

کبھي کبھي اس تماشے مین بجائے کسي لڑکے کے کوئی بہت ھي عمر رسیدہ بوڑھا آدمی اس لڑکي کے مقابلے پر آجاتا ھے اور اپنے آپ کو اس وقت بطور مذاق کے " اشھب ظھر " یا " صغرالذیاب " کھتا ھے - یہہ لفظ دراصل ایسے اونٹ کی صفات کے لئے استعمال ھوتے ھیں جس پر کوئي بڑا سردار یا کسی ڈکیتی کي قسم کا رھنما سوار ھوکر چلتا ھے اور کبھی نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے باھمي رقص و سرود میں بوڑھے بھي شریک ھوکر بازي لے جانے کی کوشش کرتے ھیں اور ایسي ناواجب اور غیر سنجیدہ حرکات کرتے ھیں جو اُن کي عمر کے لحاظ سے بہت نامناسب ھوتي ھیں تالیاں بجاتے بجاتے ھاتھوں میں خون چمک آتا ھے اور اس سے ھاتھ تک رنگین ھوجاتے ھیں جب یہاں تک نوبت پہنچ جاتی ھے تو پھر سینہ کوبی کرنے لگتے ھیں تاکہ شور زیادہ پیدا ھو - عورتیں مردوں سے الگ رھتي ھیں یہ نہایت بیش قیمت بھڑکدار لباس سے مزین ھوتی ھیں اور ایک کھیل کھیلتي ھیں جس کو " شلاغیذی " کہا جاتا ھے یعنی ایک گول دائرہ بنا کر دوسرے کا ھاتھ پکڑ کر کھڑي ھو جاتي ھیں اور اُن میں سے ایک درمیان میں کھڑی ھوکر دولھا - دلھن اور شیخ اور مجلس کے ممتاز حاضرین کي تعریف میں اشعار گاتي ھے اور باقي سب اس کی آواز میں آواز ملاتی رھتی ھیں -

اس عرصے میں دلھن موقع پا کر خیمے سے نکل بھاگتی ھے اور دور جنگل مین جاکر کہیں جا چھپتي ھے پھر دولھا اس کو ڈھونڈنے نکلتا ھے اور اس کو تلاش کر کے خیمے میں واپس لاتا ھے - دلھن کو موقع ملتا ھے تو وہ دوبارہ پھر یہي حرکت کرتي ھے - یہ حرکت دراصل دلھن اپنی شادي کي شرم و حیا کی وجہ سے یا خاندانی روایات کی بنا پر

کرتي ہے - اگر کوئي دلهن یہ حرکت نہ کرے تو اس کو "مربوع" کہا جاتا ہے یعنی وہ عیش وعشرت کي دلدادہ ہے - دولہا دلهن اس طرح خیمے میں تین دن تک رہتے ہیں اس عرصے میں اُن کے پاس دوست احباب اور عزیز و اقارب آتے رہتے ہیں اور ساتھ میں کھانے پینے کی چیزیں بھي لاتے ہیں - ہر رات کو رتجگا ہوتا ہے -

تیسرا دن ختم ہوجانے پر میاں بیوي اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہوجاتے ہیں اور گویا شادي کي رسمیں ختم ہوجاتي ہیں -

دیہاتي عربوں میں شادي کے رواج

مذکورہ بالا بیانات تقریباً دیہات اور قصبات میں رہنے والے عربوں کے متعلق بھي کچھ کمی بیشي کے ساتھ صادق آ سکتے ہیں لیکن تهیٹ بدو عرب اپني شادیوں کے موقعوں پر اس قسم کي رسومات نہیں کرتے - بلکہ بعض تو ایسي باتوں کو نہایت شرمناک اور لغو خیال کرتے ہیں ان کے یہاں شادي کي بات چیت ختم ہو جانے پر شیخ یا خطیب کے سامنے جاکر مہر اور نکاح وغیرہ کي شرائط لکھ لي جاتي ہیں- دلهن اپني قرابت دار عورتوں کي معیت میں دولہا کے گھر آجاتي ہے اس وقت اونٹ یا بکري حسب توفیق ذبح کرکے اس کا گوشت کچا ہی حاضرین میں تقسیم کر دیا جاتا ہے اس کے بعد دولہا اور دلهن دونوں یکجا ہو جاتے ہیں اور دوسرے ہي روز سے گھر کے روزانہ کام کاج میں مصروف ہوجاتے ہیں -

چنانچہ عنزہ اور رواۃ کے عرب بدو شادي کے مراسم کو بالکل مہمل اور لغو سمجھتے ہیں ان کے یہاں کا مقولہ ہے کہ شادي بہت مختصر اور آسان چیز ہے جس کو وہ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں :— "اذبح جدیک و اعبر حای" یعني دلهن کے نام پر بکري حلال کرو اور اپنے خیمہ میں چلے جاؤ - لیجئے شادي ختم ہوئي -

بعض اور مقامات کے رسم و رواج

مقام صخور کے عربوں کے یہاں یہ دستور ہے کہ لڑکی کے نکاح سے پہلے کوئی اس کا وکیل مقرر کر لیا جاتا ہے یہ وکیل عموماً اس کا بھائی یا باپ ہوتا ہے اور سب کے سامنے لڑکی سے پوچھا جاتا ہے کیا فلاں شخص کو تم نے اپنے نکاح کے متعلق اپنا وکیل مقرر کیا؟ لڑکی جواب دیتی ہے " ہاں بیشک فلاں شخص کو میں نے اپنا وکیل مقرر کیا - پھر یہ وکیل جاکر نکاح خوانی میں لڑکی کی طرف سے شرائط قبول کر لیتا ہے - ان لوگوں میں یہ بھی رواج ہے کہ ہونے والا شوہر اپنی ہونے والی بیوی سے سب گھر والوں کے سامنے ان کے بیچ میں بیٹھ کر ملاقات کرتا ہے اور بات چیت کرکے اپنے گھر واپس چلا جاتا ہے - بعض مرتبہ دولھا کا گھر فاصلے پر ہوتا ہے اور وہ وہاں سے صرف اس غرض سے آتا ہے اور گفتگو کرکے واپس چلا جاتا ہے -

وہاں کے بعض عرب قبیلوں میں یہ دستور ہے کہ دولھا اور اس کا باپ گواہوں کے سامنے آکر ایک دوسرے سے ہم کلام ہوتے ہیں - باپ اپنے ہاتھ میں ایک مٹھی بھر گیہوں یا اس کی بجائے روٹی کا ٹکڑا یا اور کوئی کھانے کی چیز ہاتھ میں لے کر بیٹے سے کہتا ہے کہ تم نے فلاں لڑکی کو اللہ اور اس کے رسول کی شریعت کے مطابق نکاح میں قبول کیا؟ دولھا جواب میں کہتا ہے کہ میں نے قبول کیا اللہ بھی اس کو قبول کرے -

اس کے بعد وہ اپنے چچا کے ہاتھ سے کوئی کھانے کی چیز اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے پھر چچا اس سے کہتا ہے " خدا تم کو ہر برائی سے بچائے تم اپنی بیوی کو اس ارادہ سے بیوی بناؤ کہ اس کے ساتھ بھلائی اور نیکی کا سلوک کروگے اور اگر ضرورت پڑے تو طلاق دے کر علحدہ کردوگے - " اس رسم کے بعد دولھا دلہن کو یکجا کر دیا جاتا ہے بعض اطراف میں یہ دستور ہے کہ لڑکا اور لڑکی دونوں اپنی اپنی طرف سے دو وکیل مقرر کر دیتے ہیں اور یہ وکیل ہی دونوں ایک دوسرے سے آپس میں یہ قول و قرار کرتے ہیں کہ " مسماۃ فلاں بنت فلاں کو تم نے اپنے عقد میں حنیفہ بن نعمان کے مذہب

کے مطابق قبول کیا ؟ " دوسرا جواب دیتا ھے "۔ فلاں شخص کی فلاں لڑکی کو میں نے حنیفہ بن نعمان کے مذھب پر اپنے عقد میں قبول کیا " ۔ یہی بات تین مرتبہ دھرائی جاتی ھے اور اس پر نکاح خوانی ختم ھو جاتی ھے ۔ اور دلھن دولھا کے گھر بغیر کسی دھوم دھام کے خاموشی سے رخصت کردی جاتی ھے ۔

قبیلہ عنزہ ۔ نسیر ۔ اور قبیلہ عالی میں لڑکی اور لڑکا خود ھی اپنا نکاح آپ پڑھ لیتے ھیں اور یہ اس طرح کہ دونوں دولھا اور دلھن خطیب کے سامنے آکر ایک دوسرے کے سامنے دو جدا جدا پتھروں پر بیٹھ جاتے ھیں ۔ پہلے لڑکا کہتا ھے " میں ایک پتھر پر بیٹھا ھوں اور تم دوسرے پر ۔ اب میں مخلوق کے پیدا کرنے والے خالق کو گواہ کرکے تم سے پوچھتا ھوں کہ کیا تم نے مجھے اپنا شوھر اللہ اور اس کے رسول کی شریعت کے مطابق بنانا منظور کر لیا ۔ میں نے تم کو اپنی بیوی کی حیثیت سے قبول کر لیا ھے " ۔ لڑکی جواب میں کہتی ھے کہ " میں ایک پتھر پر بیٹھی ھوں اور تم دوسرے پر مجھے اب میں مخلوق کے پیدا کرنے والے گواہ خالق کو بناکر پوچھتی ھوں کہ کیا تم نے اللہ اور اس کے رسول کی شریعت کے مطابق قبول کیا ؟ لڑکا جواب دیتا ھے ھاں ' میں نے قبول کیا ' اس رسم کے بعد دونوں خیمہ میں چلے جاتے ھیں اور حاضرین اپنے اپنے گھر لوٹ جاتے ھیں ۔

عربوں میں بیوی کو بھگالے جانے کا دستور عام پایا جاتا ھے ۔ اس کا مقصد یہ ھوتا ھے کہ شادی پر زیادہ سے زیادہ پابندی عائد کی جائے ۔ اور آزادی کو ختم کر دیا جائے ۔ چنانچہ اگر کوئی نوجوان کسی لڑکی سے شادی کے لئے آمادہ ھو لیکن لڑکی کے رشتہ داروں کی طرف سے اس میں رکاوٹ ڈالی جا رھی ھو تو ایسی صورت میں لڑکا اپنے دوست و احباب اور بعض حالت میں لڑکی والوں میں سے چند آدمیوں سے سازباز کرکے ایک بار آکر لڑکی کو بھگا کر کسی با اثر آدمی یا کسی با سوخ شہری کے پاس لےجاتا ھے اور ان معاملات میں میں اس کی پناہ حاصل کی جاتی ھے وہ

عموماً اس قدر با اثر ہوتا ہے کہ اس کے رسوخ کی وجہ سے لڑکی والے اس لڑکے سے شادی سے انکار کرنے کی ہمت نہیں کرسکتے - کیونکہ اگر وہ اس با اثر شخص کو ناراض کردیں تو وہ ان کو طرح طرح کے نقصان پہنچا سکتا ہے اسی طرح اگر لڑکی کی شادی کسی ایسے شخص سے کی جانے والی ہو جہاں لڑکی کی رضامندی ہو تو یہ صورتیں وہ لڑکی خود اپنے آپ کو شادی سے بچانے کے لئے کسی شیخ یا اور بارسوخ شخص کی پناہ میں بھاگ جاتی ہے اور اس طرح اپنی خلاف مرضی شادی سے نجات پالیتی ہے - "

میاں بیوی کے تعلقات

شہروں اور "تہذیب جدید" سے کوسوں دور بسنے والے ان بدوی قبیلوں میں میاں بیوی کے آپس کے تعلقات بہت کم ایسی صورت اختیار کرتے ہیں جیسی کہ ہمیں شہری متمدن زندگی بسر کرنے والے میاں بیویوں کی زندگی میں آئے دن نظر آتے رہتے ہیں اور جن کی وجہ سے دونوں کی زندگی نہایت تلخ ہوجاتی ہے اس کے بر خلاف بدو میاں بیویوں میں آپس میں محبت اور اتفاق قائم رہتا ہے - ایک بدوی اور پرورش پانے والی عورت کے جسم پر سخت اور کرخت عبا کے نیچے نہایت نازک اور محبت کے جذبات بھرا ہوا دل ہوتا ہے جو ہمیشہ اپنے شوہر کی رضاجوئی کے لئے مائل رہتا ہے اسی طرح شوہر کو بھی ہمیشہ اپنی بیوی کی ہر مصیبت میں اپنی جان تک فدا کرنے میں کبھی دریغ نہیں ہوتا - اگر شوہر بیمار ہوجائے تو بیوی بڑے انہماک اور اطاعت شعاری سے اس کی تیمارداری کرتی ہے اور خواہ اس کا سلسلہ کئی سال تک طویل ہوجائے وہ اس کی تیمار داری سے کبھی نہ کسلمند ہوتی ہے اور نہ اکتاتی ہے اگر کبھی میاں بیوی میں سے کوئی اس قدر کمزور اور ناتوان ہو جائے کہ چل پھر نہ سکے اور نہ کسی اونٹ یا گھوڑے پر بیٹھ سکے تو دوسرا فوراً اس کو اپنے اوپر لاد کر ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچا دیتا ہے - جب کبھی کوئی بدو کسی سفر سے واپس آتا ہے یا کسی قریب کے قصبہ یا دیہات سے جاکر لوٹتا ہے یا کسی لوٹ مار یا

ڈکیتی کے سفر میں اسے فتح نصیب ہو تو واپس آتے ہوئے ہمیشہ بیوی کا خیال رکھتا ہے اور اس کے لئے کپڑے زیورات وغیرہ تحفہ لے کر آتا ہے -

البتہ یہہ ضرور ہے کہ شہری لوگوں اور متمدن دنیا کے مردوں کی طرح بدو کو اپنی عورتوں سے زیادہ لگاؤ نہیں ہوتا اور اس کی وجہ یہہ ہے کہ ان لوگوں کو اپنی اونٹ بھیڑ بکریاں چرانے اور زمین کی کاشت کرنے دوسرے لوگوں سے میل جول رکھنے یا لوٹ مار کرنے میں زیادہ وقت صرف کرنا پڑتا ہے اس لئے عورتوں میں بیٹھنے کی نوبت بہت کم آتی ہے بعض مرتبہ فطرت انسانی کی بنا پر گھر کے انتظام میں کوتاہی یا اور کسی وجہ سے میاں بیوی میں اختلاف رائے بھی ہوجاتا ہے اسی صورت میں شوہر بیوی کو ایک لفظ کہکر طلاق دے دیتا ہے - وہ اسی وقت گھر سے نکل کر اپنے رشتہداروں میں چلی جاتی ہے اپنے ساتھ گھر کی کوئی چیز نہیں لے جاتی یہاں تک اس کو اپنے بچے بھی ساتھ لے جانے کی اجازت نہیں ہوتی - شوہر جب تین مرتبہ طلاق کا کلمہ زبان سے کہدے تو پھر اس کو مکمل طلاق ہوجاتی ہے اور عورت کو دوسرے کے ساتھ نکاح کا حق ہوجاتا ہے اس وقت عورت کے ساتھ نکاح کرنے کا پہلا حق شوہر کے چھوٹے بھائی کو ہوتا ہے لیکن اس کے پہلے شوہر کو یہ اختیار رہتا ہے کہ وہ اگر چاہے تو اسی عورت سے پھر رجوع کرلے - طلاق کی سب سے بڑی وجہ عورت کی بدچلنی یا بانجھپن کو سمجھا جاتا ہے -

(اپریل، اکتوبر ۱۹۴۶ء)

حکیم سید شمس اللہ قادری
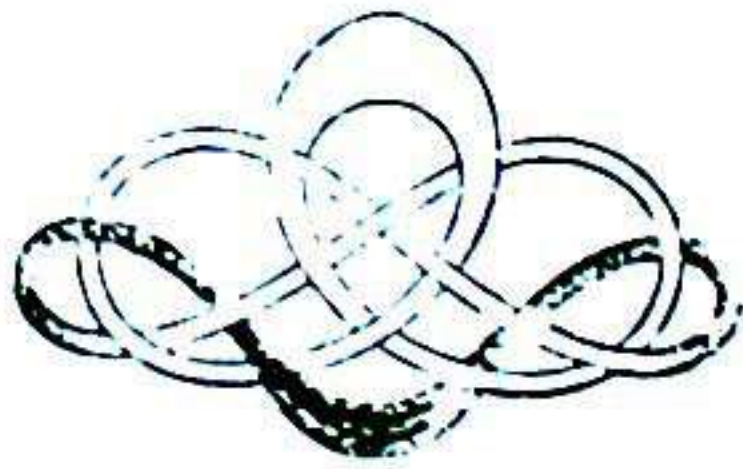
دنیائے اسلام کی پہلی تاریخی تصنیف

عبید بن شریۃ الجرہمی کی کتاب الملوک و اخبار الماضیین

کتاب الملوک، ایک نادر و نایاب اور عجوبۂ روزگار کتاب ہے؛ جو خاندانِ امویہ کے پہلے خلیفہ، حضرت معاویہ بن ابی سفیان (۴۰ھ — ۶۰ھ) کے اوائل عہد میں سنہ ۴۰ھ اور سنہ ۴۳ھ کے مابین تالیف ہوئی - اور اقصائے عالم میں عربی زبان کی سب سے پہلی تصنیف ہے؛ جس کو ایک مسلمان مصنف نے بصورتِ کتاب مرتّب و مدوّن کیا -

عام خیال یہ ہے کہ دوسری صدی ہجری کے 'اواسط میں' اسلامی علوم مدوّن ہوئے اور اسی زمانے سے مسلمانوں میں تصنیف و تالیف کا رواج ہوا - اس سے پہلے، سو، سواسو سال تک، کوئی کتاب ضبط تحریر میں نہیں آئی - چنانچہ مشہور مورّخ علامہ ابن خلکان نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ امام الحافظ ابوالولید عبدالملک بن عبدالعزیز بن جریج القرشی المتوفی سنہ ۱۵۱ھ [1] نے اسلام میں سب سے پہلے کتابیں تصنیف کی ہیں :— "و یقال إنہ اوّل من صنف الکتب فی الاسلام [2]"- بعض نے امام الحافظ ابو نصر سعید بن ابی عروبۃ المتوفی [3] سنہ ۱۵۶ھ کو اسلام کا پہلا مصنف بتایا ہے، - امام ذہبی "دول الاسلام" میں لکھتے ہیں کہ

---

1 - تذکرۃ الحفاظ، جلد اول، ص ۱۶۰ -
2 - وفیات الاعیان، جلد اول، ص ۳۵۹ -
3 - تذکرۃ الحفاظ، جلد اول، ص ۱۶۷ -
4 - مرآۃ الجنان، جلد اول، ص ۱۳۲ -

ایک ہی زمانے میں ابن جریج نے مکۂ معظمہ میں اور ابن ابی عروبۃ نے "بصرہ" میں سب سے پہلے کتابیں تصنیف کیں[1] -

برخلاف اِس کے زمانۂ حال کے بعض مصنف' مزید تحقیقات کے بعد' اِس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ پہلی صدی کے اختتام اور دوسری صدی کی ابتدا میں' علمائے اسلام' کتابوں کی تصنیف و تالیف میں مصروف و مشغول ہو گئے تھے - چنانچہ فرانس کے مشہور مستشرق' موسیو سیدیو M. Sedeillot کا بیان ہے کہ امام الحافظ ابی بکر محمد بن مسلم بن شہاب الزہری المتوفی سنہ ۱۲۴ھ[2] نے علم حدیث میں سب سے پہلے کتاب تصنیف کی[3] - مصر کے مشہور مصنف جرجی زیدان نے لکھا ہے کہ اسلامی علوم میں سب سے پہلے فن تفسیر مدوّن ہوا - اور ابوالحجاج بن جبر المخزومی المتوفی سنہ ۱۰۳ھ[4] نے سب سے پہلے' اِس فن میں اپنی کتاب لکھی[5] - امام زہری نے خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کے ایما سے جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ و سلم کے غزوات جمع کیے تھے - حضرت عمر بن عبدالعزیز نے سنہ ۱۰۱ھ میں انتقال کیا ہے[6] - لا محالہ اُن کی کتاب المغازی سنہ ۱۰۱ھ سے قبل مرتب ہوئی ہے -

اِن تمام روایات سے قطع نظر' حقیقت حال یہ ہے کہ امام زہری اور مجاہد بن جبر سے پچاس' ساٹھ سال پہلے' مسلمانوں میں تصنیف و تالیف کی ابتدا ہو گئی تھی[7] - چنانچہ علامہ ابن ندیم نے کتاب

---

1 - دول الاسلام' جلد اول' ص ۷۹ - 2 - تذکرۃ الحفاظ ' جلد اول' ص ۱۰۲ -

3 - خلاصۂ تاریخ العرب' ص ۲۴۵ - 4 - تذکرۃ الحفاظ ' جلد اول' ص ۸۶ -

5 - تاریخ التمدن الاسلامی' جلد ثالث' ص ۱۰۷ - 6 - تاریخ ابن اثیر' جلد خامس' ص ۲۳ -

7 - ہمارے ملک کے مشہور مصنف اور مستند عالم مولانا عبداللہ العمادی نے اپنے ایک مضمون میں جو صدر اسلام کی تصنیفات کے متعلق ہے' اپنی یہ تحقیق بیان کی ہے کہ زایدۃ بن قدامۃ ' جن کا سنہ ۶۰ھ یا سنہ ۶۱ھ میں انتقال ہوا ہے ؛ صدر اسلام کے سب سے قدیم مصنف ہیں - چنانچہ اُن کے خاص الفاظ یہ ہیں :— (دیکھیے صفحہ ۲۸۱)

'الفہرست' میں ایک کتاب کا تذکرہ کیا ہے ' جو حضرت معاویہ بن ابی سفیان (۴۰ھ—۶۰ھ) کے لیے تالیف ہوئی ہے - اِس کا نام ''کتاب الملوک و اخبار الماضیین'' ہے[1] - چونکہ مسلمانوں کی اِس وقت تک اِس سے قدیم اور کوئی تصنیف دریافت نہیں ہوئی ہے ؛ اِس لیے یہ کتاب دنیاے اسلام کی سب سے پہلی تصنیف ہے اور اِس کا مصنف اسلام کا پہلا مصنف کہلانے کا بلا شک و شبہہ مستحق ہے -

اِس کتاب کی تالیف و تدوین کے لیے یہ امر محرک ہوا کہ حضرت معاویہ کے اوائل عہد میں ' ایک اعرابی عبداللّٰہ بن قلابۃ ' یمن سے دمشق میں آئے اور اُنہوں نے حضرت معاویہ سے اپنا ایک واقعہ بیان کیا کہ ''کچھ عرصہ پہلے' عدن کے قرب و جوار میں' میرا اونٹ گم ہوگیا تھا - میں اُس کو تلاش کرتا ہوا صحرا میں کئی روز سرگرداں رہا - اِسی دوران میں مجھے شداد کا شہر اِرم نظر آیا - وہ عجیب و غریب ' لیکن

'' زایدۃ بن قدامۃ نے جو حسن بن عطیۃ کے ساتھ جنگ روم (سنہ ۶۰ یا سنہ ۶۱ھ) میں شہید ہوئے - فن حدیث ' تفسیر ' تجوید اور اخلاق میں کئی کتابیں لکھی ہیں ''- (الندوہ - بابت مئی سنہ ۱۹۰۵م' ص ۲۵)-''

مولانا کا یہ استدلال' علامہ ابن ندیم کے حسب ذیل بیان پر مبنی ہے:— ''زایدۃ بن قدامۃ الثقفی من انفسھم ' و یکنی ابا الصلت ' مات بالروم فی غزاۃ الحسن بن عطیۃ سنۃ احدی وستین او ستین (کتاب الفہرست' طبع مصر' ص ۳۱۶)-'' ابن ندیم کی عبارت میں طباعت کی غلطی سے ستین کے بعد مائۃ کا لفظ چھوٹ گیا ہے - نیز حسن بن عطیہ بھی غلط ہے - بلکہ صحیح نام حسن بن قحطبہ ہے- جو سنہ ۱۶۰ھ سے سنہ ۱۶۴ھ تک آرمینیہ میں گورنر رہا ہے
Zambaur, Genealogie et de Chronologie pour l'Histoire de l'Islam, pp. 178.

الحاصل اِس غلطی کے باعث ابن قدامۃ کے عہد اور اُن کے سنہ وفات کی نسبت مولانا کو سخت مغالطہ ہو گیا ہے - حقیقت یہ ہے کہ ابن قدامۃ دوسری صدی کے اواسط میں گزرے ہیں - وہ کوفہ کے محدث اور سفیان ثوری کے معاصر تھے - سنہ ۱۶۱ھ میں اُن کا انتقال ہوا ہے - (تذکرۃ الحفاظ ' جلد اول' ص ۲۰۰ و دول الاسلام' جلد اول' ص ۸۴)''-

1 - کتاب الفہرست ص ۱۲۳ -

خیز آباد مقام تھا - اُس کے در و دیوار مکلّل' اور زمین زر و جواهر سے مالا مال تھی"- حضرت معاویہ کو اُس شہر کی جستجو ہوئی - کئی آدمی' عبداللّٰہ کے ساتھ روانہ کیے - اُنھوں نے یمن کا سارا بیابان چھان مارا - لیکن شہر ارم کا نشان نہیں ملا[1] - تاہم اِس واقعے کی بدولت حضرت معاویہ کو یمن کی گذشتہ تاریخ اور وہاں کے بادشاہوں کے واقعات دریافت کرنے کا شوق ہو گیا - اور اُنھوں نے حکم دیا کہ ایک ایسا آدمی تلاش کر کے ہمارے دربار میں بھیجا جائے؛ جو یمن کے حالات اور وہاں کے انساب و اخبار کا عالم ہو - اِس حکم کی بنا پر' مصر کے والی حضرت عمرو بن العاص نے عبید بن شریۃ الجرهمی کا انتخاب کیا - اور اُن کو "رقہ"[2] سے بلا کر حضرت معاویہ کے دربار میں بھیجا -

عبید بن شریۃ' قبیلۂ جرہم سے تھے؛ جو امم سامیہ سے تعلق رکھتا ہے - اُن کے مورث اعلیٰ جرہم بن عابر' عرب عاربہ کے جد امجد' قحطان بن عابر کے بھائی تھے[3] - عبید کا وطن' یمن تھا - اُس کے دارالحکومت صنعاء میں اُن کی ولادت ہوئی تھی - ظہور اسلام کے بعد وطن چھوڑ کر "جزیرہ" میں آئے اور "رقہ" میں سکونت اختیار کی؛ جو فرات اور حران کے مابین واقع ہے[4] - جناب رسالت مآب صلعم کے دست مبارک پر اسلام لائے تھے[5] - ابو موسیٰ محمد بن عمر الاصفہانی المتوفی سنہ ۵۸۱ھ نے اُن کو صحابہ میں شمار کیا ہے[6] -

---

1 - بلعمی - ترجمۂ فارسی تاریخ طبری' ص ۲۵۳ -

2 - مگر الفہرست سے معلوم ہوتا ہے کہ رقہ سے نہیں بلکہ صنعاء سے آئے تھے "وکان استحضرہ من صنعاء الیمن - (مدیر) -

3 - تاریخ یعقوبی' جلد اول' ص ۲۲۳ - 4 - معجم البلدان' جلد رابع' ص ۲/۲ -

5 - الفہرست میں یہ الفاظ ہیں :—

ادرک النبی صلعم و لم یسمع منہ شیئاً - (مدیر) -

6 - تجرید اسماء الصحابہ' جلد اول' ص ۳۹۴ -

عبید بن شریۃ، دنیا کے اُن چند اشخاص میں ہیں، جنھوں نے طویل عمریں پائی ہیں- ابو حاتم سہیل بن محمد بن عثمان السجستانی المتوفی سنہ ۲۴۸ھ نے ایک کتاب اُن طویل العمر لوگوں کے حالات میں لکھی ہے، جن کی عمریں دو سو سال سے زیادہ تھیں- اِس میں تیسواں تذکرہ عبید کا ہے، جس میں اُن کی عمر تین سو سال اور بقول بعض دو سو بیس سال بتائی گئی ہے[1] - مورخ ابن اثیر نے اسد الغابۃ میں لکھا ہے کہ ہشام بن محمد بن سائب الکلبی المتوفی سنہ ۲۰۶ھ اپنے والد کے حوالے سے بیان کرتے تھے کہ عبید نے دو سو چالیس سال کی عمر پائی تھی[2] - عبید، جس وقت حضرت معاویہ کے دربار میں آئے ہیں تو اُن کی عمر دو سو پانچ برس کی تھی- اِس بنا پر ہجرت نبوی سے ایک سو پینسٹھ سال قبل، سنہ ۴۵۷ع میں پیدا ہوئے تھے- اِس زمانے میں ساسانی خاندان کے چودھویں بادشاہ، بہرام گور بن یزدجرد اول (۴۴۲ع — ۴۶۵ع) کی حکومت تھی[3] -

خلیفہ عبدالملک بن مروان (۶۵ھ — ۸۶ھ) کے عہد حکومت میں سنہ ۶۷ھ کے قریب عبید نے وفات پائی ہے[4] - اِس اعتبار سے اُنھوں نے ایک سو پینتیس سال، زمانۂ جاہلیت میں گزارے تھے - ظہور اسلام کے بعد ستانوے سال، خیرالقرون اور صدر اسلام کا زمانہ دیکھا تھا[5]-

عبید نے ابرھۃالاشرم کی یورش اور "مکہ" پر سنگباری کا واقعہ برای

1 - کتاب المعمرین، طبع لیڈن ص، ۴۰ -

2 - اسدالغابۃ، جلد ثالث، ص ۳۵۱ -

Mordtmann, Z. D. M. G. Vol. VIII (1859) pp. 316 - 3

4 - الفہرست، طبع مصر، ص ۱۳۲ - زرکلی، الاعلام، جلد ثانی ص ۶۱۳ -

5 - اِن روایات سے عبید کی صرف طویل العمری ثابت ہوتی ہے - اُن کے سن کا صحیح اندازہ نہیں ہوتا - کیونکہ اِس قسم کی روایات میں مبالغہ بہت ہوتا ہے - (مدیر) -

العین مشاہدہ کیا تھا - اور داحس کے معرکے بھی دیکھے تھے[1] - اور اُن کے تمام جزئی و کلی واقعات بیان کیا کرتے تھے -

عبید، اخبار و انساب اور ایام عرب کے زبردست عالم تھے - سلاطین سلف اور عہد جاہلیت کے سیکڑوں واقعات اُن کو ازبر تھے -

حضرت عمرو بن العاص نے عبید کو؛ حضرت معاویہ کے دربار میں بھیجا تھا - عمرو بن العاص کا سنہ ۴۳ھ میں انتقال ہوا ہے[2] - اِس بنا پر حضرت معاویہ کے دربار میں عبید کا آنا، بلاشبہہ سنہ ۴۳ھ سے پہلے کا واقعہ ہے -

حضرت معاویہ نے دربار میں آنے کے بعد، عبید کی بڑی مدارات کی؛ اور اُن سے قرون ماضیہ کے حالات، اور سلاطین سلف کے واقعات، زبانوں کے اختلاف، اور اقوام و قبائل کے افتراق، کے اسباب دریافت کیے - عبید، حضرت معاویہ کی مجلس میں آتے، اور گذشتہ واقعات اور ملوک یمن کے حالات سنایا کرتے تھے - حضرت معاویہ نے اُن کوائف کے قلمبند کرنے کے لیے کاتب اور محرر مقرر کر دیے تھے- اِس طرح پر حضرت معاویہ کے حکم سے، کتاب الملوک، کا مسودہ تیار ہوا[3] - (جو عبید بن شریۃ کی طرف منسوب کیا گیا —مدیر) -

عبید نے، کتاب الملوک کے علاوہ ''کتاب الامثال'' بھی لکھی تھی - یہ کتاب مدت ہوئی کہ ناپید ہوگئی - چوتھی صدی ہجری تک موجود تھی - اور علامہ ابن ندیم نے اُسے دیکھا تھا - اِس کے تقریباً پچاس ورق تھے[4] -

---

1 - کتاب التیجان، ص ۲۰۹ -

2 - ابن اثیر، جلد ثالث، ص ۱۸۳ -

3 - کتاب الفہرست، ص ۱۳۲ -

4 - حوالہ سابق -

مستشرقین نے "عبید" کا تلفظ دو طرح سے لکھا ہے - گولدزیہر (Goldziher) نے کتاب المعمرین کے تعلیقات میں عُبَید بضم العین لکھا ہے[1] - ریو (Rieu) اور بروکلمان (Brockelmann)، عَبِید بفتح العین لکھتے ہیں[2] - الامام الحافظ ابی محمد عبدالغنی بن سعید بن علی بن سعید الازدی نے "کتاب المؤتلف و المختلف" میں لکھا ہے کہ عُبید بضم العین جماعت کثیر کا نام ہے[3] - عَبِید بفتح العین صرف ایک شخص عَبِید بن الابرص[4] کہلاتا ہے - اس بنا پر ہماری رائے میں اُن کے نام کا صحیح اور قابل تقلید تلفظ عُبید بضم العین ہے، جس کو گولدزیہر (Goldziher) نے اختیار کیا ہے -

کتاب الملوک میں، یمن کے تاریخی افسانے مذکور ہیں - اس کا انداز بیان "مکالمہ" کی طرز کا ہے - حضرت معاویہ سوال کرتے ؛ اور عبید اُس کا جواب دیتے ہیں - ابتدا اِس کی حضرت ہود علیہ السلام کے تذکرے سے کی ہے - پھر قوم عاد کی تباہی ؛ لقمان بن شداد اور اُس کے سات عقابوں کا قصہ ؛ ثمود کی کیفیت ؛ بنو جرہم کا یمن سے خروج، اور سر زمین حرم میں اُن

---

1 - Abhandlungen zur Arabischen Philologie Teil II Anmerk pp. 29.

2 - Rieu, Supplement to the Arabic MSS. in the British Museum, pp. 579; Brockelmann, Geschichte der Arabischen Litteratur, Vol. I pp. 64.

3 - کتاب مذکور، طبع الہ آباد، ص ۸۳ -

4 - عبید بن الابرص، عرب جاہلیت کا مشہور شاعر سنہ ۵۵۴ء میں ہجرت نبوی سے ۶۷ سال پہلے فوت ہوا ہے - اس کا دیوان سر چارلس Sir Charles Lyall کی تصحیح کے بعد سلسلۂ اوقاف گب کی اکیسویں جلد میں سنہ ۱۹۱۳ء میں شائع ہوا ہے - اس کے حالات کتب ذیل میں مذکور ہیں:- کتاب الاغانی جلد ۱۹ ص ۸۴، ۹۰ - ابن قتیبہ، الشعر والشعراء ص ۱۴۳ - خزانۃ الادب جلد اول ص ۳۲۳ - شعراء النصرانیۃ ص ۵۹۹ - الجمہرۃ ص ۱۰۰ - زیدان، آداب اللغۃ العربیۃ جلد اول ص ۱۱۹ - بروکلمان، ادبیات عرب جلد اول ص ۳۱ : ضمیمہ ص ۵۴ -

کی سکونت؛ ملوک حمیر اور تبابعہ کے اخبار و انساب؛ بیان کیے ہیں - شمریرعش بن افریقش کی نسبت، عبید نے بیان کیا ہے کہ اُس نے عراق سے چین تک؛ فارس، خراسان اور سجستان کے تمام ممالک؛ فتح کرلیے تھے - اور اُس کا لشکر جب بلاد سغد میں پہنچا تو وہاں ایک شہر آباد کیا - اور اُس کا نام "شمر کند" رکھا - جو بعد میں کثرت استعمال سے سمرقند ہو گیا [1] -

عبید نے، حکایات کی توثیق اور اپنے بیان کو شان‌دار بنانے کے لیے جگہ جگہ اشعار نقل کیے ہیں - اِس تقریب سے، کتاب کا ربع حصہ، جاہلی شعرا کے اشعار کی نذر ہوگیا ہے - اِن شعرا میں سے بعض مشاہیر کے نام یہ ہیں :—

امرءالقیس بن حجر بن عمرو الکندی المتوفی سنہ ۵۶۰ع [2] -

امیہ بن ابی‌الصلت المتوفی سنہ ۶۲۴ع [3] -

عباس بن مرداس [4] -

اسود بن یعفر وغیرہ [5] -

مورخین عرب نے، یمن قدیم کے متعلق، جس قدر تاریخیں لکھی ہیں؛ اُن میں کتاب الملوک سب سے پہلی کتاب ہے - یہ کتاب، قرن اول کے ربع ثانی میں تصنیف ہوئی - اِس کے تیس سال بعد، خلیفہ

---

1 - لیکن یہ تمام روایات محتاج ثبوت ہیں - (مدیر)

2 - اغانی، جلد ثامن، ص ۷۲ و ص ۸۴ - خزانۃالادب، جلد ثالث، ص ۵۳۲ - الشعر والشعراء ص ۳۷ - شعراءالنصرانیۃ ص ۶ - بروکلمان جلد اول ص ۲۴ : ضمیمہ ص ۴۷ -

3 - اغانی - جلد ثالث، ص ۱۸۶ : جلد ثامن ص ۳ - خزانۃالادب جلد اول ص ۱۱۹ - شعراءالنصرانیۃ ص ۲۱۹ -

4 - اغانی جلد ۱۳، ص ۶۴ - خزانۃالادب، جلد ۱، ص ۷۳ - الشعر و الشعراء ص ۱۶۶ -

5 - اغانی جلد ۱۱، ص ۱۳۴ - الشعر و الشعراء ص ۱۳۴ - خزانۃالادب، جلد اول، ص ۱۹۵ - شعراء النصرانیۃ ص ۴۷۵ -

عبدالملک بن مروان (۶۵ھ—۸۶ھ) کے زمانے میں، ابو عبداللہ وھب بن منبہ المتوفی سنہ ۱۱۴ھ[1] نے "ذکر الملوک المتوجۃ" لکھی ھے۔ اِس کے سو سال بعد، مشہور سیرت نویس ابو محمد عبدالملک بن ھشام الحمیری المتوفی سنہ ۲۱۳ھ[2] نے "کتاب التیجان لمعرفۃ ملوک الزمان" کو مدوّن کیا۔ اِس کے سو سال بعد، ابومحمد حسین بن احمد بن یعقوب الھمدانی المعروف بہ ابن الحائک المتوفی سنہ ۳۳۴ھ[3] نے کتاب الاکلیل تصنیف کی۔ ابن الحائک کے بعد، نشوان بن سعید

1۔ وھب بن منبہ فارسی الاصل اور یمن کے رھنے والے تھے۔ سنہ ۳۴ھ میں پیدا ھوے۔ سنہ ۱۱۰ھ یا سنہ ۱۱۴ھ میں انتقال کیا۔ امام ذھبی نے اُن کو حفاظ حدیث میں اور حافظ ابونعیم اصفہانی نے صوفیہ میں شمار کیا ھے۔ اخبار و انساب اور اسرائیلیات کے بڑے عالم تھے۔ طبقات ابن سعد، جلد ثالث، ص ۳۹۵۔ حلیۃالاولیاء، جلد رابع، ص ۲۳۔ وفیات الاعیان، جلد ثانی، ص ۲۳۸۔ معجم الادباء، جلد سابع، ص ۲۳۲۔ تذکرۃالحفاظ، جلد اول ص ۸۸۔ مرآۃالجنان، جلد اول، ص ۲۴۸۔ شذرات الذھب، جلد اول، ص ۱۵۰۔ بروکلمان، جلد اول ص ۶۵؛ ضمیمہ ص ۱۰۱۔

2۔ ابو محمد عبدالملک بن ھشام الحمیری انساب اور اخبار عرب کے بڑے عالم تھے۔ بصرہ میں نشو و نما پائی۔ سنہ ۲۱۳ھ میں مصر میں فوت ھوئے۔ اِن کی کتاب السیرۃ جو یورپ اور مصر میں چھپ گئی ھے، نہایت مشہور اور معتبر ترین کتابوں میں سمجھی جاتی ھے۔ روض الانف، جلد اول، ص ۵؛ وفیات الاعیان، جلد اول، ص ۳۶۵۔ مرآۃالجنان، جلد ثانی، بغیۃالوعاۃ، ص ۳۱۵۔ بروکلمان، جلد اول، ص ۱۳۵؛ ضمیمہ ص ۲۰۷۔

3۔ ابو محمد حسین بن احمد بن یعقوب الھمدانی، یمن کے رھنے والے اور قبیلۂ بنی ھمدان سے تھے۔ علوم حکمت، خصوصاً ھیئت اور اخبار و انساب میں اُن کو کمال حاصل تھا۔ سنہ ۳۳۴ھ میں صنعاء کے قیدخانے میں اُن کا اِنتقال ھوا۔ اُنھوں نے مختلف علوم میں متعدد کتابیں لکھی ھیں:— (۱) اسرارالحکمۃ علم نجوم میں۔ (۲) کتاب الیعسوب، شمشیر زنی، تیر اندازی اور نیزہ بازی کے بیان میں۔ (۳) صفۃ جزیرۃ العرب۔ عرب قدیم کا جغرافیہ؛ پہاڑوں، دریاؤں، صوبوں کے مفصل حالات؛ اور وھاں کے اقوام و قبائل کا تذکرہ۔ طبقات الامم، ص ۷۹ و ص ۸۰۔ معجم الادباء، جلد ثالث ص ۹۔ قفطی اخبارالحکماء ص ۱۱۳۔ بغیۃ الوعاۃ ص ۲۱۷۔ بروکلمان، جلد اول ص ۲۲۹۔

الحمیری المتوفی سنہ ۵۷۳ھ [1] کا ظہور ہوا ' جنھوں نے ملوک حمیر کی نسبت ایک قصیدہ لکھا ہے - اِس کے علاوہ اپنی لغات' شمس‌العلوم میں' جگہ جگہ' یمن اور ملوک یمن کے حالات بیان کیے ہیں -

وہب بن منبہ کی کتاب 'ذکرالملوک' مدت ہوئی کہ مفقود ہو چکی ہے - لیکن ساتویں صدی تک موجود تھی - اور علامہ ابن خلکان نے اُس کو دیکھا تھا - اُنھوں نے بیان کیا ہے کہ یمن کے متعلق مفید و کار آمد کتاب ہے - اِس میں ملوک حمیر کے اخبار و انساب اور اُن کے مقابر و اشعار کے تذکرے ہیں [2] -

کتاب التیجان میں' قحطان بن عابر کے زمانے سے' سیف بن ذی‌یزن کے عہد تک' ملوک یمن' حمیر و تبابعہ کے واقعات' خوب شرح و بسط کے ساتھ بیان کیے ہیں - اِس کا زیادہ حصہ' وہب بن منبہ کے روایات پر مبنی ہے - ابن ہشام نے اِن روایات کو اسد بن موسیٰ کے حوالے سے بیان کیا ہے - اسد بن موسیٰ اُن کو ابی‌ادریس بن سنان سے روایت کرتے ہیں - ابی ادریس' وہب بن منبہ کے دختر زادے تھے [3] اور اُنھوں نے اِن روایات کی اپنے نانا وہب سے سماعت کی تھی [4] - یہ کتاب سنہ ۱۳۴۷ھ میں حیدرآباد میں چھپ گئی ہے - اور مسٹر کرنکو Krenkow نے اِس کی تصحیح کی ہے -

کتاب الاکلیل میں' ملوک حمیر کے انساب و اخبار اور اُن کے آثار

---

1 - نشوان بن سعید الحمیری ' یمن کے مشہور عالم اور ادیب تھے - وہاں کے کئی قلعوں میں اُن کی حکومت تھی - سنہ ۵۷۳ھ میں اُن کا انتقال ہوا - شمس‌العلوم ' کتاب القوافی اور حورالعین' اُن کی مشہور تصنیفات ہیں - بغیۃ الوعاۃ ص ۴۰۳ - جرجی زیدان آداب اللغۃ العربیۃ ' جلد سوم' ص ۵۷ - بروکلمان' جلد اول' ص ۳۰۰ -

2 - وفیات‌الاعیان' جلد ثانی' ص ۲۳۸ - 3 عبدالمنعم بن ادریس (مدیر) -

4 - الفہرست ص ۱۳۸ -

و عمارتوں کا تذکرہ ہے - ابن صاعد [1] القرطبی نے اپنی کتاب 'طبقات الامم' میں اِس کے ابواب کی تفصیل اِس طرح کی ہے[2] :—

باب اول - اقوام عرب و عجم اور مُلوک یمن کی اصل و نسل کا تذکرہ -

باب دوم - الهمیسع بن حمیر کی اولاد کا سلسلۂ نسب -

باب سوم - قحطان کے فضائل -

باب چہارم- تاریخ یمن کا دور اول - یعرب بن قحطان کے زمانے سے تبع ابو کرب کی حکومت تک -

باب پنجم - تاریخ یمن کا دور وسطیٰ - سعد ابو کرب کے جلوس سے ذونواس کے عہد تک ۔

باب ششم - تاریخ یمن کا دور آخر - ذونواس کے عہد سے مسلمانوں کے تسلط تک -

باب هفتم - ملوک یمن کے فرضی افسانے اور بعید از قیاس حکایات -

باب هشتم- حمیر کی عمارتوں' مقبروں اور کتبوں کا تذکرہ -

باب نهم - حمیری زبان کے امثال اور حمیری خط کی کیفیت -

باب دهم - بنی همدان کے حالات -

اِس کے آٹھویں باب کو پروفیسر مولر Proff. Muller نے جرمنی ترجمے اور تعلیقات کے ساتھ لیپزگ میں' سنہ ۱۸۷۹ع میں' چھپوایا ہے - جرمنی میں اُس کا نام یہ ہے :

Die Burgen Schlosser Eudarabins Noch Dem Iklil des Hamadani.

1 - صاعد - (مدیر)

2 - طبقات الامم' ص ۷۹ -

نشوان بن سعید الحمیری کا منظومہ' جو القصیدۃ الحمیریۃ کے نام سے مشہور ہے ؛ وان کریمر (V. Kremer) کی سعی و کوشش سے سنہ ۱۸۹۵ع میں لیپزگ میں طبع ہوا ہے - پریدو (W. F. Prideaux) نے انگریزی میں ترجمہ کیا ہے' جو The Lay of the Himyarites کے نام سے سنہ ۱۸۷۹ع میں چھپا ہے -

شمس العلوم' لغت کی کتاب ہے - لیکن اس میں یمن اور حمیر سے تعلق رکھنے والے الفاظ کے تحت میں' اخبار یمن کی' خوب تشریح کی ہے - اِس حصے کو کتاب سے اقتباس کر کے' عظیم الدین احمد ایم - اے - پی - ایچ - ڈی نے سلسلۂ اوقاف گب کی چوبیسویں جلد میں سنہ ۱۹۱۶ع میں چھپوایا ہے - اور اِس پر جرمنی زبان میں مقدمہ اور حواشی لکھے ہیں۔

مورخین عرب نے' یمن قدیم کی نسبت جو کچھ لکھا ہے' اُن سب کا مصدر و منبع یہی تصنیفات ہیں - اور اِن میں قدامت کے لحاظ سے عبید بن شریۃ اور وھب بن منبہ کی تصنیفات کو خاص اھمیت حاصل ہے - اور اُن کی روایات کو تمام موورخین نے قابل استناد قرار دیا ہے - اِس موقع پر یہ بتا دینا بھی ضروری معلوم ھوتا ہے کہ امام مسعودی نے مروج الذھب میں' ملوک یمن کے حالات بیان کرتے ھوئے عبید بن شریۃ کے متعدد حوالے دیے ھیں[1] -

علامہ اُبن خلدون نے' جو مشہور نقاد اور فلسفی مورخ ہے' عبید بن شریۃ کے روایات کو ترجیح دی - اور انساب یمن کے بیان کرنے میں اُن ھی کی پیروی کی ہے[2] -

---

1 - مروج الذھب' جلد ثالث' ص ۱۷۳ و ص ۱۷۵ ؛ جلد رابع ص ۸۹ -

2 - کتاب العبر' جلد ثانی' ص ۴۹ و ص ۲۲۶ -

مورخین نے حارث الرایش کے نسب میں اختلاف کیا ھے - عبید بن شریۃ اُس کو الھمیسع بن حمیر کی نسل سے بتاتے ھیں - وھب بن ملبہ نے اُس کا سلسلہ وایل بن حمیر سے ملایا ھے - ابن ھشام اور ابوالفدا وغیرہ نے وھب بن ملبہ کی پیروی کی ھے - حمزہ اصفہانی اور ابن اثیر نے خفیف اختلاف کے ساتھ ' حارث الرایش اور اُس کے جانشینوں کو الھمیسع بن حمیر کی اولاد سے بتایا ھے[2] - نشوان حمیری اور ابن خلدون ' ملوک تبابعہ کا وھی سلسلۂ نسب بیان کرتے ھیں ' جو عبید بن شریۃ کی کتاب الملوک میں مذکور ھے - اور اِس سے ظاھر ھے کہ جمھور مورخین' انساب یمن کے بارے میں' عبید کے روایات کو وھب کے روایات پر ترجیح دیتے اور عبید کو قابل استناد راوی سمجھتے ھیں -

کتاب الملوک' صدیوں سے لا پتا تھی' اور اُس کے موجود ھونے کا علم کسی کو نہ تھا - یہاں تک کہ زمانۂ حال کے مشہور مصنف' جرجی زیدان نے بھی اپنی کتاب تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ میں جو سنہ ۱۹۲۴ع میں شایع ھوئی ھے' لکھدیا ھے کہ یہ کتاب اِس وقت غیر موجود اور ناپید ھوگئی ھے -

اُن حضرات کو ' جو عربی زبان کے ابتدائی ادبیات سے غایت دلچسپی رکھتے ھیں ' یہ معلوم کرکے بڑی مسرت ھوگی کہ اِس کتاب کے دو مخطوطے اِس وقت دنیا میں موجود ھیں - ایک برٹش میوزیم لندن میں ؛ دوسرا مجلس دائرۃالمعارف کے کتب خانے میں - یہ دونوں مخطوطے دو مجموعوں میں شامل ھیں - جن کی کیفیت یہ ھے :—

(۱) برٹش میوزیم کے مجموعے کو' علی بن سعید بن محمد بن

---

1 - تاریخ ملوک الارض' ص ۱۰۸ و ابن اثیر' ص ۱۰۸ -

هاجر القملانی نے' بکم شعبان سنہ ۱۰۳۱ھ کو' ایک سقیم نسخے سے نقل کیا - اِس میں حسب ذیل دو کتابیں ·اور قصاید و کتب کے سات مختلف منتخبات شامل ہیں :—

۱ - کتاب التیجان لابن ہشام ورق ۱ سے ۱۱۰ تک -

۲ - کتاب الملوک ورق ۱۱۱ سے ۱۸۱ تک -

۳ - مختلف منتخبات ورق ۱۸۱ ب سے ۱۹۱ تک -

(الف) اسعدالکامل کے قصیدے کے منتخب اشعار -

(ب) ابوالحسن نشوان بن سعید الحمیری المتوفی سنہ ۵۷۳ھ کے قصیدے کے منتخب اشعار -

(ت) قاضی ابراهیم الساحلی المغربی المتوفی سنہ ۷۳۹ھ کے قصیدے کے منتخب اشعار -

(ث) علاءالدین علی بن عبداللّٰہ البہائی المتوفی سنہ ۸۰۵ھ کی کتاب مطالع البدور و منازل السرور کا وہ حصہ' جس میں عہد قدیم کی عمارات عجیبہ کا تذکرہ ہے -

(ج) ابی مروان عبدالملک بن عبداللّٰہ بن بدرون کی شرح ' بر قصیدۂ ابی محمد عبدالمجید بن عبدون الفہری المتوفی سنہ ۵۲۰ھ ' وزیر بنی افطس کا وہ حصہ' جو جبلہ بن الایہم کی مہم سے تعلق رکھتا ہے -

(ح) ابو العباس سیدی احمد البہلول کے قصیدے کے منتخب اشعار -

(خ) علامہ ابن کثیر حافظ عمادالدین ابی الفدا اسمعیل بن عمر القرشی المتوفی سنہ ۷۷۴ھ کی کتاب البدایۃ و النہایۃ کا وہ حصہ ' جو خلیفہ ولید بن عبدالملک کے عہد حکومت سے تعلق رکھتا ہے -

(۲) مجلس دائرۃ المعارف کا مجموعہ' برٹش میوزیم کے مخطوطے سے' دو سال گیارہ مہینے سولہ یوم بعد' ۱۶ رجب سنہ ۱۰۳۴ع کو مکتوب ہوا ہے - اِس کے کاتب کا نام مطہر بن عبدالرحمن بن مطہر بن امام شرف‌الدین ہے - اور اُس نے ایک سقیم نسخے سے' شہر صنعاء دارالحکومت ملک یمن کے محبس دارالحمراء میں اِس کی کتابت کی ہے -

اِس مجموعے میں حسب ذیل دو کتابیں اور تین مختلف انتخاب شامل ہیں :—

۱—کتاب التیجان ورق ۱ سے ۱۰۹ ب تک -

۲—کتاب الملوک ورق ۱۱۰ سے ۱۸۰ الف تک -

۳—مختلف منتخبات -

(الف) اسعد الکامل کے قصیدے کا انتخاب -

(ب) نشوان بن سعید الحمیری کے قصیدے کا انتخاب

(ت) مطالع البدور و منازل السرور کا وہ حصہ' جو عہد قدیم کی عمارات عجیبہ سے تعلق رکھتا ہے -

مجلس دائرۃ المعارف کے صدر' نواب عمادالملک مرحوم' عربی زبان کی قدیم تصنیفات کے دلدادہ اور اُن کے نشر و ترویج کے بڑے حامی تھے - یہ مجموعہ جب نواب صاحب کی نظر کیمیا اثر سے گزرا تو اُس کی پہلی دو کتابوں یعنی کتاب التیجان اور کتاب الملوک کو دائرۃ المعارف کے سلسلۂ مطبوعات میں منتخب فرمایا - مولوی سید زین‌العابدین موسوی' تصحیح و تبییض کے لیے مقرر ہوئے - اُنہوں نے نہایت سعی و کوشش سے اِن کتابوں کا ایک ایسا متن مرتب کیا ' جس سے طباعت کی دقت اور دشواریاں رفع ہوگئیں - لیکن مزید تلقیح و تصحیح کے مد نظر' کسی دوسرے مخطوطے سے اِس کا مقابلہ کیا جانا

ضروری تھا - اِس مقصد کی تکمیل کے لیے مسٹر کرنکو کے خدمات حاصل کیے گئے - اور اُنھوں نے دقت نظر کے ساتھ یورپ کے مخطوطوں سے اِس کا مقابلہ کیا - جو اختلافات نظر آئے' حواشی میں اُن کی تصریح کر دی - الغرض مولوی سید زین العابدین اور مسٹر کرنکو اِس کی تہذیب و تصحیح میں کئی سال مصروف رہے - اُس کے بعد یہ کتابیں اشاعت کے قابل ہوئیں - سنہ ۱۳۴۷ھ م سنہ ۱۹۲۸ع میں مجلس دائرۃ المعارف نے نہایت اہتمام کے ساتھ اِن کو ایک جلد میں چھپوا کر شایع کیا - لیکن افسوس ہے کہ کارکنان دائرۃ المعارف نے کتاب الملوک کو روشنی میں لانے کی مطلق کوشش نہیں کی - یہاں تک کہ سر ورق پر اُس کا نام بھی درج نہیں کیا - جس کی وجہ سے یہ نادر و نایاب کتاب' حسب سابق' پردۂ خفاء میں مستور رہ گئی - باوجود اِس کے یہ امر تمام دنیا میں نواب عمادالملک مرحوم اور اہل حیدرآباد کے لیے فخر و مباہات کا باعث ہے کہ ادبیات عرب کی سب سے پہلی اسلامی تصنیف اُن کی توجہ سے چھپی اور حیدرآباد کی ایک مجلس علمی کی جانب سے اُس کی اشاعت ہوئی -

(جنوری ۱۹۴۱ء)

: ایچ ۔ اے ۔ آر ۔ گب

یورپی ادب پر اسلامی ادب کا اثر

اسلامی مشرق کا ادب ہم اہل یورپ کے مذاق سے اس قدر دور ہے کہ غالباً ایک ہزار پڑھنے والوں میں سے ایک کے دل میں بھی اس بات کا خیال نہیں آتا ہوگا کہ ان دونوں میں کوئی تعلق بھی ہے ۔ دوسری طرف تاریخ ادبیات کا طالبعلم اس پورے مبحث ہی کو غیر مستحسن شک و شبہ کی نظر سے دیکھنے پر مائل ہو سکتا ہے، جو یہ جانتا ہے کہ یورپی ادب میں باوقات مختلف ' مشرقی ماخذوں کے متعلق ' دعوے تو بہت کچھ کیے گئے لیکن ثابت بہت کم کیا گیا ہے ۔ بلا شبہہ بعض حقائق موجود ہیں، جن سے کسی کو اختلاف نہیں ہے ۔ قرون وسطیٰ میں مشرق کے اخلاقی قصوں اور اسی قسم کی دوسری کتابوں کی مقبولیت کا دائرہ وسیع تھا ۔ انگلستان میں جو کتاب سب سے پہلے چھپی وہ اسی قسم کی ایک عربی کتاب کے ترمیم شدہ لاطینی ترجمے کے فرانسیسی ترجمے کا ترجمہ تھی ۔

علاوہ ازیں، اٹھارھویں صدی عیسوی میں انگریزی اور فرانسیسی میں الف لیلہ کے کم سے کم تیس ایڈیشن نکلے اور اُس وقت سے لیکر اب تک یہی کتاب مغربی یورپ کی تمام زبانوں میں تین سو سے زیادہ مرتبہ چھپ چکی ہے ۔ آج عمر خیام کے نام سے ایرانیوں سے کہیں زیادہ انگریزوں

اور امریکنوں کے کان مانوس ہیں - لیکن کیا مشرق سے مغرب میں یہ خلل اندازیاں کبھی کبھار ہوئیں یا اِن سے کسی عام رجحان کی تشریح ہوتی ہے ؟ اور اگر ایسا ہے تو پھر یہ رجحانات کس طرح پیدا ہوئے اور اِنہوں نے ادب کے عام میلان پر کیا اثر ڈالا ؟

افسوس ہے کہ اِن میں سے کسی سوال کا جواب قطعیت سے نہیں دیا جاسکتا اور فی الحال جو تھوڑی بہت شہادت دستیاب ہوسکتی ہے اُس کی بنا پر اِس سے زیادہ کی کوشش نہیں ہو سکتی کہ صرف وہ خطوط تجویز کیے جائیں جن پر سے محولہ سوالوں کے جواب دریافت ہو سکیں-

اُن عناصر کو متعین کرنے سے زیادہ نازک اور کوئی مسئلہ نہیں ہے، جن سے اُس اثر کی کیفیت و کمیت کا ٹھیک ٹھیک اندازہ ہوسکے جو ایک ادب دوسرے ادب پر ڈالتا ہے- ظاہر ہے کہ اِس کے لیے کسی طویل اور قریبی تاریخی تعلق کی موجودگی ضروری نہیں - گو یہ ہوتا رہا ہے کہ ایسے تعلقات کسی ایک یا دونوں متعلقہ قوموں پر اپنے نقوش چھوڑے بغیر نہیں رہتے - اور نہ یہ بات کوئی اہمیت رکھتی ہے کہ اُن کے تاریخی تعلقات خاص کر مخاصمانہ ہیں یا دوستانہ - یورپ کے تمام ادبیات کی تاریخ سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ ادبی رسم و رواج اور تحریکیں، فوجی سرحدوں ہی پر نہیں رکا کرتیں - تاریخی ربط سے زیادہ لازمی ' لیکن عام طریق استدلال سے ثابت کرنے میں زیادہ مشکل چیز ' آپس کا میل جول ہے - خواہ یہ انفرادی ہو یا دوطرفہ یا جیساکہ اکثر ہوا کرتا ہے ' علمی و یک طرفہ ؛ غرض اُس کے وجود کا اقرار یا انکار آخر کار مجبوراً صرف ادبی تجزیے ہی کے ذریعے ہو سکتا ہے -

سب سے زیادہ اہم جز ' سب سے زیادہ گم راہ کن ہے - کسی قسم کا عمل انتقال اُسی وقت ممکن ہے جب ایک یا دونوں طرف اثرپزیری کی

حالت موجود ہو ؛ یعنی دوسرا جو چیز پیش کرتا ہے اُس کو قبول کرنے کی خواہش ؛ جس میں پوشیدہ طور پر کسی نہ کسی شعبے میں ' اثر ڈالنے والے کی برتری مسلم ہوتی ہے - یہ ظاہر کرنے کے لیے کسی گہری تحقیق کی ضرورت نہیں کہ عربی یا فارسی ادب کا رنگ اختیار کرنے میں یورپ کی اثرپزیری ' وقت اور وسعت دونوں اعتبار سے بالکل محدود تھی - مغربی ادبیات کے لاتینی ' اس لیے نشأۃ ثانیہ ' اور یونانی اثرات کو مسلسل جذب کرتے رہنے اور مشرقی ادب کے اجزا گاہے گاہے اختیار کرنے اور نیم خفیہ طریقے سے اُس میں تصرف کرتے رہنے میں کوئی موازنہ نہیں ہو سکتا - مشرقی فن ادب کی کلی طور پر یورپی ادب میں منتقل ہونے والی کوئی چیز مشکل ہی سے پائی جاتی ہے؛ لیکن انفرادی حیثیت سے اُصول فن کے مبادیات اور کبھی کبھی ادب کی بعض مسلمہ تحریکوں کو کامیابی سے منتقل کیا گیا - اِن اصولوں میں سے فلاں کیوں انتخاب کیے جاتے رہے اور دوسرے کیوں چھوڑ دیے جاتے رہے ؟ تو بڑی حد تک اِس کا تعلق قومی و عمومی نفسیات کے مسئلے سے ہے- بہر طور یہ بات قابل ذکر ہے کہ مشرقی ادب نے مغربی ادب کو اپنے اختلافات سے ' جو اُس میں اور مغربی ادب میں تھے ' اِتنا متاثر نہیں کیا جتنا اپنی مماثلتوں سے - یورپ کے ادبی مذاق نے مشرقی ادب کی اُن خصوصیتوں کو کبھی قبول نہیں کیا جو نمایاں طور پر اُس سے کوئی لگاؤ نہیں رکھتی تھیں ؛ بلکہ اُن کے بجائے ایسے اُصول فن اُس کے زیادہ جاذب توجہ رہے ہیں جن کے جراثیم' یورپی ادب و فلسفہ میں پہلے سے موجود تھے یا آزمائشی طور پر اُن کی نشو و نما شروع ہوچکی تھی - ایسی صورتوں میں مشرقی ادب کی مماثلتیں اُس دروازے کا کام دیتی تھیں جس کو مغرب کھٹکھٹا رہا تھا یا وہ خود اپنے طرز ادا کی رنگینی و تابناکی کی وجہ سے

ایسی قبولیت عام حاصل کرچکے تھے کہ اُنھوں نے اُن شاہراھوں کو ملور کر دیا جن پر یورپی تحریکوں کو چلنا چاھیے تھا - اِس سے یہ نتیجہ نکالنا نہیں ھے کہ اُنھوں نے کوئی معیار مقرر کردیا تھا یا کسی ایسے نمونے کا کام دیا تھا جس کی بے چون و چرا تقلید کی جائے ! اِس کے برخلاف اھل یورپ کا طبعی رجحان ، ادب کی جس شاخ کی طرف تھا اُس کی ترقی یا وسعت اپنے مخصوص طرز ھی پر ھوئی ؛ جس میں مشرق کو کوئی دخل نہیں تھا - بلکہ بسا اوقات وہ اپنے مشرقی پیشرووں سے بالکل ناواقف ھی رھتے تھے -

مشرقی اور کلاسکی ادب نے علی‌الترتیب جو اثرات ڈالے ھیں ؛ اُن دونوں کے درمیان مشابہتیں تلاش کرنے کی کوشش کرتے وقت ، اُن کے باھمی فرق کو نظر انداز کرنا پڑے گا اور یہ فرق صرف کمیت ھی کا نہیں بلکہ کیفیت کا بھی ھے - عرب و ایران کا ادب اصلاً ''رومانی'' ھے - ایسے طالب علم کو جس کی تربیت ، ادبی خوبیوں کے یونانی مطمح نظر کے تحت ھوئی ھو ؛ اُس کو اِس ادب میں وہ صفات بہت ھی کم ملیں گی جو یونانی ادب کے سدا بہار گلشن کی دلکشی کا باعث ھیں - عربی و فارسی طرز انشا ، یونانی اسلوب نگارش کے مساوی بلکہ اُس سے مکمل تر ھوتا ھے - لیکن یونانی میں تنوع ھے تو عربی میں یکسانی اور اِس میں شان و شکوہ ھے تو یونانی میں سنجیدگی -

کلاسکی ادیب ، سنجیدگی و سادگی کے ذریعے عظمت حاصل کرتے ھیں اور مشرقی ، تابناک و معنی‌خیز زبان استعمال کرتے ھیں اور اُس کی تزیین و آرائش ، اکثر دور از قیاس اور بعض خیالی تشبیہات و استعارات سے کی جاتی ھے - یونانی ، حسن کے ذریعے سے عقل کو اپیل کرتا ھے اور عرب یا ایرانی ، حواس اور تخیل کے تار کو حسن ادا کے رنگین

مضراب سے چھیڑنے کی کوشش کرتا ہے - یہ دعوئ، متکبرانہ اور غیر محتاط تعمیم سے زیادہ، لیکن حقیقت کے عنصر سے خالی بھی نہیں ہے کہ یونانی ادب تخلیقی؛ اور مشرقی ادب بنیادی طور پر مصنوعی اور علم و حکمت کے اوصاف سے عاری ہے -- اسلامی ادیب کی بڑائی اِس میں ہے کہ وہ اپنے خیال کی اعلیٰ حقیقت کو رومان کی زبان میں پیش کرتا ہے - لیکن اِس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط ہوگا کہ مشرقی اور یورپی اسپرٹ میں اصلاً تضاد ہے - تضاد کا وجود تو ضرور ہے لیکن یہ تضاد، مشرقی اور کلاسکی اسپرٹ میں ہے - یورپی ادب میں کلاسکیت ہمیشہ باہر سے عائد کی گئی ہے - ادب العوام خصوصاً شمال اور مغرب کے ادب العوام سے ظاہر ہوتا ہے کہ مشرقی ادبیات کی اسپرٹ سے اِن دونوں کا باہمی تعلق زیادہ قریبی ہے - دونوں کے باہمی احساس اجنبیت کا سبب، اِن کا بُعد مدنی اور ناواقفیت ہے - جب کبھی اِن دونوں کی غیریت کا پردہ چاک ہوا تو مشرقی اثرات کی رَو نے یورپی ادب کے مقبول عام دھاروں میں عموماً اِس حد تک قوت پیدا کردی کہ وہ کم و بیش کامیابی کے ساتھ کلاسکی فضیلت کو دعوت مبارزت دینے کے قابل ہوگئے -

اِسی واقعے، یعنی قرون وسطیٰ میں مشرقی عناصر کے سرایت کرنے اور قبولیت عام حاصل کرنے، نے اپنے عمل نفوذ پر اور زیادہ پردہ ڈال کر اپنے اثرات کو نہایت پیچیدہ بنا دیا ہے؛ اس لیے اکثر صورتوں میں، تاریخی تنقید کے مروجہ قاعدوں سے اِس اثر کو ثابت کرنا مشکل ہے - یہ مشکل اور زیادہ بڑھ جاتی ہے؛ کیوں‌کہ دونوں طرف کے ادب العوام کا بیشتر حصہ تلف ہو چکا ہے - حتیٰ کہ ہماری ادبی تاریخوں سے بھی اِس بات کا پتا لگتا ہے کہ علی العموم عربی زبان کے ادیبوں اور یورپی عالموں، دونوں نے عوام کے قصے کہانیوں اور گیتوں سے بنظر حقارت علیحدگی اختیار کر رکھی

تھی - یہ باور کرنے کی ہر ایک وجہ موجود ہے کہ ادب العوام کے متعلق موجودہ زمانے کی تحقیقات، تمام مغربی یورپ میں پھیلے ہوئے اُس مواد و اصول ادب، دونوں کی وسعت و اشاعت پر پوری روشنی ڈالے گی، جو براہ راست مشرق سے اخذ کیے گئے ہیں - ممکن ہے کہ اِس کا اثر آٹھویں صدی عیسوی[1] ہی سے پڑنا شروع ہو گیا ہو؛ لیکن مشرقی اثرات کا سوال خاص کر اُس وقت پیدا ہوتا ہے جب کہ مقامی ادب ترقی کرنے لگے تھے -

سب سے پہلا مسئلہ ہی شائد سب سے زیادہ مشکل ہے - اور اُس کے سب سے زیادہ ما بہ النزاع ہونے میں تو کوئی شک ہی نہیں - گیارھویں صدی عیسوی کے اختتام پر جنوبی فرانس میں یکا یک ایک نئی قسم کی شاعری وجود میں آئی جس کا صرف موضوع ہی نیا نہیں تھا، بلکہ اُس کے اجتماعی نفسیات اور طرز ادا بھی نئے تھے- فرانس کے ابتدائی ادب میں کوئی ایسی بات نہیں پائی جاتی جو اِس ارتقا کی طرف راہنمائی کرتی ہو - دوسری طرف، اِس جدید شاعری اور اِسی زمانے کی، اسلامی اسپین کی، شاعری کی ایک خاص صنف میں بعض غیر معمولی مشابہتیں پائی جاتی ہیں - اِس سے زیادہ قدرتی بات اور کیا فرض کی جا سکتی تھی کہ پراونس کے ابتدائی شعرا، عربی نمونوں سے متأثر ہوئے ہوں! چنانچہ صدھا سال تک یہی نظریہ بلا چون و چرا تسلیم کیا جاتا رہا - اِس خیال کو کبھی کسی شخص نے ایسے وثوق یا ایسی تعمیم سے نہیں

1—ملاحظہ ہوں پروفیسر لیو وائنر (Leo Wiener) کے فاضلانہ دلائل جو اُنھوں نے عربی اثرات کے قوطی (Gothic) واسطے کی حمایت میں پیش کیے ہیں - ''قوطی تہذیب کی تاریخ کی چند تکمیلی خدمات'' جلد اول - نیو یارک - سنہ ۱۹۱۷ م - (Contribution towards a History of Arabico-gothic culture) خاص کر وہ باب جو مارو نحوی (Maro) پر مشتمل ہے -

پیش کیا ' جیساکہ گیامیرابربیری [1] نے احیاے کلاسک کے پورے عروج کے زمانے میں پیش کیا تھا [2] - اٹھارھویں صدی کے اختتام پر جب عہد وسطیٰ کے مطالعے کا شوق دوبارہ شروع ہوا (اور یہ وہ زمانہ ھے جب کہ عوام کے تخیل پر' ھنوز' مشرقی رومانس مسلط تھا) تو عام راے پراونسی اور عربی شاعری کے قریبی تعلق کے خیال کی برابر حمایت کرتی رھی؛ جن میں سسملڈی [3] اور فوریل [4] سب سے پیش پیش تھے - اُنیسویں صدی عیسوی کے وسط میں جا کر کہیں رومانسی لسانیات کے عالموں اور مستشرقوں' دونوں میں اِس کا رد عمل نمودار ہوا - نقادوں نے پراونس اور اندلس کے باھمی تعلقات کی تحریری شہادت طلب کی اور جب اِس میں ناکامی ہوئی تو انتہائی مخالف پہلو کی طرف جھک گئے - اگر کوئی شخص بغیر کسی عناد کے کسی نہ کسی حد تک اِس رد عمل کو غیرمعتدل جذبۂ قومیت سے' جو تمام مغربی قوموں کی روح و رواں ھے' منسوب کرے تو یہ ماننا پڑے گا کہ کسی خوددار رومانسی عالم کے لیے مشہور مستشرق ڈوزی [5] کی اِس متکبرانہ راے کے خلاف اسلامی اثرات کے نظریے کی حمایت کرنا بعید از قیاس ھے :— ''ھم خیال کرتے ھیں کہ یہ سوال بالکل ھی لغو ھے - ھماری خواھش ھے کہ اب اِس پر مزید بحث نہ ھو - اگرچہ ھمیں اِس کا یقین ھے کہ اِس پر ابھی بہت دن تک بحث ھوتی رھے گی - خیر - ھر شخص کو اُس کا جنگی گھوڑا مبارک [6] -'' اِسی وجہ سے ایسا معلوم ھوتا ھے کہ رائج الوقت راے اِسی

1—Giammeria Barbieri

2—''قافیہ دار شاعری کی اصل'' Dell' Origine alalla Posia Rinata. pd. by Traboschi,

3—Sismondi - 4—Fauriel Modena, 1790 - 5—Dozy

6—تاریخ اسپین پر تحقیقی مقالے Recherches Surl'historie............de L 'Espagne ۱۸۸۱ - تیسری اشاعت - جلد دوم - ضمیمہ - نشان I xiv - ذیل -

بنیاد پر قائم ہے! مثلاً موسیو آنگلے[1] اِس رائے کے نمائندے ہیں - کہتے ہیں :— ''یہ سوال نہ صرف ظاہری شکل میں بلکہ مادی طور پر بھی طروبوں (troubadour) کا پیدا کیا ہوا ہے''۔

موافق و مخالف دونوں رائیں پورے وثوق سے بیان کی گئی ہیں ؛ لیکن فی الحقیقت بڑی حد تک دونوں محض قیاس پر مبنی ہیں - مستشرقین کی طرف سے موجودہ زمانے تک بھی اِس مسئلے کی باقاعدہ چھان بین بہت ہی تھوڑی بلکہ نہیں کی گئی ؛ لیکن جو نئی شہادتیں منظر عام پر آرہی ہیں اُن سے اِس بات کے متعلق ہر قسم کے شک و شبہہ کا ازالہ ہو جاتا ہے کہ جنوب کے شعری ارتقا نے ابتدائی پراونسی شعرا پر واقعتاً کچھ نہ کچھ اثر ضرور ڈالا ہے[2] -

پراونسی شاعری کی اِس جدت کا راز' اپنے موضوع کے رسمی و تقلیدی طرز ادا میں مضمر ہے ؛ نہ کہ خود موضوع میں - یہ پرجوش محبت ' جس کا اظہار بہ کثرت خیالی تشبیہوں اور ادبی نزاکتوں کے ذریعے کیا جانے لگا تھا ' وہ محبت نہیں ہے جس کا اظہار عوام کے سیدھے سادے جذباتی گیتوں میں ہوتا تھا - یہ ایک جذباتی اصول' رومانی مسلک اور مرضیاتی حالت ہے جس کو مصنوعی طور پر قوی کیا جاسکتا ہے - اِس کا مطمح نظر دوشیزہ کی ذات سے حاصل نہیں ہوتا - بلکہ بیوی سے جس کی پرستش و خدمت سے شاعر کو ایسی اخلاقی قوت حاصل ہوتی ہے ' جو اُس کی زندگی کو مالامال کردیتی ؛ اور اُس کے جوہر شرافت کو

1—Monsieur Anglode

2—مشکل ہی سے یہ کہنے کی ضرورت ہے کہ جو کچھ بیان کیا جائے گا اُس کا مقصد دوسرے تہذیبی ماخذوں جیسے لاطینی ' یونانی وغیرہما سے انکار کرنا نہیں ہے اور نہ مقامی نشو و نما کی وسعت کو ناقابل اعتنا سمجھنا ہے -

چمکا دیتی ہے۔ محبت کا یہ فن، یہ خاتونی مسلک کہاں سے آیا؟ یہ چیز اُن رائج الوقت رسم و رواج سے پیدا نہیں ہوئی جو تیوتانی یا رومانسی ادب العوام سے ظاہر ہوتے ہیں۔ برانتیر [1] نے لکھا ہے کہ "کرۂ ارض پر ہر زمانے اور ہر جگہ، قانونِ قوت و بربریت کے ہاتھوں، عورت جتنی ذلیل و خوار ہوئی، معلوم ہوتا ہے کہ اُتنی ہی ذلیل و خوار وہ عہد وسطیٰ کی پورژوا زندگی میں بھی رہی"۔ یہ بات صنف نازک کے لیے فداکاری کے اُن جدید تصورات میں بھی کسی طرح مضمر و مقدر نہیں تھی جنھوں نے اب اعلیٰ طبقے کے لوگوں میں بھی اپنی روح پھونکنا شروع کردی تھی۔ ایسی مصنوعی جذبات پرستی اور اُس کے عسکری مسلک میں کوئی چیز مشترک نہیں ہے۔ عورتوں کے متعلق اِس جدید مسلک کا تصور، کلیسائی تصور دوشیزگی کے بالکل مخالف ہے۔ اگر یہ چیز پیشہ ور شاعر اور اُس کی مربیہ کے فطری تعلقات سے پیدا ہوئی ہوتی تو اِس کا لہجہ زیادہ انکسارانہ ہوتا۔ اِس جدید رجحان کا سراغ لگانے میں عہد زریں یا عہد سیمیں کا یونانی، لاتینی ادب کسی نفسیاتی بنیاد کا کام نہیں دیتا۔ تاہم اِس کی بنیاد، نمایاں طور پر، مسلمہ ادبی روایات پر رکھی جاتی ہے؛ اس لیے ادبی روایات کے اِس اِمکانی ماخذ کو کم از کم عربی اسپین کی شاعری میں تلاش کیا جاسکتا ہے [2]۔

گیارھویں صدی عیسوی تک، عربی شاعری پر، نشو و ارتقا کا ایک طویل دور گزر چکا تھا۔ لیکن اِس طویل دور میں، اُس پر کوئی زمانہ ایسا نہیں گزرا؛ جب کہ عشق و محبت اُس کا ایک خاص سرچشمہ نہ

1—Brunetiere

2—اِس موضوع پر مزید بحث کے لیے ملاحظہ ہو برداخ کی کتاب "قرون متوسطہ کی عشقیہ شاعری کی اصل" (K. Burdach's "Über den urspring den mittelälterlichen minneasangs" in S. B. preuss. Akad. Wim., 1918.)

رہا ہو - بدویت کی قدیم فنی شاعری؛ صاف و شستہ زبان میں کھنچی ہوئی روایتی لفظی تصویروں، طویل تشبیہوں، مرکب بحروں اور بے عیب قافیہ پیمائی، سے بھری پڑی ہے، (اور مغربی زبانوں میں سب سے پہلے عربی زبان ہی نے مکمل قافیے کو اپنی نظم کا جزو لازم قرار دیا ہے) - اور اُس میں ہر قصیدے کا کسی محبوبہ کے بچھڑ جانے کے ماتم سے شروع ہونا ضروری ہے؛ جس کی یاد، اُجڑے ہوئے رزم گاہ کی بازدید سے، تازہ کی جاتی ہے- شاعری جب شہروں میں منتقل ہوئی، تو عشقیہ محرک، زیادہ قوت سے اثر ڈالنے لگا؛ اور ایک نئی شایستگی نے کھلی لذتیت[1] کی جگہ لے لی - قصیدے کے بجائے مختصر عشقیہ نظمیں رائج ہوئیں؛ جن میں شاعر، خود اپنے ذاتی جذبات اور اپنی شخصیت، ظاہر کرنے لگا - جب تک عربی شاعری، معین اسلوبوں اور مقرر قاعدوں کی پابند نہیں ہوئی؛ اُس وقت تک وہ اِس نئے سرچشمے سے لطف اندوز ہوتی رہی - یہ شاعری قید و بند سے آزاد تھی؛ مسرت خیز تھی؛ اور زندگی سے مطابقت رکھتی تھی - ایک طرف تو درباری شاعروں کے ہاتھ میں پڑ کر، وہ ادنیٰ جذباتی اور ناقابل التفات مصنوعی شاعری ہو کر رہ گئی؛ جس میں اصلی جذبات کی گرمی کے خلا کو پر کرنے کے لیے ہیجان آور موسیقی میں، ادبی صناعیاں جمع کی جاتی تھیں - عوام میں اُس کو ایک نئے ہی فن میں کام دینا پڑا؛ یعنی کشتۂ محبت، نوجوان عاشق کے رومانس کے لیے، جس کی زندگی خالص جذبۂ محبت میں کسی ناقابل حصول اور خیالی محبوبہ کے قدموں پر نثار ہو جاتی ہے - پھر پر عظمت اور روحانی عشق کی اِس لفظی نقاشی میں جو تصوری عناصر موجود تھے، اُن سے صوفیوں نے اپنے محبوب سے روح کی لافانی محبت کو مجازاً ظاہر کرنے کا کام لیا -

---

Hedonism—1

عربی و فارسی، دونوں کی، صوفیانہ شاعری پر، ارضی محبت کا بےباک حسی تخیل کارفرما ھے - بعض عرب شاعروں نے، جس کو پرشکوہ لفاظی اور عربی زبان کی متداول تشبیہوں اور استعاروں میں بیان کیا تھا ؛ اور جس کو دوسروں نے، مابعد الطبیعیاتی خیال آرائی سے پاک و صاف اور نازک بنا دیا تھا ؛ اُس میں ایرانیوں نے ایک نئی حلاوت و سادگی پیدا کر دی، جس کی تزیین، لطیف خیال آرائیوں سے کی گئی - یہ چیز قدرتاً ایرانیوں کے تخیل سے پیدا ھوتی ھے - عشقیہ شاعری کے اِن سب نمونوں کی سرنوشت میں، یورپ کی تاریخ ادبیات میں حصہ لینا لکھا تھا -

اِس نئی عشقیہ شاعری کی سب سے زیادہ قابل توجہ خصوصیت یہ ھے کہ اِس میں خالص روحانی محبت (جس کو اصطلاحاً فلاطونی محبت کہا جاتا ھے) کے معین ادبی قوانین پیدا ھو جاتے ھیں، جس کے ساتھ محبت کا معاشری و اخلاقی نظریہ بھی شامل رھتا ھے ! یہ خدمت نمایاں طور پر اسلام نے انجام دی ھے - آٹھویں صدی عیسوی کے آخری زمانے ھی میں دربار بغداد کے بعض شعرا نے اپنی شاعری کو خاص اِس قسم کے فن عشق کے نذر کر دیا تھا - پوری ایک صدی بھی گزرنے نہ پائی تھی کہ ایک نوجوان، جس کی ابھی مسیں بھی نہیں بھیگی تھیں، اور جس کو اسلام کے ایک انتہائی پرھیزگارانہ دبستان شریعت کے بانی کی اولاد و جانشین ھونے کا فخر حاصل تھا ؛ اپنی عدیم المثال دلچسپ کتاب میں، قوانین محبت مدون کرتا ھے - ابن داؤد نے اپنی کتاب العشق میں عشق کے ھر رخ کی وضاحت اشعار سے کرتے ھوئے اُس کی حقیقت، اُس کے قوانین اور اُس کے طریق اظہار و اثرات کی تفہیم اور اُس کی تقسیم کی ھے - اور یہ سب کچھ اُس تصور کی روح کے مطابق،

جس کو اسلامی روایات نے نبی صلعم سے منسوب کیا ہے کہ جس نے محبت کی، پاک دامن رہا، اور اپنی محبت کو چھپاتا رہا، اور اُسی حال میں جان دی، تو اُس نے شہادت حاصل کی [1] -

دنیائے اسلام کے تہذیبی اتحاد کی وجہ سے اِن شاعرانہ فنون کا اسپین میں بھی ترقی کرتے رہنا یقینی تھا - عام آبادی کے عربی و اسپینی عناصر کی آمیزش و اتحاد، اور شمال کی نصرانی قوتوں سے پیہم کشمکش کی وجہ سے، یہاں اِن فنون کی ترقی بیرونی اثرات سے الگ آزادانہ خطوط پر ہوئی - عربی ادب کے کسی دور میں بھی آبادی کے ہر طبقے میں ذوق شعریت اِس قدر وسعت سے نہیں پھیلا - اور ذوق شعریت عبارت ہے قلب و دماغ کے حسن و خوبی کے اثرات کو اخذ و قبول کرنے کی صلاحیت اور اُن اثرات کو پرجوش و دل آرا طریقے سے الفاظ کا جامہ پہنانے کی قوت سے - بےشمار معروف و غیرمعروف شاعروں میں سے سعید ابن جودی کی سرودی نظمیں مثال کا کام دے سکتی ہیں، جن کو دوزی [2] نے بھی نقل کیا ہے - اُن میں بھی فلاطونی محبت کا تصور عام طور پر قبول کر لیا گیا ہے - مسلمانوں میں ابن حزم کا نام اپنی مذہبی خشکی اور سخت مناظرہ پسندی کی وجہ سے ضرب المثل ہے؛ اور مذہب کے تقابلی مطالعے کے علم کا بانی ہونے کی حیثیت سے مغرب میں اُس کا احترام کیا جاتا ہے! تاہم اِس شخص نے بھی عشق کے موضوع پر ایک رسالہ سپرد قلم کیا ہے اور خود اپنے اشعار سے وضاحت

1—من عشق و عف و کتم و مات نمات شہیدا -

2—"تاریخ مسلمانان اسپین"، جلد دوم، صفحہ ۲۱۷ (Historie des Musulmans de L' Espagne) انگریزی ترجمہ از اسٹوک (Stokes) "اسپینی اسلام" (Spanish Islam) صفحات ۳۳۲ تا ۳۳۵ -

کرتا گیا ہے - یہ رسالہ کتاب العشق [1] کے ہم پلہ ، بلکہ اُس سے بھی بڑھا ہوا ہے - فلاطونی محبت کے نظریے کو ابن حزم اِس حیثیت سے قبول کرتا ہے کہ اُس کے ذریعے سے کسی جذبات سے عاری شخص کا اعلیٰ جوہر ارضی اتحاد حاصل کرتا ہے - اُس انتہائی خالص رومانیت کی روح سے وہ تحلیل محبت بے نقاب ہوتی ہے جو آنے والی صدی میں کئی حیثیتوں سے متعدد طروبوں [2] کی خصوصیت ہے؛ لیکن جس کی تابناک عظمت تک وہ مشکل ہی سے پہنچ سکتے ہیں -

ہرچند کہ اندلسی [3] شاعری کا بہت بڑا حصہ سادہ، پرجوش اور فطری تھا تاہم جو کچھ ہم تک پہنچا ہے وہ زیادہ تر درباری شاعروں (خواہ عورتوں کا ہو یا مردوں) کا پرتصنع کلام ہے - یہ شعرا اپنے فن کے وہ خواص تھے جن سے اُمرا و وزرا بھی مسابقت کرتے شرماتے تھے - نہیں ، بلکہ وہ خود اُمرا و وزرا سے کسی طرح کم نہیں تھے - اندلسی تہذیب کی اِس درباری عمارت میں رفتہ رفتہ شاعرانہ صنعت گری کا ایک نیا ایوان تیار ہوا - منظوم قصوں اور یک قافیہ نظموں کے ساتھ ساتھ جن کے اشعار کی بحریں اور اوقاف مساوی ہوتے تھے؛ اندلسی عشقیہ نظموں میں، شاعر، ایک نئی ترکیبی وضع کو ترجیح دینے لگے، جس کے ہر مصرع میں طویل ردیفیں اور پیچیدہ عروضی ترکیبیں ہوتی تھیں - گو اب بھی اُن میں لفظی وزن کی پیروی کی جاتی تھی- لیکن معلوم ہوتا ہے کہ طروبوں کی شاعری تک پہنچنے کے لیے صرف ایک ہی زینہ باقی رہ گیا تھا - طروبوں کی شاعری

1—ابن حزم متوفی ۱۰۶۴م طارق الحمامة - اِس کو پیٹراف (Petrof) نے اپنے مقدمے کے ساتھ لیدن سے ۱۹۱۴م میں شائع کیا -

Troubadours—2

Spanish-Arabic—3

بھی اصلاً فنی شاعری تھی، جو درباریوں اور درباری شاعروں کی پیدا کی ہوئی تھی - جس میں مصنوعی قاعدے، قانون اور مرکب بند استعمال کیے جاتے تھے - اب ایک ہی مشکل کا حل باقی رہ جاتا ہے - ابتدائی طروبوں میں سے کوئی بھی عربی نہیں جانتا تھا ! تو پھر اِس فن کو اندلس سے پراونس میں منتقل کرنے والا درمیانی واسطہ کیا تھا ؟

یہ بات کھلم کھلا تسلیم کرلینا چاہیے کہ گو توزی کے زمانے سے اب تک بہت سی چیزیں منظر عام پر آچکی ہیں، لیکن ابھی تک اِس مسئلے کا مکمل حل نہیں پیش کیا جاسکتا - یہ بات اب اِتنی اچھی طرح ثابت[1] ہوچکی ہے کہ اِس میں مزید بحث کی گنجائش نہیں - وہ یہ کہ اندلس کے "موروں" کی غیر معمولی تعداد صرف نسلاً ہی اسپینی نہیں تھی ؛ بلکہ اعلیٰ سے لےکر ادنیٰ تک، سب کے سب، عادتاً، بغیر اجنبیت محسوس کیے، رومانسی زبان سمجھا اور بولا کرتے تھے - اسپینی مسلمانوں نے عربی تہذیب کو اپنے آپ میں جذب کرنے کے علاوہ اُس میں اضافہ بھی کیا - چنانچہ اندلسی تہذیب کی بہت سی نمایاں خوبیاں اِسی اختلاط و امتزاج کی رھین منت ہیں - اندلس کے وہ عیسائی باشندے جو نیم عرب (جیسا کہ خود لفظ مستعربہ سے ظاہر ہے) ہوچکے تھے ؛ اکثر عربی ادب سے بھی بخوبی واقف ہوا کرتے تھے ! جب موقع ملا تو اُن لوگوں نے شمالی سلطنتوں میں اسلامی تہذیب کے بہت سے پودے منتقل کیے - تاریخ نظم اندلس میں کچھ اِسی قسم کا عمل اثراندازی و اثرپذیری پنہاں ہے ؛ اور تاریخ نظم اسپین میں تو یہ بہت زیادہ ہے - اسپینی دماغ نے استروفی[2] طرز کے عروض کی ترقی میں بڑا حصہ لیا ہے ؛

1—رائے بیرا (Don Julion Ribera) "مقالات و رسائل" Diser taciones y Opusclos میڈرڈ سنہ ۱۹۲۸ م - جلد اول ص ۱۲ تا ۳۵ ، ۱۰۹ تا ۱۱۲ -

2—Strophe

لیکن اُس کے رد عمل ہیں' وہ فنی خوبیاں' جن پر عربی عروض و قافیہ کے قوانین نے ' اپنی ادبی صورت یعنی موشحہ کے ذریعے استروفی طرز عائد کردیے تھے ؛ مقبول عام ذولسانی گیت (زجل) میں دوبارہ ظاہر ہوئیں اور اِسی ذریعے سے یہ فنی خوبیاں خالص رومانسی شاعری میں داخل ہوئیں -

مقبول عام Villancico یعنی دیہاتی گیت اور زجل کے ہم‌جنس ہونے پر مشکل ھی سے بحث کی جاسکتی ھے - خواہ رومانی گیتوں میں عام طور پر ثابت شدہ عربی عناصر کتنے ھی کم کیوں نہ ھوں ' یہ فرض کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ اِس عمل تاثیر و تأثر کا دائرہ صرف اُصول فن یا صرف ایک خاص قسم کی شاعری ھی تک محدود رہا ہوگا - عربی و اسپینی دونوں روایات کی ترکیب و آمیزش دکھانے کے لیے اسپینی زبان کے نثری ادب میں "تاریخ عام"[1] متوازی مثال کا کام دیسکتی ھے[2] -

اِس طرح ارتباط کا ذریعہ وھی ہردلعزیز زجل اور اُس کی ہم‌شکل رومانی چیز دیہاتی گیت تھی - خوش قسمتی سے اِس ہردلعزیز ادب کا ایک قیمتی حصہ تلف ہونے سے بچ گیا ھے - یہ کوئی ڈیڑھ سو کے قریب نظموں کا مجموعہ ھے جس کو ابن خزمان نے بارھویں صدی کے ابتدائی زمانے میں روز مرہ کی بیچ میل زبان میں لکھا ھے - گو ابن خزمان ابتدائی دور کے طروبوں کا ہم عصر تھا ؛ تا ہم خود اُس کو اعتراف ھے کہ اپنی نظموں میں اُس نے مسلمہ قواعد و ضوابط ھی کی پیروی کی ھے - اُس کی شاعری بلحاظ وزن و فن عربی ھی ھے - لیکن اُس میں عروضی

1—Croniea general

2—ملاحظہ ہو کیلّی (Fitzmaurice-kelly) " اسپینی ادبیات کی ایک جدید تاریخ" (A new history of Spanish Literature)' لندن ۱۹۲۶ م' ص ۲۴ ؛ اور پیڈال کی "دیہاتی گیتوں کا مجموعہ" : (R. Menendez pidal's El Romancero)

انقلاب کے مکمل ہونے کے آثار موجود ہیں—اس لیے کہ اب وزن کا انحصار نبرے پر ہوگیا تھا نہ کہ لفظ پر - اُس کے بند "طائفہ" کے گیتوں کی ضروریات کو پیش نظر رکھ کر فن‌کارانہ طور پر ترتیب دیے گئے تھے - جیساکہ راےبیرا نے واضح کیا ہے اُس کی اکثر نظمیں ڈرامائی قصے ہیں، جو جہاں‌گشت نقالوں کے کھیلنے کے لیے تیار کیے گئے تھے - اُس کے بندوں کا ، ابتدائی پراونسی شعرا کے عروضی نظام سے مقابلہ کرنے سے، دونوں میں قابل لحاظ مشارکت عیاں ہوتی ہے - ولیم پائٹوی[1] کی بعض نظمیں تو اُن ہی بحروں میں لکھی گئی ہیں جن کو ابن خزمان نے استعمال کیا تھا ؛ اور بعض نظمیں ایسی ہیں جن میں ابن خزمان کی استعمال کردہ بحروں سے کچھ ہی مختلف بحریں استعمال ہوئی ہیں - جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بحریں ابتداءً تو "طائفہ" کے گانے کے لیے ، وضع کی گئی تھیں؛ لیکن اُنھیں انفرادی گیتوں کے لیے بھی قابل استعمال بنا لیا گیا تھا - علاوہ ازیں، پراونسی شاعروں کی بے راہ‌روی و بے اصولی سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسا عروض استعمال کر رہے ہیں جو ابھی تک خود اُن کے یہاں عام طور پر تسلیم نہیں کیا گیا تھا - دراں‌حالیکہ اندلس کی طائفہ شاعری ، اپنی موسیقانہ اور وزنی ضروریات کی وجہ سے عربی نمونوں سے اِس قدر مطابق تھی کہ اُس کا اثر الفانسو الملقب بہ حکیم[2] کی نظموں اور نسبتاً بعد کے اسپینی شاعروں کی پراونسی شاعری سے اب بھی ممتاز کیا جا سکتا ہے[3] -

ایک آخری موضوع پر ابھی بحث کرنا باقی ہے - ابن خزمان کی نظموں میں کسی طرح وہ شایستہ جذبات نہیں جھلکتے جو اندلس کی

1- William of Poitiers

2- Alfonso the Wise

3 —راے بیرا کی مذکورہ کتاب ، ج ۱ ، ص ۳۵ تا ۹۲ -

درباری شاعری کی خصوصیت ھے؛ اور نہ اُن سے مروجہ گیتوں کے سچے رومانس ھی کا اظہار ھوتا ھے - گو ولیم پائٹوی کی شاعرانہ پیداوار اِس قسم کے گندہ اخلاق کے اثر سے زیادہ پاک نہیں ھے؛ تاھم اندلس کی اِن عامیانہ نظموں اور پراونس کے درباری شاعروں کے قدیم مطمح نظر میں زمین آسمان کا فرق معلوم ھوتا ھے - لیکن ابن خزمان کی شاعری سے اسپین کے عربی معاشرے کے' حیرت انگیز زوال کا ' پتا لگتا ھے - عرب نثار اپنی تحریروں میں' مشہور نظموں کے جو اشعار کہیں کہیں نقل کرتے ھیں ' اُن کے دیکھنے سے' بظن غالب یہ اندازہ ھوتا ھے کہ دوسری مقبول عام شاعرانہ پیداوار میں' درباری شاعری کے تصورات' زیادہ صحیح طور پر منعکس ھوتے ھیں! یہ بات خاص کر گیارھویں صدی میں زیادہ نمایاں ھے' جب کہ اندلس کی تہذیب کا آفتاب اپنے نصف النہار پر تھا -

شہادتوں کے اِس مختصر سے تبصرے سے' یہ بات صاف طور پر معلوم ھوتی ھے کہ اندلس کی درباری شاعری اور پراونس کی شاعری میں بلحاظ کیفیت و کمیت جو متجانس عناصر پائے جاتے ھیں' اُن کے موجود ھوتے ھوئے یورپی ادب پر اسلامی اثر کے نظریے کو آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا - بہت سے ایسے گوشے بھی ھیں جو ھنوز وضاحت طلب ھیں' اور اِس کے سوا دوسرے مسائل بھی ھیں جن پر غور کرنا ھے؛ جیسے اندلسی اور پراونسی شاعری میں راگ کے لوازمات' جو زیر بحث مسئلے پر بہت کچھ روشنی ڈال سکتے ھیں [1] - علامہ مائکیل [2] کا دعوی

---

1 — ملاحظہ ھو راے بیرا کی کتاب "قرون متوسطہ کی عربی موسیقی کی تاریخ" سنہ ۱۹۲۷ء Historia de la musica Arabe Medieval : اور فارمر (H. G. Farmer) کی کتاب "عربی موسیقی کے اثرات کے متعلق چند تاریخی حقائق" سنہ ۱۹۳۰ع (Historical Facts for the Arabian musical influence) - یہاں ایک (ملاحظہ ھو صفحہ ۲۰۲)

ھے کہ "جس طرح اھل یورپ اپنے مذھب کے لیے ارض یہود کے رھین منت ھیں، اُسی طرح اپنے رومانس کے لیے وہ خطۂ عرب کے زیربار احسان ھیں"۔ اگر ھم صاحب موصوف سے فی الحال پوری طرح متفق نہیں ھو سکتے، تو کم سے کم یہ کہنا تو حق بجانب معلوم ھوتا ھے کہ عربی شاعروں نے، یورپ کی جدید شاعری کے عروج و ارتقا میں، کسی نہ کسی طرح ضرور حصہ لیا ھے۔

دوسرا خطہ، جہاں سے یورپ پر اسلامی اثرات پڑ رھے تھے، صقلیہ کی نارمن بادشاھت ھے؛ جن کی روایات کو خاص کر شہنشاہ فریڈرک ثانی نے قائم و جاری رکھا تھا۔ اِس میں تو کسی قسم کا شک و شبہہ نہیں ھے کہ عربی شاعری، نارمن بادشاھوں کے دربار میں بھی پھولتی پھلتی رھی۔ لیکن اگر تمام اِبتدائی شعری پیداوار تلف نہ ھوئی ھو، تو ھم کہ

مختصر ذیلی فقرے میں اجمالا اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا جا سکتا ھے کہ رومانسی شاعری کی فنی اصطلاحوں کا اِس نقطۂ نظر سے دوبارہ مطالعہ کیا جا سکتا ھے۔ نوریل نے Galaubua کو عربی الاصل بتایا ھے۔ جلد سوم، ص ۳۲۶۔ اور سنگر (Singer) نے Gaur dador (Senhal) اور Midons (رقیب عربی) کا حوالہ دیا ھے۔ ھیاسلک (F. W. Hasluc) نے اِس پر بھی روشنی ڈالی ھے کہ stanza کا خیال بیت (گھر) سے ھوا۔ عربی میں یہ لفظ دو مصرعوں کے لیے استعمال ھوتا ھے۔ Tensio نام اور کام دونوں اعتبار سے عربی لفظ تنازم کے مشابہ ھے۔ راےبیرا نے (مقالات وغیرہ جلد دوم صفحات ۱۳۳ تا ۱۴۹) متعدد الفاظ کے عربیفارسی ماخذ دریافت کیے ھیں؛ جن میں Trobar بھی شامل ھے۔ اِس کو طرب بمعنی راگ و نغمہ سے ماخوذ بتاتا ھے۔ لیکن اگر Trobar کا تعلق Trouver سے ھونا بھی مان لیا جائے تو یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ عربی لفظ وجد کے معنے پانے کے علاوہ، محبت یا غم کی تکلیف محسوس کرنے کے بھی ھیں۔

Mackail—2

(حاشیہ صفحۂ ھذا)

1—"شاعری پر خطبات" Lectures on Poetry سنہ ۱۹۱۱م، ص ۹۷۔ مزید ملاحظہ ھو ص ۱۲۵ کی یہ عبارت: "ھم بڑے بڑے یا کم سے کم خاص قوی محرکات کے لیے عرب سریانی سطح مرتفع (کیونکہ اِس بے میل نسل اور علاقے کے لحاظ سے فلسطین بھی اِس کا ایک حصہ ھے) کے ھم جنس ذخیروں کے مرھون منت ھیں جنھوں نے قرون وسطیٰ کو روحانی اور دماغی اعتبار سے اُس دنیا سے مختلف بنا دیا تھا جس پر روما کا سکہ رواں تھا"۔

سکتے ہیں کہ جس طرح قشتالیہ کے شاہ الفانسو الملقب بہ حکیم کے دربار میں ہوا، صقلیہ کے دبستان کی ابتدا بھی فریڈرک کے دربار اور اُسی کی سرپرستی میں ہوئی؛ اور گو عربی کتابوں کے تراجم کے متعلق بہت کچھ سننے میں آتا ہے اور اسلامی فلسفے کا ذکر بھی کچھ کم نہیں ہوتا؛ نیز پراونسی اور دیسی طروبوں کے متعلق بھی بہت کچھ کہا جاتا ہے؛ لیکن بااین‌ہمہ عربی شعرا یا عربی شاعری کا کوئی قطعی و یقینی تذکرہ نہیں ملتا - لیکن فریڈرک دوم کے خدم و حشم میں مشرقی رقاصہ و مغنیہ کا وجود قطعی طور پر ملتا ہے - عہد وسطیٰ کے صقلیہ کا محتاط مورخ یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ اگر عام پسند صقربی [1] شاعری کے متعلق ہماری معلومات زیادہ ہوتیں تو ممکن تھا کہ ہم اِس شاعری اور صقلیہ کی ابتدائی اطالوی شاعری کے زیادہ قریبی تعلقات کو منکشف کر سکتے؛ اِس سے زیادہ کا دعویٰ نہیں کرنا چاہیے کہ سوقی زبان کی شاعری کا ارتقا عربی زبان کے شاعروں کی تقلید اور اُن کے اسلامی حکمرانوں کی سرپرستی سے بہرور ہونے کی وجہ سے ہوا [2] - تاہم یہ ایک نمایاں حقیقت ہے کہ اطالوی زبان کی ابتدائی عام پسند شاعری کا عروض —— جس کا نمونہ طادی [3] کی مختصر مناجاتوں اور جشنوں کے موقع پر گائے جانے والی نظموں میں ملتا ہے، لیکن اُس کی تفصیلی مثال نیچ گانوں میں ملتی ہے —— بالکل وہی ہے جو اندلس کی عام شاعری میں استعمال ہوتا تھا [4] - حتیٰ کہ عربوں کے

1—Sicilian-Arabic

2—ام اماری - تاریخ مسلمانان صقلیہ' سنہ ۱۸۲۸ م سے ۱۸۷۲ م تک' ج ۳ ص ۷۳۸ و ۸۸۹ - نیز دیکھیے جی سسرو (G. Cesareo) کی کتاب Le, Origine, della Poesia lirica e la Poesia Siciliana sotto gle, Suevi. سنہ ۱۹۲۴ م صفحات ۱۰۱ تا ۱۰۷-

3—Jacopone di Todi

4—ملاحظہ ہو جی - ایم - پلاس کی کتاب اسپینی عربی عوام کی شاعری کا اثر (ملاحظہ ہو صفحہ ۲۰۲)

خلاف پیٹرارک [1] کے شدید قومی هیجانات سے بھی، کم سے دم صرف یه ثابت هوتا هے که اطالیه میں اُس کے زمانے تک بھی، عربی شاعری کی زیادہ مقبول عام صنفیں، مروج و معروف تھیں -

رومانسی اقوام کی شاعرانه قابلیت کو اُبھارنے میں، عربی شاعری نے جو حصه لیا هے، اُس کو خواہ کوئی درجه دیا جائے؛ لیکن اِس میں تو مشکل هی سے شبهه کیا جا سکتا هے که قرون وسطی کا یورپ، عربی کے نثر ادب کا خوشه چین رها هے - گو اِس موضوع پر ابھی تفصیلی تحقیقات کرنا باقی هے - عربی میں لکھی هوئی فلسفیانه و حکیمانه تصنیفوں کا رواج هوا، تو اُسی کے ساتھ عربی ادب کے دوسرے گوشوں اور زیادہ خصوصی طور پر چھوٹی عام پسند منظوم کہانیوں، حکایتوں اور مثالوں میں بھی دلچسپی لی جانے لگی؛ که خالص عربی ادب کا بڑا حصه اِن هی پر مشتمل تھا - بہرطور اِس سے بہت پہلے، سینه به سینه روایتوں کی وجه سے عربی ادب کے عناصر اور دوسرے مشرقی قصے، شائع و ذائع هوچکے تھے- حال حال تک اُن بہت سارے قصوں کا ماخذ، مشرق هی سمجھا اور تسلیم کیا جاتا تھا؛ جو حکایتوں، نقلوں اور تمثیلوں وغیرہ کی صورت میں تیرھویں صدی میں تمام یورپ میں پڑھے اور سنے جاتے تھے - بلا شبهه اُن میں اور مشرقی و هندی قصوں میں مشابهت و مماثلت بھی موجود هے - گو علامه بادیر [1] کی تفصیلی تحقیقات نے، اِس نظریے کی حمایت میں جو

اطالوی شاعری پر - J. M. Millas, influencia de la Poesia Popular Hispano-musulmana en la poesia italiana, Revista de' Archivos &c., سنه ۱۹۲۰ء تا سنه ۱۹۲۱ء - یه بات بھی قابل غور هے که صقلوی رچرڈ سان جرمانوی کی کتابوں سے عربی تاریخی تالیفوں کی ایک نمایاں خصوصیت کا اظہار هوتا هے یعنی وہ اپنی تاریخ میں نظموں کے اشعار اور مصرعے نقل کرتا هے -

1—Petrarch. 2—Bedier

دلیلیں پیش کی جاتی ہیں اُن کو بڑی حد تک کمزور کر دیا ہے [1]؛ تاہم اب بھی عام ادب میں ایسے بڑے بڑے حصے موجود ہیں، جن کے کم سے کم ذیلی قصے، مشرقی کہانیوں ہی سے ماخوذ ہیں - بلانچمین [2] کی داستان جرمنی رزمیہ "رولان کا گیت [3]" اور شمالی یورپ کے دوسرے فسانوں اور عربی قصوں میں قریبی مشابہتوں کو نشان‌زد کیا گیا ہے - بلکہ داستان Grail-Saga کے ایک قصہ نویس نے تو اپنے ماخذوں میں ایک عربی کتاب کا بھی ذکر کیا ہے - عربی محرکات کا جو مظاہرہ، قدیم فرانسیسی داستان Tloireet Blanchef bear میں ہوا ہے؛ وہ Ahcossin at Nicollate کے دلکش قصے سے تعلق رکھنے کی وجہ سے زیادہ قابل توجہ ہے - کیونکہ خود اِس میں اندلسی اصل کی بے خطا شہادتیں (جیسے قصے کے ہیرو کا عربی ــــ القاسم ــــ نام) اور نظم و ترتیب کی متعدد تفصیلیں موجود ہیں [4]- اگر یہ کہا جائے کہ فرانسیسی ادب کے عدیم‌النظیر گیت، کہانی، رائج‌الوقت عربی رومانسی کی ایک مقبول عام صورت ہے؛ تو اِس سے فرانسیسی جہاں‌گرد شاعر کے شرف و مزیّت کو کسی طرح کوئی صدمہ نہیں پہنچتا، جس نے حسن و نزاکت کا ایسا شاہ‌کار پیدا کیا ہے -

---

1— چےبادیر - "چھوٹی عام پسند منظوم کہانی" سنہ ۱۹۲۵ م -

2— Iaol de Blnchemain

3— Roland slied

4— اِس کے لیے عام طور پر سنگر کا مضمون "قرون متوسطہ میں عربی و یورپی شاعری" ملاحظہ ہو جو پروشیا کی مجلس علوم کی روئدادوں میں شامل ہے - "Arbiche and eiropaische Poesie in Mitelater" in Abh. Preuss. Akad. Wissenschaften. سنہ ۱۹۱۸م؛ اور رسالہ برائے جرمن علم‌اللغۃ - سنہ ۱۹۲۷ع Z. Fur deut. Philologie صفحات ۷۷ تا ۹۲ - اور Aucassin کے لیے بورڈیلان کا نسخہ (F. W. Bourdillon) مینچسٹر، سنہ ۱۹۱۹م، صفحات ۱۴ و ۱۵ -

جیساکہ قوی توقع تھی، عربی زبان کے رحلی ادب اور فن جہاں‌نگاری نے بھی مغربی ادب پر اپنے اثرات چھوڑے ہیں- کیونکہ اہل یورپ کے نزدیک سفر کرنے کے خاص معنے، بغرض زیارت ارض مقدس جانے ہی کے تھے - یہ بہت بڑی حد تک ناگزیر تھا کہ محض سینہ بہ سینہ روایتوں کے ذریعے، تمام فسانہ‌زا و حیرت‌خیز عناصر، مغرب کے کونے کونے تک پہنچ جائیں - اِس طرح کے قصے کہانیوں نے، بہت سے دوسرے مصنفین و مولفین کے علاوہ مارکوپولو اور سر جان میان ڈیول [1] کے لیے بھی تخیل آرائی کا سامان فراہم کیا - لیکن اِن واقعات سے یہ سمجھنا چاہیے کہ اِن کی وسعت، مغرب کے صرف لاتینی ممالک تک ہی محدود رہی - غالباً بحیرۂ خزر و بحیرۂ بالٹک کے تجارتی راستے سے ایسے قصص و حکایات، آئرستان و اسکنڈی‌نیویا تک پہنچ گئے تھے اور "مقدس برن ڈام کا فسانہ" جیسی کہانیوں میں وہ دوبارہ نمودار ہوئے - اِس قسم کے فسانے، سوداگر اور بھاٹ، شام کی صلیبی مملکتوں اور بحیرۂ متوسط کی مشرقی بندرگاہوں سے اپنے ساتھ یورپ لایا کرتے تھے - یہ بالکل اغلب ہے کہ اِن زبانی ذریعوں ہی سے بوکیاکشو [2] نے مشرقی افسانے جمع کر کے اپنی کتاب Decamerone میں شامل کر دیے ہوں - چاسر کی "زمینداری کی کہانی [3]" "الف لیلہ" ہی کا ایک قصہ ہے، جس کو اطالوی تاجر، غالباً بحیرۂ اسود سے یورپ لائے؛ کیونکہ اِس قصے کا محل وقوع، جھیل والگا کے کنارے منگول خاں کے دربار میں بتایا گیا ہے -

Sir, John man Deville—1

Boccaccio—2

Chaucer's Squieres Tale—3

چودھویں صدی عیسوی میں، عربی کہانیوں کی زبانی نشر و اشاعت کے ساتھ ساتھ، عربی میں لکھے ہوئے فسانوں کے مجموعوں کے مختلف ترجمے بھی شائع ہوئے؛ جو جدید خواندہ طبقوں کی تفریح کے لیے تیار کیے گئے تھے - اِن مشرقی قصوں کو، عہد وسطیٰ کے متداول قصوں پر صرف اِن کے تنوع اور شستہ ادبی طرز ادا ہی کی وجہ سے ترجیح نہیں دی جاتی تھی، بلکہ سب سے زیادہ یہ بات تھی کہ شان‌دار تخیل کی نمائش کے علاوہ اُن سے اخلاقی استفادہ بھی مقصود ہوتا تھا - ادبی مذاق و ادبی طرزبیان، دونوں اعتبار سے، قرون وسطیٰ کے مسلمانوں اور نصرانیوں کے اتصال کا نقطہ، اِسی مقام پر تھا - عوام، قصے کہانیاں اِس لیے سنا کرتے تھے کہ وہ اُن کو پسند کرتے تھے؛ اور عام طور پر اِن کہانیوں سے کوئی اخلاقی نتیجہ نکالنے کا کام بھی نہیں لیا جاتا تھا - لیکن بہ حیثیت فن ادب، قصہ کہانی یا افسانے کی جگہ کسی اخلاقی چاردیواری ہی میں ہوتی ہے- کسی محرر کا عام مقصد فن، حکومت کی تعریف کرنا یا اچھی طرح زندگی گزارنے کے فرائض بتانا یا اخلاقی خوبیوں کا بیان کرنا ہوتا ہے - اِس قسم کی کتابوں کی عربی میں بڑی کثرت تھی؛ جن میں سے کچھ تو قدیم ہندوستانی حکایتوں سے لی گئی تھیں، اور کچھ دوسرے مشرقی

ادبی خزانوں سے ماخوذ تھیں (بلاشبہہ اُن میں بہت کچھ یونانی الاصل بھی تھا)، اور کچھ حصہ مشرقی تاریخ کے افسانوی معترضہ قصوں اور تاریخی واقعات سے منتخب کیا گیا تھا - اُس زمانے میں ادبی ملکیت کا یقیناً کوئی تصور موجود نہیں تھا - عالم اسلام و دنیائے نصرانیت دونوں جگہ، مصنف یا قاری، جدت مضمون کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں؛ اور نہ نفسیاتی اختراع کی صلاحیت زیادہ وزن رکھتی ہے - اگر فی الوقت طرز ادا و اسلوب نگارش کے سوال کو علحدہ رکھیں، تو کہہ سکتے ہیں کہ معلوم و مانوس مواد کو، جدید صورت میں پیش کرتے ہوئے، ایک اخلاقی موضوع پر لکھنے والے کا کمال، اُس کی قوت انتخاب و ترتیب میں مضمر ہوتا ہے - عربی حکایتیں ایک ملک سے دوسرے ملک میں منتقل ہوتی رہیں؛ اور فسانہ نگاری کی محرک ہوتے ہوئے اپنے زمانے کی بہت سی آزاد تصلیفوں میں بھی جگہ پاتی رہیں - اِس طرح حکایتوں نے قرون وسطیٰ اور مابعد کے یورپی ادب کی تشکیل میں بڑا حصہ لیا -

اِس قسم کی بہت سی کتابوں میں سے، جن کا عربی سے، خاص کر یہودیوں نے ترجمہ کیا تھا، بطور نمونہ تین منتخب کی جاسکتی ہیں- عربی زبان میں ایک کتاب "سلدباد" (جہازی نہیں) ہے جو اصلاً سلسکرت سے ماخوذ ہے؛ اور اب اپنے اصلی ماخذ ہی کی طرح ناپید ہوگئی ہے - قرون وسطیٰ کے بہت سے فسانوں کا ماخذ یہی کتاب ہے، جن میں سیلدبان سریانی میں لکھی گئی تھی - قرون وسطیٰ کا یونانی قصہ، اِسی سریانی نسخے سے ماخوذ ہے - اِسی قسم کا ایک اور عبرانی افسانہ موجود ہے - (سیندباد) یہی فسانہ، کئی مرتبہ فارسی میں لکھا گیا؛ جن میں سے بعض، عربی و ترکی میں دوبارہ

منتقل کیے گئے - اِن سب قصوں میں سے بہتوں کی قسمت میں، اٹھارھویں صدی میں، یورپ پہنچنا لکھا تھا - عبرانی زبان کا سندبار ایک طرف تو غالباً تیرھویں صدی کے ایک اسپینی فسانے " پہلیوں کی کتاب[1] " کا ماخذ ہے، اور دوسری طرف چودھویں صدی کے لاتینی " سات عقلمندوں کی کہانی[2] " کا بھی - اور یہی لاتینی قصہ ایسے متعدد قصوں کا ماخذ ہے، جو نظم میں لکھے گئے، جن میں سے ایک " روما کے سات عقلمند[3] " انگریزی میں لکھا گیا -

دوسری کتاب، قدیم فلسفیوں کے اقوال کا ایک مجموعہ ہے، جس کو گیارھویں صدی میں، کسی مبشر بن فاتک نامی نے، مصر میں تالیف کیا تھا - اِس مجموعے کا ترجمہ، اسپینی زبان میں " سونے کے ڈلے[4] " کے نام سے ھوا - لیکن مغربی زبانوں کے تمام نسخے، اِس کے ایک لاتینی ترجمے " کتاب فلاسفۂ اخلاق[5] " پر مبنی تھے، جن سے تگ نو وائل[6] نے " فلسفیوں کے اخلاقی مقولے[7] " کے نام سے اپنی کتاب تیار کی - اِس نسخے کو ارل ریورس[8] نے " حکیموں کے اصول و اقوال[9] " کے نام سے انگریزی زبان میں منتقل کیا؛ جس کا ذکر گزر چکا ہے کہ یہی وہ پہلی انگریزی کتاب ہے جو کیاکسٹن[10] نے طبع کی تھی -

اِن فسانوں اور اِسی قسم کے عربی ادب‌پاروں کا اثر، اسپینی ادب میں بالکل ظاہر ہے؛ خصوصاً ابتدائی اسپینی ادب میں - مثلاً ڈان جان میانویل کو جو خود بھی عربی سے واقف تھا، اپنی کتاب

1—Libro de los Enganos
2—Historia Septem Sapientium
3—Saven sages of Rome
4—Bocados de Oro
5—Liber Philiosophorum Moralium
6—de Tignonville
7—les ditz moraux des Philosophese
8—Earl Rivers
9—The Dicts and Sayings of the Philosophers
10—Caxton

تصنیف کرنے کا خیال اِن ھی سے پیدا ھوا؛ جس کا ابتدائی حصہ بھی اُن مقدموں ھی کے نمونے پر لکھا گیا ھے، جن سے تمام عربی کتابیں مزین ھوتی ھیں[1] - اِس میں کوئی شبہہ نہیں کہ اسپینی زبان کے ابتدائی منثور ادب میں، مشکل ھی سے کوئی ایسی کتاب ملے گی، جس میں عربی سے ترجمہ شدہ مواد سے، استفادہ نہ کیا گیا ھو - لیکن اکثر یہ بات بیان کی جاتی ھے کہ یورپ میں مسلمانوں کی ادبی روایات، راست، اسپین سے نہیں پھیلیں - دوسرے بہت سے امور کی طرح اِس باب میں بھی، قرون وسطیٰ کا یورپ، اطالیہ اور جنوبی فرانس کا زیربار منت رہا ھے - جو اسلامی اثرات، اسپینی ادب پر پڑے تھے؛ اُن کا دائرہ، انگلستان و فرانس تک، ایک مدت دراز کے بعد جاکر وسیع ھوا -

تیسری مثال میں بھی، اسپین کی، نسبتاً اِسی طرح کی علحدگی نظر آتی ھے- یہ مجموعہ زیادہ مشہور بھی ھے- اِس سے ھماری مراد جانوروں کی وہ حکایتیں ھیں، جو ابتداءً سنسکرت میں لکھی گئی تھیں - کلیلہ دمنہ کے نام سے، اُن کا ترجمہ، عربی زبان میں، آٹھویں صدی عیسوی میں کیا گیا - شاہ الفانسو الملقب بہ حکیم (۱۲۵۲ع تا ۱۲۸۴) کے لیے اِس کتاب کا اسپینی زبان میں، دوبارہ ترجمہ کیا گیا - لیکن بقیہ یورپ کو اِس کا علم، صرف لاتینی ترجمے کے ذریعے ھوا؛ جس کا نام "راہ نمائے حیات انسانی[2]" تھا - یہ ترجمہ جان فالبروی[3] ایک نو یہودی نے اِسی صدی میں انجام دیا تھا - لاتینی کی اِسی

1—یہ نہیں ثابت کیا جا سکتا کہ ڈان جان نے راست عربی ماخذوں سے استفادہ کیا ھو - ملاحظہ ھو برلام و یوزافت کی کہانی - G. Moldenhauer, Die legende li on Barlaum and Pasaphate ۱۹۲۷م - صفحات ۱۰ تا ۹۴

2—Directorium humanæ Vitae

3—John of Capua

قسم کی بہت سی کتابوں جیسے ''رومیوں کی رزمیہ نظم[1] '' کا ماخذ بھی لاطینی ترجمہ تھا ؛ اور ۱۵۵۲ء میں جاکر' کہیں پہلی مرتبہ' ڈونی[2] نے اِس کو مقامی زبان میں منتقل کیا - اِس مشرقی قصے کو بعد کے زمانے میں جو مقبولیت حاصل رہی' اُس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کلاسکی احیا کے عین زمانۂ عروج میں بھی' مشرقی ادب میں جاذبیت و دل‌کشی کی صلاحیت موجود تھی - کلیلہ دمنہ کی بنیاد پر' جو بہت سی کتابیں لکھی گئیں' اُن میں تھامس نارتھ کی کتاب '' ڈونی کا فلسفۂ اخلاقی[3] '' تو اِس سلسلے کی صرف پہلی کڑی تھی - (۱۵۷۰ء) - فسانہ نگاروں بلکہ ڈرامہ نویسوں نے بھی (مثلاً میاسنجر کے ڈرامے ''محافظ'' کا تیسرا ایکٹ[4]) ' لاتینی اور مقامی زبانوں میں اِس کتاب کے مضامین اخذ کرکے جو قصے تحریر کیے تھے' وہ مدت دراز تک متداول رہے - اِس کتاب کا فرانسیسی میں '' پلپے کی حکایتیں[5] '' کے نام سے' بعد کے زمانے کی ایک فارسی کتاب انوار سہیلی سے (۱۶۴۴ء) جو ترجمہ کیا گیا ' وہ ہمارے لیے اِس حیثیت سے خاص دل‌چسپی رکھتا ہے - کیوں‌کہ مغربی یورپ سے' فارسی ادب کے' راست تعلقات کی' یہ پہلی مثال اور لافانتین[6] کی تحریروں کا ایک ماخذ ہے -

خالص عربی ادب کی ایک دوسری شاخ کا بھی' قرون وسطیٰ کے ادب میں حصہ لینا ممکن ہے - یہ ''مقامات'' تھے ؛ جو فنی اعتبار سے تمام عربی ادب میں' سب سے زیادہ مکمل چیز ہوتی ہے - گو ادبی

1—Gesta Romanorum   2—Doni

3—Thomas North's Moral Philosophy of Doni

4—Massinger's the Guardian   5—Tales of Pilpay

6—La Fontaine

قواعد و ضوابط کے اعتبار سے ''مقامات'' کا مقفیٰ و مسجع عبارت میں لکھا جانا ' اور اُن کی تزیین و آرائش میں ہر قسم کے لسانیاتی عجائب و غرائب سے کام لیا جانا ' ضروری تھا ؛ لیکن نظم و ترتیب کے اعتبار سے یہ انتہائی سیدھے سادے ہوتے تھے - ''مقامات'' متعدد غیر مربوط ضمنی قصوں پر مشتمل ہوتے ہیں؛ جن کا ہیرو ہمیشہ کوئی قسمت آزما شہسوار ہوا کرتا ہے - اُس جہاں‌گرد کے دماغ میں' حصول معاش کے لیے' ہر قسم کی بُری بھلی عیاریوں کا ایک وسیع ذخیرہ محفوظ رہتا ہے - لیکن ساتھ ہی وہ اچھی ادبی سوجھ بوجھ کا بھی مالک ہوتا ہے ؛ جس سے کام لے کر وہ اکثر نہائت اعلیٰ و ارفع اخلاقی احساسات کا اظہار کرتا ہے - اسپینی زبان کے اوباش ناول اور اِس ترتیب میں بعض مشابہتیں پائی جاتی ہیں - اِس کے ساتھ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اسپینی یہودیوں نے ''مقامات'' کی تقلید شروع کردی تھی ؛ اور یہ کہ خدائی فوجدار صفر سے دیگر مشرقی مماثلتوں کے ظاہر ہونے کے علاوہ ' اُس میں کم سے کم ری‌بالدو[1] کی ایک مبہم (پہلا اسپینی ''بدمعاش'') تو خالص مشرقی مجموعے کا ایک ضمنی قصہ ہے' جو عربی نسخے میں یوحا (یحیٰی) کے کردار سے متعلق ہے[2] - یہ بھی ممکن ہے کہ مقامات کے قصوں اور اوباشی یا حقیقت پسندانہ قسم کے ابتدائی اطالوی فسانوں میں مشابہتیں پائی جائیں' لیکن یہ پورا موضوع ہنوز تشنۂ تحقیق ہے -

عہد وسطیٰ کے یورپ میں' عربی زبان کے ایسے صاف و شستہ موضوعوں کا داخلہ ' درحقیقت عام علمی تحریک کا ایک رخ ہے -

---

1- Ribaldo

2- Revue hispanique اسپینی رسالہ نمبر ۱۰ سنہ ۱۹۰۳ء ص ۹۱ -

لاتینی تمدن کا سیلاب، قرون مظلمہ کے مذہبی دائرے کے تنگ کناروں کو توڑتا جا رہا تھا - اور عوام، ایسے معاملات کے متعلق، بہت متجسس تھے ؛ جن کو وہ اب تک صرف تقلیداً تسلیم کرتے آئے تھے - جیسا کچھ بھی لاتینی ادب اُن کے یہاں موجود تھا ' وہ اپنی تنگ دامانی، افلاس ذہنی اور فقدان جدت کی وجہ سے اُن کی تشفی کرنے کے قابل نہیں تھا ؛ اِس لیے اہل یورپ کو چار و ناچار، حسب خواہش اپنی ذہنی پیاس بجھانے کے لیے کسی دوسرے چشمے کی طرف نظر اُٹھانی پڑی - اب تک تو وہ اسلامی دنیا کی صرف فوجی و حربی برتری کو تسلیم کرتے آئے تھے اور وہ بھی طوعاً نہیں بلکہ کرہاً ؛ لیکن ندامت کے ساتھ اُن کو یہ بھی معلوم ہوا کہ علمی دنیا میں بھی وہ اُن پر فضیلت رکھتے ہیں - اِس علم و یقین کے بعد، عربی علوم کے سیلاب کے ساتھ، اسلامی منشور ادب کی یورپ میں بڑی کثرت ہوئی ؛ جس کی جڑیں کم و بیش یورپ کے تمام جدید ادبیات کی تہ تک پہنچی ہوئی ہیں - نشأۃ ثانیہ کے علمی ہیجان کا راستا اُس نے صاف کیا - خواہ اسلامی سرچشموں سے مادی طور پر، کوئی استفادہ کیا گیا ہو یا نہ کیا گیا ہو ' قرون وسطیٰ کے یورپی ادب، پر اسلام کا غالباً سب سے زیادہ اہم احسان، نظم و نثر دونوں پر، اُس کی تہذیب و تصورات کے اثرات ہیں- خواہ اِس کے ساتھ اسلامی سرچشموں سے مادی طور پر کوئی استفادہ کیا گیا ہو یا نہ کیا گیا ہو - گو یہ موضوع پیش نظر مقالے کے حدود سے باہر ہے ' تاہم حالیہ علما کی طرف سے بار بار پیش ہونے والے اِس خیال کا ذکر ناگزیر ہے کہ تخلیق عالم کے اسلامی تصورات اور معراج محمدی علیہ التحیۃ والسلام کے متعلق جو قصص و حکایات (جن میں سے بعض کا تعلق قدیم ایرانی فسانوں سے ہے) متداول تھے ؛ اُن کے بعض

اجزا، ڈوائن کامیڈی میں بھی داخل ہوچکے ہیں - یہ اجزا، راست، داخل ہوئے ہیں یا ابتدائی مغربی افسانوں جیسے "ٹنڈل کا فسانہ[1]" اور سینٹ پیاٹرک کے "جہنم[2]" کے ذریعے سے؟ کیوں‌کہ مسلمانوں کی فلسفیانہ بلند پروازیوں اور مسلمان صوفیوں کے عشق و محبت کے نقوش، اِس میں شک نہیں کہ، نہ صرف دانتے ہی کی کتابوں میں نظر آتے ہیں؛ بلکہ نئے میٹھے[3] اسلوب کی اِتباع کرنے والے دوسرے شعرا کے اہم تخیلات میں بھی یہی رنگ نمایاں ہے - دانتے کے زمانے میں اطالیہ میں عربی ادب کا جس دلچسپی سے مطالعہ کیا جاتا تھا اُس کا لحاظ کرتے، جزوی تفصیلات سے قطع نظر، یقیناً یہ نظریہ کسی طرح بعید از قیاس نہیں رہتا؛ گو فی‌الحال یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ مسئلہ اچھی طرح ثابت ہوچکا ہے - لیکن یہ خیال بڑا دلچسپ ہے، اور اگر یہ دکھایا جا سکے کہ دانتے نے ایک عظیم‌الشان مرکب تیار کیا ہے، جس میں نصرانی و کلاسکی تصوف کی میراث کو جمع کر دیا گیا ہے، بلکہ اسلام کے مذہبی تجربات کی اِنتہائی شان‌دار اور سب سے زیادہ روحانی خصوصیات کو بھی سمو دیا ہے، تو اِس سے وہ اور زیادہ عظیم المرتبت معلوم ہوگا -

عہد وسطیٰ سے رخصت ہونے سے پہلے، تھوڑی دیر کے لیے ہم کو اسپین کی طرف پلٹ کر، اُس مسئلے پر دوبارہ غور کرنا چاہیے جس کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے - یعنی اندلیسیہ کے بڑے حصے پر، نصرانیوں کے دوبارہ قبضے کے بعد، اسلامی تہذیب اور اسلامی روایات کی سینہ بہ سینہ نشر و اشاعت کے مسلسل اثرات - اِن اثرات سے بہ مشکل کوئی آخری فیصلے ہو سکتے ہیں - لیکن کم سے کم اسپینی اور اسپین کے ذریعے سے

1—Legend of Tundal

2—St. Patrick's Purgatory

3—dolcestilnuovo - اِس مبحث کے لیے ملاحظہ ہو کیٹر کی کتاب طروب H. J. Chaytor's the Troubadours - سنہ ۱۹۱۲ء، ص ۱۰۶

یورپی ادب سے اُن کا تعلق واضح ہے - جنوبی ادب کی خصوصیتوں میں حرارت اور وسیع تر و لطیف تر تخیل نمایاں حیثیت رکھتے ہیں؛ اور اِس سے کسی کو انکار نہ ہوگا کہ کسی نہ کسی حد تک یہ خصوصیتیں' ابتدائی صدیوں میں' اندلس کی اسلامی تہذیب کے ماحول اور اُن نقوش کی شرمندۂ احسان ہیں' جو اِس تہذیب نے اہل اندلس پر ثبت کیے تھے - یقیناً یہ بات صحیح ہے کہ اشبیلیہ کی فتح اور سقوط غرناطہ کی درمیانی مدت میں' اہل اندلس اور اُن کے ہم‌مذہب قشتالویوں میں زبان' روایات اور ادبی اسلوب کا اعتبار کرتے' کوئی فرق نہیں تھا - لیکن جب اسلامی قوت کے انحطاط و زوال کے ساتھ' مخالفت کی اصلی وجہ باقی نہیں رہی' اور نصرانیوں اور مسلمانوں میں دوستانہ تعلقات دوبارہ قائم ہوئے؛ تو پھر ایک نمایاں ادبی ہیجان پیدا ہوا - ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اہل اندلس' سرد اور زیادہ بےلوچ قشتالوی زبان میں' کسی چیز کی انتہائی کمی محسوس کر رہے تھے؛ جو اب تک اُن کے دردآشنا تار حیات کو چھیڑ رہی تھی - اس لیے اِس چیز کو دوبارہ حاصل کرنے کے لیے وہ اسلامی ماضی کی طرف پلٹتے - اندلسی روح کا اثر' غالباً ''عاشتان خولہ''[1] میں دیکھا جا سکتا ہے' جو زبان و بیان کی صفائی و شستگی کا اعتبار کرتے' دوسرے رومانسیوں سے ممتاز ہے - اِس کا مکمل مظاہرہ' مورسکو یعنی مولدین سے متعلق داستانوں میں ہوتا ہے - چنانچہ ''حدیث ابن سراج''[2] میں تو یہ اپنے انتہائی نقطۂ عروج تک پہنچ گیا (سنہ ۱۵۵۰ع سے پہلے) - اور ڈی ھتا کی کتاب ''خانہ جنگیاں''[3] میں بھی یہی سلسلہ چلتا ہے - آیا اِن داستانوں کا کچھ حصہ' عربی مصادر پر مبنی تھا یا نہیں؟ سو یہ سوال

1—Amalis de Gaula

2—Historia del Abencerrage

3—Gines Perez de Hita's Guerras civiles

کوئی اہمیت نہیں رکھتا - اہم چیز تو یہ ہے کہ اِن میں اسلامی و اسپینی تہذیب کا ایسا امتزاج پیدا کیا گیا ہے، جو موجودہ یورپی ادب کی تاریخ میں نقطۂ انقلاب کا حکم رکھتا ہے - یہ موجودہ ناول کا یوم پیدائش تھا - اِس حد تک تو سروانتس بھی اندلسی تہذیب کا زیربار ملت ہے؛ جس کی داستان "خدائی فوجدار"[1] کی ظرافت، پرسکات[2] کے الفاظ میں خالص اندلسی ہے (لیکن اِس کی یہ ملت کشی، عرب وقائع نگار، سید حمید بن عالی کے توسط سے یقیناً نہیں ہوئی)؛ اور یہی بات بہت سے دوسرے ایسے مصنفین پر بھی صادق آتی ہے، جن کا مرتبہ، اسپینی ادب میں، سروانتس سے کسی طرح کم نہیں ہے -

نشأۃ ثانیہ نے، مشرق کو عقبی زمین پر ڈال کر، قید و بند کی دیوار کھڑی کردی اور مشرقی اثر کے سیلاب کو روک دیا - لیکن کلاسکیت کی فرماں‌برداری ہمیشہ قائم رہنے والی چیز نہیں تھی - یورپ کی رومانی روح میری‌تن کی داستانوں، تیوتانی گیتوں اور انگریزی ڈراموں میں اپنا جلوہ دکھا چکی تھی اور اب جکڑبندیوں سے تنگ آکر اُس نے اپنے لیے راہ پیدا کرلی - نشأۃ ثانیہ کی پوری پیداوار، خواہ دیہاتی زندگی کے فسانے ہوں یا رزمیہ داستانیں یا اوباشی ناول، غرض اِن سب کو یکے بعد دیگرے ناکامی سے دوچار ہونا پڑا - پیرالت[3] نے ایک عظیم الشان قصہ چھیڑا تھا، لیکن ابھی تک دیہاتی کہانیاں اِتنی کم زور نہیں تھیں کہ اِس حملے کے بوجھ کو نہ برداشت کر سکتیں - پھر سنہ ۱۷۰۴ عیسوی میں گیلاند[4] کا کیا ہوا، الف لیلہ کا ترجمہ نمودار ہوا - حالیہ تحقیقات نے ظاہر کردیا ہے کہ یہ ترجمہ کوئی مستقل بالذات واقعہ نہیں تھا، بلکہ یہ چیز فنی کمال بیلی کے ایک طویل عمل کا

Galland – 4 Perrault—3 Prescott—2 Cervantes: Don Quixote—1

آخری نقطہ تھی - اِس کی پرورش میں حصہ لیا تھا مولدین کی داستانوں نے، مشرق کے سفر اور آبادکاری کے آغاز نے، تیورنر[1]، کارتن[2] اور برنیر[3] وغیرھم کے ھندوستانی اور ایرانی زندگی کے بیانوں اور مقامی رنگ کی دلفریبیوں نے - یہ دلفریبیاں، مختلف مشرقی سفارتوں کی پیدا کی ہوئی تھیں، جنھوں نے وقتاً بعد وقتٍ اپنی شان و شوکت سے پیرس کو خیرہ کر دیا تھا[4] - اِس میں شک نہیں کہ یہ چیزیں سطحی تھیں، لیکن اُس زمانے میں مشرق کا ایک ''رومانی'' تصور قائم کیا گیا—شوخ رنگ عجیب و غریب اور پر اسرار—اِس عجیب الخلقت مشرق سے، خود ھمارے زمانے میں بھی، خاص اغراض کے لیے کام لیا جاتا ہے - لیکن حقیقی مشرقی الف لیلہ کی کامیابی، فوری اور مکمل طور پر ہوئی - خواندہ طبقے کے تخیل کو آگ دکھا دی گئی تھی - تکمیل رواج کا حق ادا کرنے کے لیے، ناشرین ایک دوسرے پر سبقت کرنے لگے - الف لیلہ کے بعد ھی، فارسی کی ''ھزار و یک قصہ'' شائع ہوئی اور قدیم ''کتاب سندباد'' میں ''ترکی قصوں'' کی حیثیت سے دو بارہ جان پڑی - جب اصلی مواد کی رسد ختم ہو گئی، تو پیشہ ور مصنفین و مؤلفین نے اِس کمی کو پورا کرنے کا کام شروع کر دیا - گولت[5] نے ایک پوری نسل کی زندگی کے خلا کو، جعلی ترجموں سے پر کر دیا اور مانتسکو[6] کی طباعی نے ''فارسی خطوط''[7] میں معاشری تنقید کی ایک نئی صورت پیدا کی -

---

Chardin Bernier—3   Chardin—2   Tavernier—1

4—''اٹھارھویں اور اُنیسویں صدی میں مشرق کا ذکر فرانسیسی ادبیات میں'' از مارتینو Pierro Martino : L'Orient dans la litterature fram caisean XVII. et au XVIII. Siecle, سنہ ۱۹۰۶م - اور کانَنت کی کتاب ''انگلستان میں مشرقی قصہ'' M. P. Conant : "the oriental tale in England" نیویارک سنہ ۱۹۰۸م اور مورسکی قصوں کے لیے چاپلن کی کتاب ''عربی کہانی فرانس میں'' M. A. Chaplyn's Le Roman maureque en France سنہ ۱۹۲۸م

Letters Persanes—7   Montesquieu—6   Geullette—5

انگلستان میں بھی الف لیلہ کا جنون' کچھ کم نہ تھا - ''ہزار و یک'' اور ''ترکی قصوں'' کے نمودار ہوتے ہی' اُن کے ترجمے کر دیے گئے اور پھر اُن کے لگاتار نسخے شائع و ذائع ہونے لگے - گولت کی مثال سے اُس کے بہت سے متبعین نے ''فی نصف اشرفی ایک فارسی قصہ تصنیف کرنے کا'' فن بھی سیکھ لیا تھا - اٹھارھویں صدی عیسوی کے ''مشرقی'' ادب میں جس مشرق کا اظہار ہوتا تھا ' وہ ایک نہایت عجیب و غریب ملک تھا؛ جس کو دراصل رائج الوقت رومانی تخیل نے خود اپنے خیالات کے مطابق ایک نئی شکل دے دی تھی - اور اُس میں خیالی شکلوں کو خلیفہ' قاضی اور جلنوں کا لباس پہنا کر' عجیب الخلقت ہستیوں سے آباد کیا گیا تھا - ایسی کُھلی بے راہ روی کو' زیادہ مدت تک برداشت نہیں کیا جا سکتا تھا - ہملٹن [1] ' پوپ [2] اور گولڈ اسمتھ [3] کی تنقیدوں کے حملوں سے' جعلی داستانوں کا سلسلہ مسدود ہو گیا - لیکن مسدود ہونے سے پہلے وہ ادب پر اپنا نشان ثبت کرتا گیا - عہد نامۂ قدیم کے متجانس واقعات کے زیر اثر' انگلستان میں اُس نے ''مرزا کا خواب'' [4] اور ''حق جو'' [5] پیدا کیے- ''مرزا کا خواب'' تو وہ شمع تھی جس نے پہلے پہل رابرٹ برن [6] کے تخیل کو روشن کیا تھا - کچھ عجیب اتفاقات ہوئے کہ فرانس میں اِس تحریک نے خالص مشرقی حکایتوں کی اصلی صورت کی طرف پلٹ کر ' والٹیر [7] اور دوسرے مصلحین کی سیاسی و معاشرتی طنز نگاری میں نظم و ترتیب پیدا کی - فرانس اور انگلستان دونوں مقاموں میں' یہ' ایک قابل لحاظ تصنیف —— بیکفرڈ کی ''واثق'' [8] کے وجود میں لانے کا باعث ہوئی - اِس کتاب میں فوطی رومانس کے ساتھ مشرقی مضامین و

1—Hamilton 2—Pope 3—Gold Smith

4—The Vision of Mirza 5—Rasselas 6—Robert Burns

7—Valtaire 8—Backford's Wathek

مشرقی خیالات کو سمویا گیا ہے - اور اِسی وجہ سے وہ نہائت ممتاز ہونے کے علاوہ ، دوسری نصف صدی کی تخیلی پیداوار پر بڑی حد تک اثر انداز ہوئی ہے - لیکن اِس کا بالواسطہ اثر زیادہ اہم ہے اور وہ یہ کہ اُس نے عام مذاق کو قدیم ادبیات ترک کرنے اور عہد وسطیٰ کی طرف رجوع ہونے پر مائل کرنے میں حصہ لیا ہے ، جس کو رومانی تحریک سے موسوم کیا جاتا ہے -

لیکن الف لیلہ کی کامیابی کو واضح کرنے کے لیے کچھ اور بھی چاہیے - اُس کی کامیابی کا سبب ، غالباً اُس "تہلکہ" میں تلاش کرنا چاہیے، جس سے فرانسیسی اور انگریزی ادب گزر رہا تھا، اور جو نتیجہ تھا خواندہ طبقوں کی وسعت اور ایک زیادہ عام‌پسند قسم کی ادبی پیداوار کی مانگ کا - کم سے کم اِنگلستان میں تو کلاسکیت ، حقیقی طور پر عام پسند نہیں رہی اور سترھویں صدیؑ کے ادق و سست رفتار ناول، عوام کے کام کے نہیں تھے- یہ زمانہ تجربات کا تھا، جب کہ ڈی‌فو[1] اسٹیل[2] اور اڈیسن[3] جیسے مصنفین اپنے لیے ایک جدید اسلوب کی راہ محسوس کر رہے تھے - ممکن ہے کہ الف لیلہ، جو اصلاً عوام کی پیداوار ہے، ادبی فن کے تمام بہترین اجزا سے معرّا ہو! لیکن اُس میں ایک صفت — مہم پسندانہ روح بدرجۂ کمال موجود ہے؛ جس کو ارباب ادب اب تک نظر انداز کرتے چلے آرہے تھے - لیکن جس کا وجود ، عوام پسند ادب کے لیے ناگزیر ہے - یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ عام مصنفین، جس چیز کی تلاش میں سرگرداں تھے؛ اُس کا سراغ اُن کو اِسی سے لگا - اِس لیے اگر الف لیلہ موجود نہ ہوتی تو

1—Defoe

2—Steel

3—Addison

رابن سن کروسو[1] کا کوئی وجود ہوتا اور نہ شائد "گلیور کے سفر"[2] کا -

اٹھارھویں صدی عیسوی میں، جس حد تک مشرقی قصوں کا رواج تھا ؛ اور اُنھوں نے یورپی ادب پر جو اثر ڈالا ؛ اُن پر ھمارے ادبی مورخ عام طور پر کوئی توجہ نہیں کرتے - اِس بےتوجہی کا سبب بلا شبہہ فرانس اور اِنگلستان دونوں جگہ، اُس معمولی ادبی پیداوار میں تلاش کیا جا سکتا ھے، جو مشرقی ادبیات کی راست اتباع کا نتیجہ تھی - اِس واقعے کی بنا پر، برانتیر[3] کو تنقیداً کہنا پڑا کہ اسلامی مشرق کے تعلقات نے، ھمارے ادب کی صرف ایک شاخ کو مالا مال کیا ھے ؛ اور وہ ھماری قومی توھین و تحقیر کا باعث ھے - لیکن اِس صدی کے دماغوں پر مشرقی فسانے نے جو اثر ڈالا ھے، اُس کی گہرائی کی دوسری علامتیں بھی موجود ھیں - سترھویں صدی کے ساتویں دھے میں "تاریخ نظم انگریزی" لکھتے ھوئے وارٹن[4] کو تو یہ معلوم ھوتا تھا کہ یہ بات خود بخود عیاں ھے کہ قرون وسطیٰ کی رومانی تحریک خالصتاً عربی پیداوار ھے - ھو سکتا ھے کہ وارٹن کا نظریہ، بالکل پر از مبالغہ ھو - لیکن خود اِس نظریے کا وجود اور اُس کو تسلیم کرنا، اُن خیالات پر کافی روشنی ڈالتا ھے جو اُس دور میں جاری و ساری تھے - سدی[5] نے اپنی بیانیہ نظموں کے لیے جو عنوان منتخب کیے ھیں، جیسے "ثعالبہ" اور

1— Robinson Crusoe رابن سن کروسو کے ماخذ کو بعض وقت ابن طفیل کے فلسفیانہ قصے میں تلاش کیا گیا ھے - اِس قصے کا نام حی بن یقظان ھے جس کو سنہ ۱۶۷۱ م میں پوکاک (Pocock) نے لاتینی میں "خود نصیحت لینے والے فلسفی" کے نام سے منتقل کیا - اُس کا سنہ ۱۷۰۸ م میں اوکلے "Ockley" نے انگریزی ترجمہ شایع کیا - اِس موضوع پر پوری طرح پاسٹر نے بحث کی ھے - ملاحظہ ھو اُس کی تالیف "رابن سن کروسو کا خیال" A. R. Paster : "the Idea of Robinson Crusoe" حصہ اول سنہ ۱۷۳۰ م -

2— Gulliver's travells

3— Brunetiere

4— Warton

5— Southey

"تہامہ کی تکفیر" اُن سے بھی اِسی قسم کے حسن ظن کا پتا لگتا ہے - زمانۂ حال کے نقاد کو اِن عنوانوں کا انتخاب " دور ازکار و غیر ہردل عزیز" معلوم ہوگا لیکن ایک ایسی نسل کے لیے' جس کا دماغی نشو و نما "مغربی الساحر" [3] اور ازین قبیل مشرقی فسانوں سے ہوا ہو؛ اُس کے لیے یہ چیزیں' اُسی طرح دور از قیاس و نامقبول نہیں تھیں جس طرح کہ بیسویں صدی کے ذکور و اناث کے لیے' الٰہ دین و علی بابا ' دور از قیاس و نامقبول نہیں ہیں -

الف لیلہ سب پر غالب رہی - اُس میں ایک عنصر ایسا تھا جو تخیل پر اثر کرنے میں کبھی ناکام نہیں ہوا - یہ صرف اُن قصوں کی شوخ رنگی یا ندرت ترتیب ہی نہیں تھی - حالانکہ خود اِس چیز نے بھی اُس کے مقلدین کی قسمت بنا دی تھی - بہ‌آن‌ہمہ سحر و فن و اسرار ' وہ حقیقت کی مضبوط چٹان پر قائم ہے - ہو سکتا ہے کہ اُس کے کردار معیاری و غیر ارتقائی ہوں؛ لیکن اُس کی مہم پسندی' خیالی نہیں؛ بلکہ حقیقی ہے؛ جس کو ڈرامائی انداز میں پیش کیاگیا ہے- اُس کی اثر انداز جدت اور زور تخیل کی تہ میں اخلاقی تخم بچھے ہوئے تھے؛ جن کے بغیر وہ اہل یورپ کے دلوں پر اِتنا گہرا اثر کر سکتی اور نہ پوری دو صدیوں تک عالم و عامی دونوں کے مرغوب خاطر ہوتی - حقیقی مشرق زیادہ واضح ہوا؛ اور ساتھ ہی اُس کا اثر بھی زیادہ قوی ہونے لگا - کیونکہ اب وہ مبالغہ‌آمیز زبان و بیان کی بوجھل زنجیروں سے آزاد ہو چکا تھا ؛ جنھوں نے اب تک اُس کو مستور کر رکھا تھا -

یہ حقیقت فراموش نہ کرنا چاہیے کہ یورپ' مشرقی تفکرات اور اُس کے حقیقی ادب سے ہنوز بہت بڑی حد تک نا واقف تھا - جب

Maugraby the Magician – 1

ولیم جونس [1] نے سنہ ۱۷۷۴ء میں "ماہر لسانیات کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک صاحب ذوق کی حیثیت سے اور ترجمان کی طرح نہیں بلکہ بطور شاعر کے" لاتینی زبان میں "ایشیائی شاعری پر تبصرے" [2] شائع کیے؛ تو گویا ایک نیا ورق اُلٹا گیا - مغربی یورپ کے مہذب اور قدیم ادب پڑھے ہوئے حلقوں کو، پہلی مرتبہ عربی و فارسی شاعری کی خوبیوں کو سمجھنے اور اُس سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملا - لیکن فرانس و انگلستان، دونوں جگہ کا ادب، قواعد و ضوابط کی زنجیروں سے گراں بار تھا - یہ بات صرف جدید جرمن تحریک کے علم برداروں ہی کے حصے میں آئی تھی کہ وہ اسلامی مشرقی شاعری کے امکانات کا ادراک کریں - یہ لوگ ادب کے آزاد نمائندے اور مذاق عامہ کے غلام نہیں؛ بلکہ اُس کے آفریدہ تھے - علاوہ ازیں فارسی شاعری پہلے ہی سے جرمن ادب پر اپنے نقوش ثبت کر چکی تھی - ایک صدی سے کچھ مدت پہلے، عالم و سیاح اولی‌ریس [3] نے سعدی کی گلستان و بوستان کا ترجمہ کر ڈالا تھا - اِن ترجموں نے "رائج‌الوقت جرمن کو تازگی بخشی اور اُس میں مفید محرکات کا اضافہ کیا" [4] - فارسی کا مسلسل اثر، مثال کے طور پر "داستان یوسف" مصنفۂ گریم‌مل‌ھاوسن [5] کے قصۂ یوسف زلیخا میں دیکھا جا سکتا ہے - دوسری طرف اٹھارھویں صدی کے ادب میں سوائے مروجہ فرانسیسی مشرقیت کے اور کچھ نہیں دکھائی دیتا - لسنگ [6] نے اپنی اخلاقی تصنیفوں کو مشرقی طرز پر ترتیب دیتے ہوئے، والتیر کی اتباع کی ہے - اور رومانی دبستان کی ابتدائی پیداوار جیسے اوھلن شلیگر [7] کی

1—William Jones Commentaries on Asiatic Poetry—2

3—Olearius 4—عام جرمن سوانح، ج ۲۴، ص ۲۷۵ - Allgemine deatsche Biographie اولی‌ریس نے سنہ ۱۶۷۱ء میں وفات پائی -

5—Grimmelshasen 6—Lessing 7—Oehlenschlager

"علی اور گل ھندی" اتھارھویں صدی کی محض خیالی تصنیفوں کی نمایاں مثال ھے - اور اُس کا نسبتاً بعد کا ڈراما "الہ دین" (سنہ ۱۸۰۸ع) الف لیلہ کی کہانیوں' پریوں' بھوتوں اور ھندی حکایتوں سے مرکب ھے - لیکن باایں ھمہ اِس سے مشرق کو زیادہ بہتر طور پر سمجھنے کی علامتیں ھویدا ھیں؛ جس نے آخرکار ایسی تمام چیزوں کو مزاحیہ نقلوں کے لیے چھوڑ دیا -

مشرق کو حقیقی طور پر سمجھنے میں' جرمنی' متعدد ممتاز عالم شعرا کا رھین منت ھے؛ جنھوں نے سر ولیم جونس کے شروع کیے ھوئے کام کو جاری رکھا - حصول علم' جرمنی میں' رومانی تحریک کی خصوصیت تھی؛ اور ھرڈر[1] کے اثر سے' اِس شوق مطالعہ کا دامن' مشرقی ادبیات و خیالات تک وسیع ھو گیا - پہلی نسل میں شلیگل[2] اور ھیامر[3] نے اور دوسری میں روکرٹ[4] نے مغربی شاعروں و محرروں کو نئے اور قریباً غیر متوقع خزانوں سے روشناس کرایا - اِس طرح مشرقی ادب (ھندی' فارسی و عربی) اُنیسویں صدی کے جرمن ادب میں اِس حد تک سرایت کرنے کے قابل ھو گیا کہ قرون وسطیٰ کے اسپینی ادب کے بعد' یورپ میں اِس کی کوئی نظیر نہیں ملتی - "مغربی گلستان" کا پہلا اور حسین ترین پھول گوئٹے کا "مغربی مشرقی دیوان" تھا[5] - اُس کے بعد آنے والے' جنھوں نے اپنے ذاتی مطالعے کے لیے مشرقی نمونوں کو پڑھا اور اُن کا ترجمہ کیا تھا' اور آگے بڑھے - گو اُنھوں نے پلاتن کی طرح نہیں کیا' جو فارسی اوزان تک استعمال کرنے لگ گیا تھا؛ البتہ روکرٹ کی طرح' فارسی تخیلات و فارسی تشبیہات و استعارات

Ruckert—4 Hammer—3 Schlegel—2 Harder—1

Goethe's West ostliche Divan—5

کی اقتدا کر کے اُن کو زندہ ضرور کیا - دوسری طرف' مشرقی شاعری میں گوئٹے نے سب سے پہلے وہ مقام دریافت کر لیا تھا جہاں اپنے زمانے کی بھیمانہ حقیقتوں سے نکل کر' وہ عالم خیال میں پہنچ جاتا - صرف تقلید سے اُس کی تشفی نہیں ہو سکتی تھی - فارسی شاعری کے تصورات اور اُس کی فنی خوبیوں کو یورپ کی ادبی روایات کے ''رومانی'' اور عہد وسطی اجزا کے ساتھ مربوط و منسلک کر کے' جن سے فارسی شاعری کے تصورات انتہائی قریبی تطابق رکھتے تھے' اُس نے خاص اپنے اظہار خیال کے لیے ایک نئی طرز ایجاد کی؛ اور ساتھ ہی ادبیات عالم پر بھی زور دیتا گیا جس سے اُس کا مقصد اِس مطمح نظر کو جرمن ادب پر عائد کرنا تھا[1] -

فارسی و ہندی رنگ ڈھنگ' ایک مدت تک میدان میں تکے رہے - حتیٰ کہ ہائنے[2] بھی اُس کی مذمت میں کوئی کمی نہ کرنے کے باوجود' اپنی غنائی نظموں کو اُس کے رنگ سے پوری طرح الگ نہ رکھ سکا - لیکن آخرکار' یہ مشرقی طرز ناکام ہوا؛ اور اِس کا ناکام ہونا ضروری تھا - یہ حرارت خانے کا پودا تھا ؛ اور بغیر پیوند لگائے' یورپی زمین میں' اِس کا جڑ پکڑنا ممکن نہیں تھا - اِس نظریے میں بڑی صداقت ہے کہ جو شاعر مشرقی خیالات میں جتنا زیادہ ڈوبا ہوا ہوتا ہے' ادبی نقطۂ نظر سے اُس کی شاعری اُتنی ہی غیر اہم ہوتی ہے - گوئٹے کی بالغ نظری نے' طبعاً حافظ کے اُن تمام عناصر کو خارج کر دیا ' جو اُس کو اپنے ماحول کے ناموافق نظر آئے؛ لیکن اِس کے باوجود' دیوان مغرب اُس کی تمام پیداوار میں سب سے بہتر نہیں ہے - صرف بوڈن اسٹیڈ[3] اپنی پرآورد تصنیف ''مرزا شفیع''

1—جرمنی کی رومانی تحریک میں مشرقی عناصر دیکھنے کے لیے ملاحظہ ہو ریمی (Remy) جامعۂ کولمبیا - تحقیقات' جلد اول' شمارہ ۴ نیویارک -

2—Heine

3—Boden stedt's Lieder des Mirza Schaffy.

کے گیت کے ذریعے عوام کے تخیل کو متاثر کرنے کے قابل ہوا - اگر رومانی تحریک کی، جرمن مشرقی شاعری کو، ادبی حیثیت سے زیادہ بلند مرتبہ نہ دیا جا سکے؛ اور مشرقی شاعری سے موجودہ مغربی شاعری کو ملاکر کوئی نئی چیز پیدا کرنے کا افتخار بھی نہ بخشا جائے؛ تب بھی اُس نے اپنے ترجموں اور تالیفوں کے ذریعے، یورپی ورثے میں، آخرکار قیمتی اضافہ کیا؛ اور ایسا دروازہ کھولا جو پھر کبھی بند نہیں ہوا -

جرمن ادب میں، مشرقی دھاروں کے جزوی داخلے سے، یہ توقعات ہو سکتی تھیں؛ چنانچہ واقعتاً [۱] ہوئیں بھی؛ کہ یہ تحریک زیادہ وسیع پیمانے پر پھیلے گی- لیکن اُنیسویں صدی میں انگلستان و فرانس کے ادب نے اُن توقعات کو بالکل پورا نہیں کیا - اچھا ہوا یا بُرا، بہر طور، مغرب یکایک مشرق سے اتنا دور ہو گیا، جو اِس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا - اپنے جدید فلسفوں، سیاسی نظریوں، نت نئی ایجادوں اور صنعتی ترقیوں کی کثرت سے، اہل یورپ اِتنے حیران و پریشان ہوگئے تھے کہ وہ مشرقی آواز پر کان دھرنے کے قابل نہیں تھے - اور اُس کے خیالات کو صبر و سکون سے سمجھنے کی کوشش کرنے کے لیے تو وہ اِس سے بھی کم تیار تھے - گوئٹے کے عالمی ادب کا مطمح نظر، قومیت کی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گیا؛ اور خود جرمنی میں اُس کا وجود ختم ہوگیا - تاہم اُنیسویں صدی اور خود ہمارے زمانے کے ادب میں، مشرق اور خصوصاً اِسلامی مشرق نے جو جگہ حاصل کر لی ہے؛ وہ کلیتاً نظرانداز کرنے کے قابل نہیں ہے - یہ بظاہر اُلٹی بات معلوم ہوتی ہے کہ ایک ایسے زمانے میں جب کہ اُس نے مغربی

1—اِس کا مقابلہ شرِن ہاور کے اِس جملے سے کیجیے جو برانتیر نے نقل کیا ہے (تدقیقات، ج۸، ص۲۱۱) ''سولھویں صدی، یونانی رومی علوم قدیم کی دریافت یا علم کے لیے جتنی ممنون اِحسان تھی : اُنیسویں صدی، قدیم مشرقی دنیا کے لیے اُس سے زرا بھی کم ممنونِ اِحسان نہیں'' -

قوموں کے تخیل پر اپنی بےنظیر قوت جاذبہ کا اثر دکھایا ؛ مشرقی ادب کی خوبیوں کو پس پشت ڈال دیا گیا - کم سے کم جزوی طور پر اِس مظہر کی توضیح اُس فرق میں تلاش کرنا چاہیے جو باعتبار کیفیت فرانس و انگلستان کی رومانی تحریک اور اُس تحریک کے درمیان ہے جس کا علمبردار ہرڈر تھا -

فرانس میں رومانی تحریک سے جدید مشرقیت کے آثار بہت کم نمایاں ہیں؛ کیوں‌کہ فرانس کی رومانی تحریک' جرمنی کے بہ نسبت کم بارآور ہونے کے علاوہ' علمیت کے ساتھ ساتھ نہیں چلی - علاوہ ازیں وہ گوئٹے اور شلر[1] سے زیادہ اسکاٹ[2] اور بائرن[3] کے زیر اثر تھی - سیاسی تعصب اور فرانسیسی ادب کی اُس صفت نے' جس کو ظاہر کرنے کے لیے صوبہ‌واریت شائد زیادہ سخت لفظ ہے' وہاں کے شاعروں اور محرروں کو ایسی چیزوں کی طرف متوجہ رکھا ؛ جو اُن کے وطن سے زیادہ قریب تھیں - یہ بات نہیں تھی کہ مشرق نظرانداز کر دیا گیا ہو - بلکہ اِس کے خلاف " چودھویں لوئی کے زمانے میں[4] " وکٹرہیوگو[5] " مشرقی لوگ " کے دیباچے میں رقم طراز ہے : " ساری دنیا یونانی تھی اور اب مشرقی ہے " - اور مشرقی دنیا سے اُس نے گہری شعری ہمدردیوں کا اعتراف کیا ہے - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ " مشرق میں اُس کو بہت دور سے ایک مالا مال شعری فن کی کرن نظر آتی تھی - یہ ایک ایسا چشمہ تھا جس سے وہ اپنی پیاس بجھانے کا مدت سے متمنی تھا - قرون وسطیٰ کی طرح اِس دوسرے شعری سمندر میں ہر چیز وسیع' خوبصورت اور تخلیقی ہے " لیکن اِس اظہار کے باوجود اُس کی نظموں

Schiller—1

Scott—2

Byron—3

Louis XIV—4

Victor Hugo's Les Orientales—5

میں' قابل لحاظ مشرقی اثرات کا سراغ لگانا بہت مشکل ہوگا - لیکن وہ اُن فارسی شعرا کے اثرات سے یقیناً مستثنیٰ ہیں' جو گوئٹے اور دوسرے جرمن شاعروں کو مسحور کرچکے تھے - اُس کی ہمدردیاں زیادہ تر عرب شاعروں کے ساتھ تھیں - "عربوں سے ایرانیوں کی طرف آنا تکلیف دہ تبدیلی ہے - گویا جواں مردوں کی قوم سے نکل کر صنف نازک کے مجمع میں آنا..........غلام قوم' جی حضوری شاعری! ایرانی' ایشیا کے اطالوی ہیں" - اُس کے لیے مشرق' "مشرقی لوگ" کی طرح "زمزمی" کا مشرق' اب بھی اصلاً اٹھارھویں صدی کی روایات کے مطابق جگمگاتا ہوا نیم مہذب مشرق تھا - یعنی ایسا مشرق جس کو گاٹر[1] نے فارچونیو[2] کے کردار میں مشکّل کیا ہے؛ یا آراستہ و پیراستہ بائرنی مشرق؛ نہ کہ عالموں اور شاعروں کا پر حکمت اور نغموں سے معمور مشرق - جس طرح ڈی لاکرو[3] نے الجیریا سے متعلق موضوعوں کی لفظی تصویریں کھینچی ہیں؛ اُسی طرح اُس نے مشرق کو گہرے رنگ کے فلی اثر کے لیے استعمال کیا ہے - یہی بات قریباً ہر فرانسیسی رومان نویس کے متعلق بھی کہی جاسکتی ہے - گیرارڈ ڈی نرول[4] اور گیٹر اکبر[5] کی طرح' بعض تو مشرق سے حقیقی وابستگی محسوس کرتے تھے' اور یہ جرمن دبستان کے زیادہ زیر اثر تھے؛ لیکن اِن کی مشرقیت' اختراعی حیثیت سے' زیادہ تر دوسرے درجے کی ہے - برانتیر کے لفظوں میں مشرقی چیزیں دن پر دن مانوس تو ہوتی جارہی تھیں لیکن تہ تک نہیں پہنچ رہی تھیں -

انیسویں صدی میں' انگریزی ادب' مادی طور پر' بالکل فرانسیسی ادب کے ہم پایہ ہی رہا - جیسا کہ توقع ہو سکتی تھی' جدید مشرقیت

1—Gautier 2—Fortunio 3—Delacroix
4—Gerard de Nerval 5—Gantier, the Elder

کا اثر زیادہ نمایاں تھا ؛ لیکن اب بھی اُس نے پس‌منظر کی آرائش سے زیادہ کوئی اور خدمت انجام نہیں دی، جس کی تزئین و آرائش مقامی رنگ سے کی جاتی تھی - اور اِس چیز پر رومان پسندوں کو اصرار تھا - یہ چیز، اسکاٹ اور جرمن تحریک سے ورثے میں آئی تھی - بائرن ایسا شخص ہے، جس نے اِس مشرق کو عام پسند بنایا اور اِس کی کلاسک مثال، مُور [1] کی ''لالہ رخ'' ہے - اب، الف لیلہ کا اثر ''خاکہ قصوں'' [2] کے چند اجزا تک محدود رہ گیا اور نظموں کے معترضہ قصوں کی بنیاد جونس ڈی هربی لاٹ [3] اور دوسرے مستشرقین کی تصنیفوں پر رکھی جانے لگی - مُور اپنے خیالات کو مشرقی تخیلات و مشرقی طرز ادا میں گم کرنے کے لیے دو سال تک علحدہ رہا اور نتیجے سے خود بھی مطمئن رہا [4] - لیکن اِس کے باوجود اُس کی نظمیں ایسی ہیں، گویا اسکاٹ کی استعمال کردہ بحروں کو صرف اُن کے اصلی مقام سے نکال کر ہندوستان میں منتقل کر دیا گیا ہے - اِن کے علاوہ تو بڑے بڑے شعرا کے پاس مشرقیت کا مقام، نظر انداز کرنے کے قابل ہے- ''سہراب و رستم'' ''فرشتے کی خیال آرائیاں [5] '' اور اِسی طرح کی دوسری نظموں میں، سوائے ناموں کے اور کوئی مشرقی بات نہیں ہے - جہاں تک منثور ادب کا تعلق ہے، سگپات [6]، الف لیلہ کے نمونوں کی تقلید کرنے کی حیثیت سے، تنہا ہے -

تو اب، اِس بظاہر اُلٹی بات کا یہ حل معلوم ہوا کہ جہاں تک اسلامی مشرق کا تعلق ہے، خود اپنے تخیل کے رومانی مناظر سے چمٹے رہنے

Moore—1   Frame-story—2   d'Herbelot—3

4—''گو بذات خود میں نے کبھی مشرق کا سفر نہیں کیا، لیکن مشرق میں رہا ہوا ہر شخص کہتا ہے کہ لالہ رخ میں میں نے وہاں کے لوگوں اور اُن کی زندگی کے متعلق جو کچھ پیش کیا ہے اُس سے زیادہ مکمل بیان ہونا ناممکن ہے'' -

Ferishtah's Fancies—5   Shagpat—6

نے انگلستان و فرانس کے شاعروں اور نثر نگاروں کو اُس پس پردہ حقیقت کی طرف متوجہ ہونے نہیں دیا' جس نے اُن کی اِتنی اچھی خدمت انجام دی تھی - مشرق کو صرف رنگ آرائی کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا ؛ اور اُس کے اِس دعوے کو' کہ اُس نے بھی انسان کے روحانی ورثے کی خدمت کی ہے' بےخبری سے پس پشت ڈال دیا جاتا تھا - اِس سے بہت پہلے' سر ولیم جونس نے کہا تھا کہ ایشیا کی طبعی تاریخ اور وہاں کی قوموں کے متعلق علمی معلومات کے بغیر' ایشیا کی شاعری سے لطف اندوز ہونا ممکن نہیں - جب تک اِس قسم کی ناگزیر معلومات چند پادریوں اور دیوانی کے ملازموں کی حد تک محدود رہیں؛ یورپ پر مشرقی ادب و فلسفہ کے تخلیقی اثر کا سوال' پیدا ہی نہیں ہو سکتا تھا - جن لوگوں نے مشرق کو پوری طرح سمجھا اور بیان کیا تھا ' جیسے گوبی‌نے [1] اور موریر [2] ' جن کے بیانات ایک حد تک طنز آمیز ہمدردی پر مشتمل تھے؛ وہ بلا شبہہ کسی نہ کسی حد تک مشرقی ادب و مشرقی زندگی کے رہین ملت تھے - لیکن یہ ایسا احسان ہے جس کا آسانی سے اندازہ نہیں کیا جا سکتا -

باایں‌ہمہ' اُنیسویں صدی بھی' مشرق و مغرب کے لازمی رشتے کا ثبوت پیش کیے بغیر' نہ رہ سکی- ٹھیک اُسی طرح' جس طرح ایک انگریز نے اپنی کتاب ''واتق'' میں' مشرقی اور غوطی قصوں کا امتزاج پیش کیا تھا ؛ اُسی طرح اِس وقت بھی ایک انگریز ہی نے ایک مشرقی شاعر کی اُس قوت کا مظاہرہ کیا جو مغربی شاعری کے قلب کی گہرائی تک اثر کرنے والی تھی - فٹزجرالڈ [3] کے عمر خیام میں' حقیقی فارسیت کے ساتھ سچی انگریزیت بھی ہے؛ ترجمہ نہیں بلکہ تخلیقی جوہر - اِن مشہور

Fitzgerald—3 Morier—2 Gobineau—1

رباعیوں میں، جن جذبات کا اظہار کیا گیا ہے؛ گو وہ پرشکوہ و پرعظمت نہیں ہیں؛ لیکن ساتھ ہی وہ اپنے زمانے کی حقیقی آواز ہیں - اور انگریزی رباعیوں نے اپنے زمانے کی اُسی طرح بدرجۂ کمال نمائندگی کا حق ادا کیا ہے؛ جس طرح آٹھ سو سال قبل فارسی رباعیوں نے اصفہان کے مہذب ''معاشرہ'' کی شایستہ لذتیت کا مظاہرہ کیا تھا -

یورپ کے ادبی میدان کی طرف پلٹ کر نظر دوڑائیں، تو پہلے پہل ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی مشرق کے ادبیات کا اثر، ایک تنگ و غیرتخلیقی حصے تک ہی محدود رہا - لیکن جب یہ محسوس کیا جاتا ہے کہ مشرق، یورپی روح میں سرایت کر کے اُس کی ماہیت بدل دینے کا باعث ہوا ہے، تو تب ہی یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُس کی اہمیت کا دائرہ نہائت وسیع ہے - اگر ہماری نظر صحیح ہے، تو تین مختلف دوروں میں اُس نے مغربی ادب پر اپنا اثر ڈالا ہے؛ جس کے نتائج باعتبار مدارج نہیں تو اصلاً یکساں تھے - ہر موقع پر اُس کا فریضہ، تخیل کو تنگ و جابرانہ قوانین سے آزاد اور قید و بند کی دیواروں میں پہلا شگاف پیدا کرنا تھا - مشرقی ادب نے ، اپنی اُس قوت کی وجہ سے، جس نے تخلیقی رجحان کو، جواب تک معطل یا ضعیف تھا، آمادۂ عمل کر دیا ؛ مغرب کو اپنا زیر بار احسان کیا ہے - تحریک جب ایک مرتبہ شروع ہو چکی، تو اُس نے اپنا معیار حرکت، اپنے ہی اندرونی ذرائع سے حاصل کیا؛ اور ایسے مشرقی اجزا جو جذب ہو چکے ہیں، مقامی اجزا سے اِس طرح گھل مل گئے کہ ارتقائی صورت میں اکثر و بیشتر اُن کا پہچاننا مشکل ہے - جہاں تک مشرق نے یورپی ادب کے لیے نمونوں کا کام دیا ہے؛ اُس نے ضمنی خدمت انجام دی ہے - قرون وسطیٰ میں، جب کہ اسلام اور عیسائیت کی تہذیبوں کے عقلی منہاج، مادی طور پر یکساں تھے؛ آخرالذکر کے لیے اسلام کا اتباع کرنا

اچھی طرح ثمرآور ہو سکتا تھا - نشأۃ ثانیہ کے بعد اُس نے زیادہ سے زیادہ صرف بےضرر عجائبات پیدا کیے - اِسی وجہ سے مشرقی ادب سے قرون وسطی تفکرات کے ارتباط کا نتیجہ' بعد کے ارتباطوں کی بہ نسبت ناقابل مساعدت حد تک بڑھا ہوا ہے -

اِن تین غیر ارادی تعلقات کی تحریکوں کے بعد جرمنی' رومانیوں نے دوبارہ مشرق کا رخ کیا اور پہلی مرتبہ ارادی طور پر اُنہوں نے اپنا مقصد مشرقی شاعری کے حقیقی ورثے کا کوئی نہ کوئی رشتہ دریافت کرنا قرار دیا؛ تاکہ اِس ذریعے سے اُس کو مغربی شاعری میں داخل کر سکیں - معلوم ہوتا ہے کہ انیسویں صدی' اپنے جدید شعور قوت و برتری کی بنا پر' اُن کے منصوبوں کے علی‌الرغم صرف دروازہ کھٹکھٹاتی رہی - دوسری طرف آج کل تغیر کے آثار رونما ہیں - علمی مقصد سے' مشرقی ادب کا مطالعہ' دوبارہ شروع ہو چکا ہے اور مشرق کو نئی طرح سمجھا جا رہا ہے - جوں جوں یہ علم پھیلتا جائے گا اور مشرق' انسانیت میں اپنا صحیح مقام پھر سے حاصل کر لے گا ؛ تو ممکن ہے کہ پھر مشرقی ادب اپنا تاریخی وظیفہ نئے سرے سے انجام دے؛ اور ہم کو تنگ و جابرانہ تصورات سے نجات دلائے؛ جو ادب' فلسفہ اور تاریخ کی ہر قابل قدر شے کو' کرۂ ارض کے صرف ہمارے حقیر خطے ہی تک محدود کر دیں گے -

(اپریل جولائی ۱۹۴۱ء)

Selections from the Monthly

HINDUSTANI

Allahabad

1931 – 48

6

HISTORY

Khuda Bakhsh Oriental Public Library,

Patna.

رسالہ ہندستانی الہ آباد (۱۹۳۱ء — ۱۹۴۸ء) سے انتخاب

۶

تاریخ

خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ